حدیث کے اصلاحی مضامین

افادات

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

ناشر

ادارۃ الصدیق ڈابھیل گجرات
شعبۂ فیض محمود سورت

نمبر	عنوانات	صفحات

الأمر بأدآء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۱

الأمر بأدآء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۲

نمبر	عنوانات	صفحات

الأمر بأدآء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۴

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۱

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۲

نمبر	عنوانات	صفحات

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۳

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۴

نمبر	عنوانات	صفحات

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۵

تَعۡظِیۡمِ حُرُمَاتِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۱

نمبر	عنوانات	صفحات
	تَعْظِیمُ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِینَ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۴	

نمبر	عنوانات	صفحات

قَضَاءِ حَوَائِجِ الْمُسْلِمِيْنَ

مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

اَلشَّفَاعَةُ

سفارش کرنا

نمبر	عنوانات	صفحات

الاصلاح بین الناس ۱

آپس کے تعلقات درست کرانا

الاصلاح بین الناس ۳

آپس کے تعلقات درست کرانا

افتتاحیہ

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اب تک **''حدیث کے اصلاحی مضامین''** کی تین جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، اور یہ چوتھی جلد آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے جس کے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے میں محض خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا فضل وکرم ہی شاملِ حال رہا ہے۔ اور یہ تو آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری ﴿دامت برکاتہم ومدت فیوضہم واعلی اللہ مراتبہم﴾ ہر شبِ یکشنبہ کو بعد نمازِ عشاء سورت میں عمومی درس حدیث فرماتے ہیں جس میں پہلے کتاب **''ریاض الصالحین''** کا درس ہوتا تھا جو ۹؍سال کے طویل عرصہ میں اختتام پذیر ہوئی، اور وہی دروس کتابی شکل میں **''حدیث کے اصلاحی مضامین''** کے نام سے آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہیں۔

اگر ہم اس کتاب کے عنوانات کی ترتیب کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں علامہ نوویؒ نے اسلامی معاشرہ کا پورا ایک خاکہ پیش فرمایا ہے، اور حقیقی بات تو یہ ہے کہ اگر آدمی ان اوصاف کو اپنا لے تو اسلامی معاشرت خود بخود قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ غور کیجئے اگر معاشرہ کے ہر آدمی کے اندر امانتداری کا وصف موجود ہو، اور ہر ایک اپنی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی امانت خیال کرتے ہوئے استعمال کرے، اور اگر کسی وقت کسی کو سماجی کاموں کی ذمہ داری سونپی جائے تو اس میں بھی ذرہ برابر خیانت سے کام نہ لے، اور جب ہر آدمی اس حد تک امانتدار بن جائے تو ان کی طرف سے کسی پر ظلم وزیادتی ہو جائے یہ بات بعید از قیاس ہے۔ پھر وہ نہ خود کسی پر ظلم کریں گے اور اگر کوئی کسی پر ظلم کر رہا

ہوگا تو اس کو بھی ظلم سے روکیں گے، اس لئے کہ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام ان کی سمجھ میں آچکا ہے، لوگ ہر ایک کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والے ہوں، اور اگر کبھی کسی کا کوئی عیب ان کو نظر بھی آجائے تو وہ اس کو پوری طرح سے چھپانے کا اہتمام کریں، چہ جائیکہ لوگوں کے عیوب ڈھونڈتے پھریں۔ اور پھر ان میں شفقت بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ جائے کہ وہ ہر مسلمان کی ضرورتوں کو پورا کرنا اپنا اہم فریضہ سمجھنے لگیں، اور اگر وہ خود اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ خود کسی کی ضرورت پوری کرسکیں تو وہ دوسروں کو متوجہ کریں اور دوسروں سے سفارش کرکے لوگوں کے کام نکلوادیں۔ اگر معاشرہ میں آپس میں لڑائی اور جھگڑے ہوں تو لوگوں کے درمیان صلح صفائی کروائیں، جو لوگ خستہ حال، فقیر و مسکین ہیں اور معاشرہ میں بھی جن کو لوگ قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، ایسوں کو وہ اپنے سینہ سے لگانے والے بن جائیں اور کبھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اگر معاشرہ کا ہر فرد ایسا بن جائے تو وہ سماج جنت کا نمونہ نہ ہوگا؟

"حدیث کے اصلاحی مضامین" کی یہ جلد انہیں آٹھ (۸) مضامین پر مشتمل ہے:-

﴿۱﴾ الأمر بأداء الأمانة
ادائے امانت کی تاکید

﴿۲﴾ تحريم الظلم والأمر بردّ المظالم
ظلم کی حرمت

﴿۳﴾ تعظيم حرمات المسلمين
مسلمانوں کی عزتوں کا احترام

﴿۴﴾ ستر عورات المسلمين
پردہ دری کی ممانعت

﴿۵﴾ قضاء حوائج المسلمين
مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

﴿۶﴾ الشفاعة
سفارش کرنا

﴿۷﴾ الاصلاح بين الناس
آپس کے تعلقات درست کرانا

﴿۸﴾ فضل ضعفة المسلمين والفقراء
خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

بہرحال! اس جلد کا ہر عنوان قابلِ مطالعہ ہے اور وہ تمام اوصاف جو ایک مسلمان کی زندگی میں نمایاں طور پر پائے جانے چاہئیں ان پر قاریٔ کتاب کو آسان پیرایہ میں سیر حاصل بحث پڑھنے کو ملے گی اور معاشرہ میں جو جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں حضرت دامت برکاتہم نے جا بجا اس کی بھرپور نشان دہی فرمائی ہے اور ان کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

﴿۱﴾ادائے امانت کی تاکید:-امانت داری کتنا اونچا وصف ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے، یہ گھپلوں اور گھوٹالوں کے اس زمانہ میں (جس میں پورے سال کو ''گھپلوں کا سال'' (Scandal's Year) کا نام دیا جاتا ہو) جتنا کھل کر سامنے آ گیا ہے؛ شاید آج سے پہلے اس کی اہمیت اتنی واضح نہ ہوئی ہو۔ اسلام نے تو پہلے ہی دن سے اس کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم بلکہ اجاگر کیا ہے۔ مختلف انداز اور پہلوؤں سے اس کو واضح کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب ہٰذا کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا۔ امانت کے مفہوم میں کتنی وسعت و پنہائی ہے؛ یہ بھی معلوم ہوگا۔ تقریباً روزمرّہ کے پیش آنے والے ناگفتہ بہ اور شرم سے سر جھکا دینے والے واقعات نے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح واضح کر دی ہے کہ امانت داری اتنی اونچی صفت ہے کہ اس کے نہ ہونے سے انسان ذلت کی کتنی گہری کھائی میں گر جاتا ہے، چاہے وہ اپنے آپ میں کتنا ہی بڑا ہو، اور اس صفت کے ہونے سے عزت کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے، خواہ وہ اپنے آپ میں کتنا ہی چھوٹا ہو۔ گویا اس کا نہ ہونا بڑوں کو چھوٹا اور اس کا ہونا چھوٹوں کو بڑا بنا دیتا ہے۔

انسان بعض اوقات کسی صفت کے حاصل کرنے میں خاطر خواہ دلچسپی اس لئے نہیں لیتا کہ اس کو اس کی اہمیت کا ٹھوس علم اور صحیح ادراک نہیں ہوتا، ایک ایمان والے کے لئے خدا

اوررسول کی بات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہونا چاہیے۔سرکاری وغیر سرکاری دفاتر اورتجارتی اداروں میں امانت دار انسان کی کتنی قدر و قیمت اور ڈیمانڈ ہے یہ ہر شخص جانتا ہے۔خیانت کرنے سے انسان کو وقتی طور پر دنیائے دَنی کا کوئی معمولی فائدہ ضرور ہو جاتا ہے،لیکن جب راز فاش ہوتا ہے تو سر چھپانا مشکل ہو جاتا ہے،جس کی وجہ سے دنیا کا بھی دائمی نقصان بھگتنا پڑتا ہے۔

مذہبِ اسلام نے ایسے ایسے امین پیدا کئے ہیں جو بجائے خود ایک قابلِ فخر اور لائقِ اتباع امر ہے۔سرکارِ مدنی فداہ ابی وامی وروحی ﷺ کو بعثت سے پہلے ہی پورا مکی سماج نامِ مبارک سے زیادہ ''الصادق الامین'' سے پہچانتا تھا۔خلیفۂ اوّل یارِ غار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بیت المال میں سے حق محنت لینا گوارا نہیں،بوقت وفات اپنا ایک باغ اس حق محنت کی تلافی کے لئے بیت المال کو وقف کر جاتے ہیں (کتاب الاموال بحوالہ فضائل اعمال ۱/۵۹) جو حضرت عمر اور حضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ جیسے حضرات کی اجتماعی متفقہ رائے سے انتہاء درجہ کا بقدر ضرورت لینا شروع کیا تھا،جس میں مہینہ میں ایک مرتبہ میٹھا بننے کی بھی گنجائش نہیں تھی،الّا یہ کہ روز کے انتہائی کفایتی خرچ میں سے کچھ کچھ کاٹا جائے۔دوسری جانب احساس ذمہ داری اتنا زبردست ہے کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں ایک رسی کی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔یہ امانت ہی کا اثر ہے کہ آدمی کو احساس ذمہ داری ہو،سہولیات کا محدود استعمال ہو،اصول و ضوابط اور آئین سے ہٹ کر کسی کی کسی طرح کی رو رعایت کے لئے تیار نہ ہو۔اگر یہ باتیں پیدا ہو جائیں اور ملکی نیز بین الاقوامی سطح پر اور ذیلی سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں اور اداروں میں ان کا اہتمام ہونے لگے تو دنیا برسوں کی ترقی لمحوں میں کر جائے۔حکومت کی

گدیوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر ترقی کے بڑے بڑے راگ الاپنے والے ہی اگر دنیا بھر کی ان خیانتوں کے ساتھ ترقی دلا سکتے تو آج ممالک قطعاً اس پوزیشن میں نہ ہوتے جس میں ہیں خصوصاً ہمارا ملک ہندوستان جہاں گھپلوں کی تاریخ ماشاء اللہ اتنی وسیع ہے کہ اگر کوئی صرف ان کی اجمالی فہرست ہی تیار کرلے تو کئی ضخیم جلدوں کا ایک ''قیمتی'' دستاویز تیار ہوجائے،اور تفصیلات کی نذر تو شاید کئی لوگوں کی زندگیاں ہوجائیں۔

اسلام کے زرّین ترین دور کی تاریخ،انتظامِ ملکی،رعایا کے تنعم،بیکاری کے فقدان، حاکموں کی امانت داری اور پبلک کی وفاداری وغیرہ وغیرہ امور کا موازنہ بعد کے زمانوں اور آج کے زمانہ سے کیا جائے؛تو ہرگز ہرگز کوئی جوڑ نہیں بیٹھ سکتا۔سابقہ حکمرانوں کی امانتداری کے سچے واقعات بتائے جائیں تو آج کوئی ان پر یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہو،کیونکہ آج کے ماحول نے اس کو محال بنادیا ہے۔

یہاں پہنچ کر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتیں ہمارے علمی و مذہبی حلقہ سے بھی کہی جائیں۔ہر شخص اپنے طور پر فیصلہ کرلے کہ جس مسجد یا مدرسہ و مکتب سے وہ متعلق ہے،چاہے صدر کی حیثیت سے ہو،متولی و ممبر کی حیثیت سے ہو یا مدرس،امام و مؤذن کی شکل میں ہو؛ وہاں رہتے ہوئے امانت کے تقاضوں کو کتنی حد تک پورا کررہا ہے۔کام کے لئے جتنا وقت طے ہوا ہے؛ کیا وہ پورا وقت کام میں گذر رہا ہے؟ مساجد،مدارس و مکاتب کی جو اشیاء و سہولیات ہمارے لئے مہیا کی جاتی ہیں مثلاً کمرے،پنکھے،بجلی،تنخواہ وغیرہ ان کا ذاتی استعمال کرنے سے ہم کتنی احتیاط برتتے ہیں۔بعض جگہ تو ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ مدرس صاحب یا امام صاحب کا انتقال ہوگیا،یا کسی دوسری جگہ خدمت کرنے لگے لیکن مسجد،مکتب یا

مدرسہ کا گھر چھوڑنے کے لئے تیارنہیں ،متولیان ،اراکین شوریٰ وغیرہ بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح ملوث ہوجاتے ہیں۔ان مواقع پر وارثین انبیاء علماء کا وقار جتنا بھی مجروح ہو؛ عین مناسب ہے۔پھر کیونکر ہمارے وعظ ونصیحت میں تاثیر پیدا ہوگی۔ہمارے اکابرو اسلاف کی جو زندگیاں کتابوں میں ہیں؛ کوئی ہماری زندگیوں میں ڈھونڈے تو کیا وہ کامیاب ہوگا؟ کیا مدارس میں عامۃً ایسانہیں ہوتا کہ مدرس صاحب روزانہ یا اکثر دس پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچتے ہیں؟اگر روزانہ کے ان دس منٹوں کو جوڑا جائے تو ماہانہ ایک دن کی اور سالانہ دس دن کی غیر حاضری ہوتی ہے۔ہم ازخود توان کی تنخواہ کیا کٹواتے؛ منتظمین اگر ایسا کچھ کرنا چاہیں تو ہم آگ بگولہ ہوجاتے ہیں۔کیا امانت داری کا یہی تقاضہ ہے؟

امانت داری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم وہ کرتے جو حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی اورحضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما وغیرہما کرتے تھے۔لیکن ایسا کہاں ممکن ہے؟ یہ مسائل ہمارے لئے تھوڑے ہی ہیں؟ یہ تو صرف انہی حضرات کے لئے تھے۔بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان حضرات کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہمارے اندران حضرات کی اتباع کا تصور تک پیدانہیں ہوتا۔ہمارا انداز اور ردّعمل یہ بتاتا ہے جیسے یہ سچے واقعات نہیں؛ من گھڑت کہانیاں ہیں۔پھر کیونکر ہم یہ وصف تلامذہ اور عوام میں منتقل کرسکیں گے۔یہاں کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وجہ امانت کی اہمیت کی ناواقفیت ہے۔ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ امانت کی اہمیت ہمارے جن بزرگوں نے اپنے عمل سے اجاگر کی یا تو ہم نے ان کی زندگیوں کا مطالعہ نہیں کیا یا ہمیں ان حضرات سے عقیدت میں کمی ہے۔

ہمارا جو دوسرا طبقہ ہے یعنی تاجروں کا ہو یا ملازموں کا؛ ان سے بھی عرض ہے کہ آپ

کی تجارت وملازمت کے دوران امانت داری کے تقاضے آپ سے بھی کچھ امید رکھتے ہیں۔ معاملات کی صفائی، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، وعدہ پورا کرنا، عیب دار مال نہ تھوپ دینا، اوقاتِ ملازمت کی پابندی کرنا، کام چوری نہ کرنا، سہولیات کا ذاتی استعمال نہ کرنا، حق سے زیادہ تنخواہ نہ لینا وغیرہ وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں۔

آیئے! ہم سب مل کر عہد کریں کہ اب تک کی کوتاہیوں کی تلافی کریں گے، اور آئندہ امانت کے تقاضوں سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کریں گے۔

﴿۲﴾**ظلم کی حرمت:**-اس عنوان کے تحت معلوم ہوگا کہ بندوں کے حقوق کا معاملہ کتنا اہم اور نازک ہے اور اسلام نے روزِ اوّل سے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کسی بھی انسان کا حق کسی طرح بھی ضائع ہو، جانی یا مالی نقصان ہو، یا جسمانی اور ذہنی طور پر اس کو تکلیف ورنج پہنچے؛ اسلام اس کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ قرآن وحدیث میں ظالم کے لئے بڑی سخت سزائیں سنائی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے کسی بھی اہم موقع کو نہیں چھوڑا کہ اس میں امت کو اس بات کی تاکید نہ فرمائی ہو کہ کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ خطبۂ حجۃ الوداع کو اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیجئے، یہاں تک کہ دنیا سے جاتے جاتے بھی کمزوروں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ اس سے اس بات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز اپنی شانِ عدل کو اس طرح ظاہر فرمائیں گے کہ بغیر سینگ والی بکری کو بھی سینگ والی بکری سے اس کا حق دلوئیں گے۔ اور اگر دنیا میں کوئی آدمی کسی کو دبا کر اور اس پر ظلم کر کے خوب پھل پھول رہا ہو تو وہ اس بات سے خوش نہ ہو، اس لئے کہ خدا کے دربار میں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس سے بھی

چوکنّا کردیا کہ مظلوم کی بددعا سے بچو، اس لئے کہ اس کی بددعا کی قبولیت میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہوتی۔

خیر! یہ موضوع بڑا قابلِ توجہ ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی اہمیت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی، اور اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی اس برائی میں مبتلا ہے تو ان شاء اللہ اس کو توبہ کی توفیق نصیب ہوجائے گی۔

﴿۳﴾ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام: -اس عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نوویؒ اس باب میں کتنی اہم چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔لفظ ''حرمت'' اپنے اندر کتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے وہ بھی معلوم ہوجائے گا۔شعائراللہ کی تعظیم بھی اس مفہوم میں شامل ہے، اسلام نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کرکے یہ پیغام دیا ہے کہ پوری انسانیت کس قدر قابلِ تعظیم ہے، یہی اسلام کی وہ تعلیم ہے جس کو بڑی وضاحت کے ساتھ کھل کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نفرتوں کا وہ زہر جو اسلام و اہلِ اسلام کے خلاف لوگوں کے دلوں میں بھر دیا گیا ہے وہ دھل جائے اور پوری انسانیت کے لئے ایمان کی راہیں ہموار ہوجائیں۔

کہیں تو نبی کریم ﷺ نے مؤمنین کو ایک عمارت کی اینٹوں سے تشبیہ دی کہ ہر اینٹ دوسری سے بالکل جڑ ہوئی رہتی ہے، اور کہیں جسم کے مختلف اعضاء کے مجموعہ سے تشبیہ دے کر سمجھایا کہ ایک عضو کی تکلیف دوسرے کی تکلیف کا باعث ہوتی ہے؛ پھر کیا بات ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی؟

نبی کریم ﷺ نے تمام لوگوں کے ساتھ (جس میں بڑوں اور چھوٹوں میں، اپنے اور غیروں

میں کوئی فرق نہیں ہے) کس قدر شفقت ورحمت کی تعلیم دی ہے وہ بھی اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوگی ، یہاں تک کہ ایک بچہ کے رونے آواز کی وجہ سے اپنی نماز کو بھی مختصر کردیا تاکہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، اور اماموں کو بھی تاکید فرمائی کہ وہ لوگوں کو ہلکی نماز پڑھائیں۔اس باب کی ہر حدیث کے ماتحت یہ سبق ملے گا کہ آپ ﷺ کو امت کی تکلیف کا کتنا زیادہ خیال تھا اور دراصل آپ ﷺ اپنے طرزِعمل سے آنے والی امت کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کس طرح ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث سے معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کتنے حقوق ہیں اور اسی کے ذیل میں بزرگوں کے واقعات اور اقوال کی روشنی میں بہترین رہنما اصولِ زندگی نہایت بلیغ انداز میں سیکھنے کو ملیں گے، اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ غلط رسم ورواج سے کیسے بچا جائے۔دیگر علمی فوائد مزید برآں۔

﴿۴﴾ پردہ دری کی ممانعت:-اوپر کے باب میں جو پیغام دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عزتوں کا کس قدر احترام شریعتِ اسلامی میں ملحوظ ہے، یہ باب گویا اسی کے تکملہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ بلا کسی شرعی وجہ کے کسی کے عیب لوگوں کے سامنے کھولے نہ جائیں، اور بعض مرتبہ کسی کے عیب کا لوگوں کے سامنے آنا ہی دوسروں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ بھی اس کام کو کریں۔اور پردہ پوشی کی ہر انسان کو قیامت میں ضرورت پیش آنی ہے، اگر اس نے دنیا میں دوسروں کی پردہ پوشی کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔اور یہ تو کتنی خطرناک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تو کسی انسان کے عیوب پر پردہ ڈالے لیکن وہ خود ہی اپنی زبان سے کہتا پھرے کہ میں نے فلاں فلاں گناہ کئے ہیں، اس پر تو

بڑی سخت وعید آئی ہے۔اس عنوان کے تحت علامہ نووی ؒ نے ایک آیت اور چار احادیث پیش فرمائی ہیں۔

﴿۵﴾ **مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا:-** اس عنوان کے تحت علامہ نووی ؒ نے ایک آیت اور دو احادیث ذکر فرمائی ہیں جن کی تشریحات تو اوپر کے ابواب میں گذر چکی ہیں لیکن اس باب میں بہت سے اصلاحی مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔

﴿۶﴾ **سفارش کرنا:-** اس عنوان کے تحت بھی ایک آیت اور دو احادیث پیش فرمائی ہیں۔اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سفارش کی حیثیت کیا ہے؟ اور سفارش کے بھی حدود ہیں۔کہاں سفارش جائز ہے اور کہاں ممنوع ہے،اور کس کی سفارش کی جاسکتی ہے اور کس کی نہیں۔سفارش کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔اور جس سے سفارش کی جائے؛ کیا وہ اس سفارش کو مان ہی لے یہ ضروری ہے؟ یا اس کو اختیار ہے کہ مانے یا نہ مانے۔کسی پر بلاوجہ دباؤ ڈالنا کیسا ہے۔وغیرہ وغیرہ،بہت سی باتیں اس عنوان کے ذیل میں معلوم ہوں گی۔اور بہت سی مرتبہ کسی کی ہم سفارش کرتے اور کراتے ہیں لیکن ہمارا ذہن اس بات کی طرف نہیں جاتا کہ ایسی سفارش کرنے سے یا کرانے سے ہم خود حرام کام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بہرحال! یہ مضمون ان ساری اہم تفصیلات پر مشتمل ہے۔

﴿۷﴾ **آپس کے تعلقات درست کرانا:-** آپس کے تعلقات کی خرابی معاشرہ کو تباہ وبرباد کردیتی ہے،اور اس کے کتنے زیادہ نقصانات ہیں یہ تو تھوڑی سی عقل رکھنے والا بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔لیکن آج کل یہ معاملہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار لوگ بھی باوجود سمجھانے کے نہیں سمجھتے۔اس عنوان کے ذیل میں حضرت مدظلہ العالی نے پورے شرح وبسط

کے ساتھ بات کونہایت واضح کرکے پیش فرمایاہے، درحقیقت یوں کہنا چاہئے کہ ایک طبیبِ حاذق نے مریض معاشرہ کا پورا آپریشن کرکے بیماری کامکمل علاج کردیاہے۔

اس عنوان کے تحت ایک خاص مضمون جوآپ کوپڑھنے ملےگاوہ طلاق والامضمون ہے جوپڑھنے ہی سے تعلق رکھتا۔آج کل چھوٹی چھوٹی باتوں پرلوگ بغیرسوچے سمجھے طلاق کی تین گولیاں چلادیتے ہیں اورپھرروتے پھرتے ہیں۔دراصل یہ وہ چیز ہے جوبوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے شریعت نے رکھی ہے، جوقانونِ اسلام ہی کی خوبی ہے۔حضرت دام مجدہٗ نے بڑی تفصیل سے اس موضوع کوپیش فرمایاہے جوواقعتاً بے بہاخزینہ ہے۔اسلام کے قانونِ طلاق پرغیروں کےاعتراض کی وجہ کیاہے؟ان کےاعتراض کادنداں شکن جواب اس مضمون میں موجودہے۔ضرور پڑھئے اورلوگوں کوبھی سنائیے،اورزیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کیجئے۔خداکرے کہ لوگوں کی عقل میں یہ بات بیٹھ جائے۔

﴿۸﴾**خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت:**۔کسی بھی انسان کوحقیرسمجھنانہایت خطرناک بات ہے،اس لئے کہ کس کامقام عنداللہ کیاہے وہ توہم معلوم کرہی نہیں سکتے۔آج کل دنیاوالوں نے عزت کامعیاردنیوی سازوسامان کو،ظاہری شان وشوکت اوروجاہت کو بنالیاہے،حالانکہ اصل معیاریہ سب چیزیں بالکل نہیں ہیں،ایسے واقعات ہم بکثرت دیکھتے اورسنتے رہتے ہیں کہ ایک آدمی کسی عہدہ اورکرسی پرتھا،لوگ اس کوسلام مارتے تھے اوراس سے ملاقات کواپنے لئے عزت کی معراج سمجھتے تھے،لیکن چنددنوں بعدوہ جب اس عہدہ سے اترا،یااتاراگیا؛توو ہی لوگ جواس کوسلام مارتے تھے،آج اس کی طرف دیکھنابھی گوارانہیں کرتے،لہٰذاہم کسی خستہ حال کے مقابلہ میں باوجاہت کوکس بنیادپرترجیح دے سکتے ہیں؟

اس لئے کہ اصل مرتبہ ومقام تو تقویٰ اور دینداری کی وجہ سے ہوا کرتا ہے، اور آج تک ایسا کوئی تھرمامیٹر نہ ایجاد ہوا ہے اور نہ ہوگا جو یہ بتلائے کہ کس کے دل میں کتنا تقویٰ ہے، اس لئے کسی کی ظاہری خستہ حالی ہمیں اس سے بدظن نہ کرے، بلکہ ایسوں کی تو نبی کریم ﷺ نے بڑی تعریف فرمائی ہے کہ بہت سے پراگندہ بال اور غبار آلود حال ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اگر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا کردیں۔

اس عنوان کے تحت یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی کی ظاہری اچھی حالت کو دیکھ کر اس جیسا ہوجانے کی دعا نہیں کرنی چاہیے۔اور بہت سے دنیا میں اونچے مقام ومرتبہ والے مال دار قیامت کے دن جنت میں داخلے سے روک دیئے جائیں گے اور جن کی دنیا میں کوئی عزت نہیں تھی وہ ان سے کئی ہزار سال پہلے جنت میں پہنچ جائیں گے۔

خیر! ہر عنوان کے تحت بے شمار ذیلی فوائد آگئے ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تمام مضامین الہامی ہیں۔حق تعالیٰ شانہ' حضرت والا کے سایۂ عاطفت کو بصحت وقوت و عافیت درازتر فرمائے، اور ہم سب کو حضرت کے علوم وفیوض سے مستفید فرمائے اور اس فیض کو تاقیامِ قیامت جاری وساری فرمائے، ہماری ناقدریوں پر قلم عفو پھیر کر ہمیں محرومی سے بچائے۔آمین۔

﴿ابوزاہر﴾

بسم الله الرحمن الرحیم
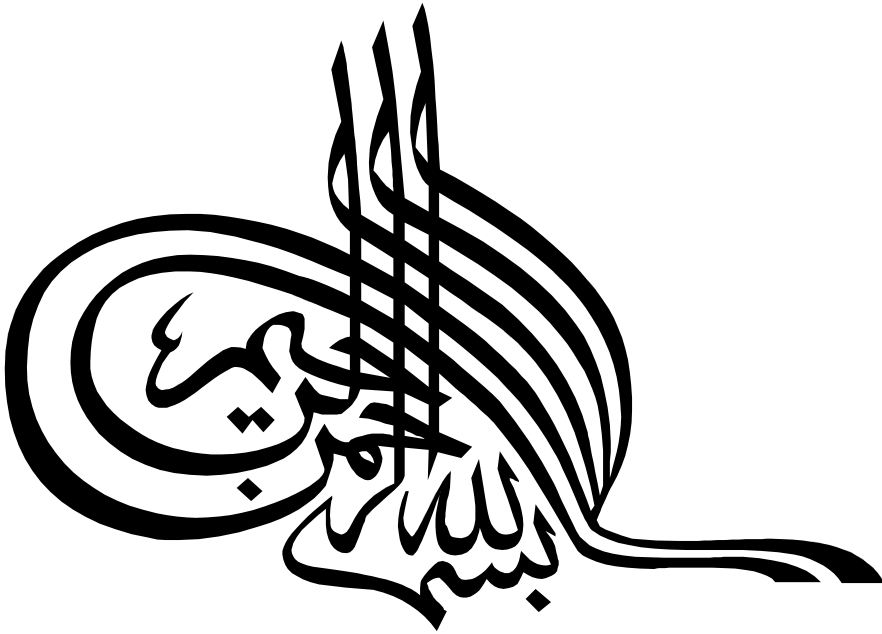
اَلْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَةِ

ادائے امانت کی تاکید

﴿مجلس ۱﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ اِلیٰ أَھْلِھَا.

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَۃَ عَلیٰ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَیْنَ أَن یَّحْمِلْنَھَا وَأَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلاً.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نیا باب قائم کررہے ہیں ''الْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَۃِ'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے بارے میں جو تاکید کی گئی ہے، اس سلسلہ میں آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ اِلیٰ أَھْلِھَا﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تم کو حکم کرتے ہیں کہ امانتیں ان کے حق دار تک پہنچاؤ۔ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی جس کی تھوڑی تفصیل اس طرح ہے۔

﴿فتح مکہ کا ایک منظر﴾

قریش ایک بڑا قبیلہ ہے اس کی مختلف شاخوں میں کچھ مناصب وعہدے تقسیم شدہ تھے، ان میں ایک عہدہ ''سقایہ'' کا تھا، جس شاخ کو یہ عہدہ ملا تھا، ان کی ذمہ داری حاجیوں کو پانی پلانے کی تھی اور اس کو یہ حضرات باعثِ فخر سمجھتے تھے، چنانچہ یہ منصب بنو ہاشم کے اندر چل رہا تھا۔ اسی طرح ایک عہدہ تھا ''علَم''۔ جنگ کے موقعہ پر علَم اور جھنڈا ایک اور

خاندان کے پاس رہا کرتا تھا۔اوراسی میں سے ایک عہدہ ''حجابہ'' کا تھا کہ کعبہ شریف کی چابی اور کنجی ایک اورخاندان کے پاس رہتی تھی،جس خاندان کے پاس یہ منصب تھاوہ بنوشیبہ ہے جوقریش کی ایک شاخ تھی، یہ لوگ شیبی کہلاتے تھے۔نبی کریم ﷺ جب فتحِ مکہ کے لئے تشریف لائے تواس زمانہ میں کلید بردار عثمان نامی تھے،ان کو بلاکر نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی چابی منگوائی، چنانچہ وہ لے کر آئے اور کعبہ کا دروازہ کھولا۔نبی کریم ﷺ اندر تشریف لے گئے، اس کے اندر جو بت اور تصویریں تھیں پہلے وہ نکالی گئیں،اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اندر نماز ادا فرمائی اوراس کے مختلف کونوں میں تسبیح وتہلیل فرمائی۔ کعبہ شریف کے اندر دعا وعبادت وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے دروازے پر تشریف لائے۔مکہ مکرمہ میں جتنے بھی مشرکین وکفار تھے وہ سب اس درمیان میں مسجدِ حرام میں مطاف میں جمع ہو چکے تھے۔پورے مکہ کے تمام باشندے اس بات کے انتظار میں تھے کہ دیکھئے!اب ہمارے لئے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟اس لئے کہ اب تک توان کی زندگی نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں اور آپ کوتکلیفیں پہنچانے میں اورآپ جس دعوت کو لے کر تشریف لائے تھے اس کے خلاف محنت کرنے میں گذری تھی، یہاں تک کہ آپ کوہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑااورہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی انہوں نے آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔بہرحال!یہ لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟چنانچہ نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے دروازے پر تشریف لائے اورآپ نے خود ہی سوال کیا کہ تم لوگ کیا خیال کرتے ہو کہ مَیں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ اس موقعہ پر حضرت سہیل بن عمرو نے-جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے-کہا﴿أَخٌ كَرِيمٌ

وَابۡنُ أَخٍ کَرِیۡمٍ﴾ آپ تو ہمارے شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ہمیں آپ سے اچھے سلوک ہی کی امید اور توقع ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا﴿اِذۡهَبُوۡا أَنۡتُمُ الطُّلَقَآءُ﴾ جاؤ! تم سب آزاد ہو، یعنی تمہاری کوئی گرفت نہیں ہے، سب کو معاف فرمادیا۔اس موقعہ پر آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں کعبہ شریف کی چابی بھی تھی، روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ چابی بھی آپ ہمیں عطا فرمادیجیے تاکہ سقایہ کے ساتھ حجابہ کا منصب بھی بنو ہاشم کو مل جائے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، خود نبی کریم ﷺ بھی قریش کی اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی امید پر کہ آپ بھی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اگر یہ درخواست رکھی جائے گی تو قبول ہوجائے گی انہوں نے کھڑے ہوکر یہ درخواست پیش کی نبی کریم ﷺ نے چابی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دینے کے بجائے جو اس کے کلید بردار عثمان تھے انہی کو بلا کر ان کے ہاتھوں میں دی، اتنا ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی فرمایا﴿خُذُهَا خَالِدَةً تَالِدَةً﴾ آپ یہ چابی ہمیشہ کے واسطے لیجیے۔مطلب یہ ہے کہ قیامت تک کے لئے یہ چابی آپ کے خاندان ہی میں رہے گی، کوئی ظالم ہی اس کو تمہارے ہاتھ سے لے گا۔اتنا ہی نہیں کہ صرف چابی دی بلکہ یوں سمجھئے کہ چابی دینے کے ساتھ یہ بشارت بھی سنادی کہ قیامت تک یہ خاندان باقی رہے گا۔اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ نکلا کہ یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی، ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں رہ سکتی ہے جب کہ خاندان کے افراد بھی موجود ہوں۔

امام مہدی جب ظاہر ہوں......

اسی لئے ہمارے اکابر میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ ایک بزرگ گذرے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے ایک تلوار جو آپ کے پاس تھی اسی خاندان کے ایک فرد کو جو اس زمانے میں کلید بردار تھے یہ کہہ کر حوالے کی کہ امام مہدی جب ظاہر ہوں تو یہ تلوار ان کے حوالے کی جائے تاکہ وہ اس کو جہاد میں استعمال کریں، کیونکہ آپ کا خاندان تب تک باقی رہے گا۔ گویا انہوں نے اس سے یہ فائدہ اٹھایا۔ بہرحال! یہ آیت اس وقت نازل ہوئی، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ جو لوگ امانت کے حقدار ہیں، ان حقداروں تک امانت پہنچائی جائے۔ امانت سے کیا مراد ہے اور امانت کا مفہوم کیا ہے؛ وہ ابھی پیش کرتا ہوں (فتح الباری ۸/۲۴)

بڑی بڑی مخلوقات نے بوجھ اُٹھانے سے انکار کردیا

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً﴾ (پارہ ۲۲، ع ۶) باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے دین کی اور شریعت کی یہ امانت آسمانوں پر، زمینوں پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو اللہ کی بڑی بڑی مخلوقات نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا، اپنے عجز اور بے چارگی کا اظہار کیا کہ ہم امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے:۔

آسماں بارِ امانت نتواند کشید ❁ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

آسمان یہ بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا تو یہ قرعۂ فال ہمارے یعنی انسانوں کے نام آیا، آسمان زمینوں اور پہاڑوں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے امانت کو پیش کیا تو انہوں نے اس کو اُٹھانے سے

انکار کیا﴿وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ اور یہ بڑی بڑی مخلوقات ڈر گئیں۔آسمان جیسی بڑی مخلوق، زمین جیسی بڑی مخلوق اور پہاڑوں جیسی بڑی اور مضبوط مخلوق امانت کے اس بوجھ کو اُٹھانے سے ڈر گئے اور سہم گئے لیکن انسان نے اس کو اُٹھالیا، بے شک انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

امانت سے کیا مراد ہے یہ بھی عرض کر دیتا ہوں۔ ہمارے یہاں عرف میں اور عام بول چال میں امانت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کچھ رقم آپ نے کسی کے ہاتھ میں دی کہ یہ میری امانت ہے، حفاظت سے رکھیو۔ جب یہ امانت دینے والا اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اس کو واپس دے دو، اسی کو امانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر واپس نہ دے اور خرچ کر دے تو اس کو خیانت سے تعبیر کرتے ہیں، گویا ہمارے یہاں امانت کا یہی ایک مفہوم ہے۔ ٹھیک ہے، یہ بھی امانت کے اندر داخل ہے۔

﴿امانت کی وسعت﴾

لیکن عربی زبان کے اعتبار سے امانت کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ عربی زبان میں امانت ایک وسیع معنٰی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہ بھی آجاتا ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ کسی بات یا کسی کام کی انجام دہی میں کسی پر اعتبار اور بھروسہ کرنا؛ اس کا نام **''امانت''** ہے۔ اب بھروسہ کرنے والے نے جس کام کی انجام دہی میں اور جس ذمہ داری کو پورا کرنے میں جس آدمی پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے، وہ اس کو پورے طور پر بجالاتا ہے، تو یوں کہا جائے گا کہ اس نے امانت داری سے کام لیا۔ گویا ایک امانت اس کے حوالے کی اور وہ آدمی اس کے اعتماد پر پورا اترا، اور اس پر جو بھروسہ کیا گیا تھا اس کے مطابق اس کو انجام دیا، اس میں ذرّہ برابر کمی اور کوتاہی نہیں کی؛ تو کہا جائے گا اس نے امانت کی ادائیگی کی۔ اور اگر

اس نے اس کام کی انجام دہی میں کوتاہی کی اور اس پر پورا نہ اترا تو اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم اپنی زبان میں وشواس (વિશ્વાસ) کہتے ہیں کہ اگر سامنے والا اس کو پورا نہ کرے، وشواس گھات (વિશ્વાસ ઘાત) کرے؛ اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور کسی بھی کام میں کسی کے اوپر وشواس (વિશ્વાસ) اور اعتماد کرنا اسی کو امانت کہتے ہیں۔ عربی زبان میں امانت کا یہی مفہوم ہے۔

﴿ آیتِ امانت کی تفسیر ﴾

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ والی آیت میں امانت سے کیا مراد ہے؟ کہ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمینوں پر پیش کیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مخلوقات کو یہ پیش کش کی کہ ہم تم کو ایک دستورِ حیات اور شریعت دینا چاہتے ہیں، شریعت کے احکام کا آپ کو پابند کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں کرنے کے لئے کہا جائے گا اور کچھ کاموں سے باز رہنے کے لئے کہا جائے گا۔ اگر تم ہمارے ماموارت کو بجالاؤ گے، جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو پورا کروگے اور جن سے باز رہنے کے لئے کہا گیا ہے ان سے بچوگے، تو تم کو ہماری رضامندی اور خوشنودی حاصل ہوگی اور اس کے بدلے میں جنت کی دائمی نعمتیں تم کو دی جائیں گی، اور اگر تم نے ہمارے ان احکام کو انجام نہیں دیا، جو چیزیں کرنے کے لئے کہا گیا ہے ان کو بجا نہیں لائے اور جن چیزوں سے باز رہنے کے لئے کہا جائے گا ان سے باز نہیں رہے، اس کے خلاف کیا؛ تو ہمارا غضب اور ناراضگی تم پر اترے گی، اور اس کے بدلے میں تم کو جہنم کا دائمی اور ہمیشہ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اس آیت میں امانت سے یہی مراد ہے۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے یہ پیش کش کی۔

اب ایک سوال ہوسکتا ہے کہ آسمان زمین پہاڑ میں سوجھ بوجھ اور عقل وادراک کہاں ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے سامنے یہ بات پیش کی جائے اور یہ جواب دیں؟

اس سلسلے میں علماءمفسرین نے لکھا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پیش کش کی تو ظاہر ہے ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی سمجھ اور شعور اور اتنا ادراک بھی عطا فرمایا تھا، جس کی وجہ سے ان کو کی جانے والی پیش کش کا مقصد وہ سمجھ سکیں کہ آئندہ کیا ذمہ داری عائد ہونے والی ہے، اور وہ یہ بھی سمجھ سکیں کہ کچھ احکام دیئے جائیں گے، تم چاہو اپنی مرضی سے انجام دو، تم چاہو انجام نہ دو۔ انجام دو گے تو ہماری خوشنودگی حاصل ہوگی، انجام نہیں دو گے تو ہم ناراض ہوں گے۔ گویا کسی بھی کام کو کرنے میں تم پر زبردستی نہیں ہوگی، بلکہ اختیار ہوگا کہ چاہو تو کرو، اور چاہو تو نہ کرو۔ کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور جنت ملے گی۔ نہیں کرو گے؛ تو ہم ناراض ہوں گے اور جہنم میں بھیجے جاؤ گے، اسی کو شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا شریعت چند احکام کے مجموعے کا نام ہے، اسی کے متعلق ان کے سامنے پیش کش کی گئی تھی۔ اور ان کو جواب دینے کے لئے اختیار بھی تھا۔ ایسی زندگی تم کو چاہیے؟ انہوں نے کہا: اس پر عمل کرنے کی صورت میں تو جنت ملے گی اور عمل نہ کرنے کی صورت میں جہنم میں جانا پڑے گا۔ تو جہنم کے ڈر سے انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے اور ہماری ہمت نہیں۔ آسمانوں نے بھی انکار کر دیا، زمینوں نے بھی انکار کر دیا اور پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا، اور انسان نے اٹھالیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پیش کش کی کہ ہم تم کو کچھ احکام دینے والے ہیں، اور تم کو اختیار رہے گا، تم چاہو تو عمل کرو اور

چھوڑنا چاہو تو چھوڑ بھی سکو گے۔لیکن کرو گے تو ہم راضی ہوں گے اور نہیں کرو گے تو ہم ناراض ہوں گے۔اس پر انہوں نے پوچھا کہ ہم کریں گے تو کیا ملے گا؟ کہا کہ جنت ملے گی انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے (روح المعانی ۲۲/ ۹۸) حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو قبول کرلیا، وہ اس کے لئے ہی پیدا کئے گئے تھے، اس لئے قبول کرنا ہی پڑا۔ بہر حال! یہی ہے وہ ذمہ داری اور امانت جس کو ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿دین پورا ہی امانت ہے﴾

اور اس امانت سے مراد پورا دین ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دین انسانوں کے لئے نازل کیا ہے، جو پورا امانت ہے، دین کا ایک ایک حکم امانت ہے، اس کی بجا آوری انسان کو کرنی چاہیے، اگر اس کو ادا کر رہا ہے تو گویا امانت ادا کر رہا ہے، اور اگر ادا نہیں کر رہا ہے تو گویا امانت کی ادائیگی میں خیانت کر رہا ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ انسان کا پورا جسم امانت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ زندگی عطا فرمائی، ہمارا وجود اور ہر ہر عضو؛ کان، ناک، زبان، ہاتھ، پاؤں اور آنکھ؛ یہ سب امانت ہے۔

﴿آنکھ کی خیانت﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنکھ کی نعمت ایک خاص مقصد کے لئے عطا فرمائی ہے۔آنکھ کی نعمت عطا فرما کر حکم دیا کہ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہو اور کن کن چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ چند چیزوں کے متعلق فرمایا کہ ان کو آپ نہیں دیکھ سکتے، ان میں سے نامحرم بھی ہے۔اور بہت سی چیزوں کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔اب آنکھ کو اسی طرح سے استعمال کرنا جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے؛ یہ تو ہے امانت۔اور اگر اس کے مطابق استعمال نہ کرے، اس

کے خلاف استعمال کرے تو اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی کو قرآن پاک میں فرمایا ہے ﴿یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْیُنِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔اسی کو حدیث کے اندر بھی اشارۃً کہا گیا ہے ﴿أَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْكِذْبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَةِ﴾ (کنزالعمال حدیث نمبر ۳۶۶۰) اے اللہ! تو میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریاکاری سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کردے۔ دیکھو! قرآنِ پاک کی اس آیت میں اور حدیثِ پاک کی اس دعا میں خیانت کے لفظ کو کس لئے استعمال کیا گیا ہے؟ آنکھ کو جہاں استعمال کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کے خلاف دوسری جگہ میں استعمال کرنے کو قرآن وحدیث میں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس نعمت کو اگر اسی جگہ استعمال کریں گے جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اجازت دی ہے تب ہی سمجھا جائے گا کہ ہم نے امانت ادا کی، اور اگر نامحرموں کو دیکھیں گے، ٹی وی دیکھیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنے سے منع کیا ہے، اور حرام بتلایا ہے ان کو دیکھیں گے؛ تو یہی خیانت کہلائے گی، اور غور کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آنکھ کی نعمت عجیب وغریب عنایت فرمائی ہے کہ انسان برابر پیدا ہونے سے لے کر موت تک استعمال کرتا ہے، لیکن اس میں فرق نہیں آتا۔

﴿زبان اور کان بھی امانت ہے﴾

اسی طرح سے زبان بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہے اور یہ بھی ایک امانت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو استعمال کرنے کے لئے بھی بتلایا کہ کہاں کہاں ہم استعمال کرسکتے ہیں، اور کچھ چیزیں ایسی بتلائیں کہ وہاں اس کو استعمال نہیں کرسکتے۔اللہ تعالیٰ کی تسبیح

میں،تہلیل میں،تمجید میں،قرآن پاک کی تلاوت میں،نیکی کے کاموں میں،بھلی باتوں کا حکم دینے میں، برائی سے روکنے میں اس کو استعمال کیا جائے۔اورکسی کی غیبت میں،کسی پر بہتان تراشی میں،گالی گلوچ میں،برے الفاظ کوادا کرنے میں اورلغوگوئی میں،طعن وتشنیع میں استعمال نہ کیاجائے۔لہٰذازبان ایک امانت ہوئی،اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں جہاں اس کو استعمال کرنے کا حکم دیااوراجازت دی اگروہاں استعمال کریں گےتو یہ سمجھا جائے گا کہ ہم نے امانت ادا کی۔اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں استعمال کرنے سے منع فرمایااگروہاں استعمال کریں گےتو یوں سمجھا جائے گا کہ ہم نے خیانت کی۔

کان کا بھی یہی حال ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے کان سے سننے کی نعمت عطا فرمائی، اس میں بھی کچھ چیزوں کو سننے سے منع کیا،باقی چیزوں کی اجازت دی۔اب جہاں اجازت دی وہاں استعمال کریں گے تو ٹھیک ہےاور جہاں اجازت نہیں دی وہاں استعمال کریں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔اسی طرح جتنے بھی اعضاء ہیں،ہمارا پوراوجوداور پوراجسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں،ایسا نہیں ہے۔ہم اس کے مالک نہیں ہیں

﴿آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہے؛امین ہے﴾

دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ زندگی امانت کے طور پر ہمیں عطا فرمائی ہے۔اسی لئے اگرکوئی آدمی خودکشی (આપઘાત) کرے تو اس کوحرام قرار دیا ہے یعنی انسان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرے،اس لئے کہ ہم اس کے مالک ہی نہیں،اگر ہم مالک ہوتے تو ہمارے ہاتھوں اس کوختم کرنے کی اجازت دی جاتی۔

اسی طرح اگرکوئی آدمی اپنی آنکھ پھوڑلے تو وہ گنہگار ہوگا،جس طرح کوئی دوسرا

آدمی آنکھ پھوڑ دے تو وہ گنہگار ہے اسی طرح یہ آدمی خود اپنی آنکھ پھوڑے گا؛ تب بھی گنہگار ہوگا، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو جواب دینا پڑے گا۔ یہ بات اور ہے کہ دوسرا پھوڑتا تو اس کو سزا دی جاتی، اور اس نے خود پھوڑی ہے تو اس کو دنیوی قانونی سزا نہیں دی جائے گی، لیکن وہ گنہگار تو ہوگا۔

بہرحال! ان چیزوں کے ہم مالک نہیں ہیں اسی لئے کوئی آدمی اگر ہمیں یوں کہے کہ مَیں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے قتل کردو۔ مَیں اجازت دیتا ہوں کہ تم میری آنکھ پھوڑ دو؛ تب بھی جس کو اجازت دی ہے اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جو اجازت دے رہا ہے وہ خود مالک ہی نہیں ہے، جب مالک نہیں تو اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز پر تصرف کروائے۔

ایک آدمی نے ہمیں گھڑی دی کہ ابھی رکھو، بعد میں مَیں لے لیتا ہوں، اب ہم دوسرے کو کہیں کہ اس کو پھوڑ دو۔ تو ہمارے کہنے سے دوسرے کے لئے گھڑی کا توڑنا جائز نہیں ہوگا۔ بہرحال! یہ جتنے بھی اعضاء ہیں وہ سارے ہمارے لئے امانت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں امانت کے طور پر عنایت فرمائے ہیں اور ان اعضاء کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص خاص احکام بھی دیے ہیں۔

دولت بھی امانت ہے

بلکہ یہ اعضاء ہی کیا اور بھی جتنی چیزیں ہیں، دولت و پیسہ وغیرہ؛ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت ہیں، آدمی یوں سمجھتا ہے کہ پیسوں کا مَیں مالک ہوں، مَیں جس طرح چاہوں، استعمال کروں، مَیں چاہوں تو ٹی، وی لے آؤں، مَیں چاہوں تو سنیما

دیکھوں، مَیں چاہوں تو اس کے ذریعہ سے فلاں چیز خریدوں؛ تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دولت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتلادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ بتلایا اگر اس کے مطابق استعمال کیا تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اس کے خلاف استعمال کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

بلکہ اپنی ضرورتوں میں بھی جہاں اللہ تبارک وتعالی نے استعمال کرنے کی اجازت دی؛ وہاں ایک حد مقرر فرمادی ہے۔ پیسہ ہمارے پاس ہے، اس کو ہم کھانے میں، جائز کپڑا پہننے میں استعمال کریں، جائز مکان بنانے میں استعمال کریں؛ سب جائز ہے۔ لیکن اپنی ان ضرورتوں میں بھی ایک حد مقرر کی ہے کہ اُس مقررہ حد سے تجاوز نہ کریں؛ جس کا نام فضول خرچی ہے، اس لئے کہ وہ بھی گناہ ہے، اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ معلوم ہوا یہ دولت بھی ہمیں دی گئی ہے، اس کے ہم مالک نہیں ہیں بلکہ یہ بھی ہمارے ہاتھ میں امانت ہے۔ یہ وقت، زندگی اور تمام چیزیں امانت ہیں۔ امانت کا مفہوم بہت عام ہے۔ یہ تو ہماری زندگی کے متعلق ہوا۔

ملازمت میں خیانت

زندگی کے دوسرے شعبے بھی ہیں جن میں امانت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مَیں نے ابھی بتلایا تھا کہ اگر کوئی ہم پر اعتماد کرے اور ہم اس کے خلاف کریں تو یہ خیانت کہلائے گی مثلاً آپ کسی کے یہاں ملازم اور نوکر ہو گئے، اب دونوں کے درمیان جتنے وقت کا معاہدہ اور ایگریمنٹ (Agreement) ہوا؛ اتنا وقت آپ نے اپنے اوقات میں سے طے کرلیا، مثلاً

روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر شام کو چھ بجے تک کے دس گھنٹے اور درمیان میں دو گھنٹے کی چھٹی ہے تو آٹھ گھنٹے آپ نے مالک، آقا اور سیٹھ کو فروخت کر دیے۔ اب سیٹھ نے آپ کو کام سونپا کہ تمہیں فلاں کام کرنا ہے۔ تو گویا ان آٹھ گھنٹوں کے اب آپ مالک نہیں ہیں بلکہ وہ مالک ہے جس کے یہاں آپ ملازمت کر رہے ہیں، اس کا معاوضہ آپ کو ملنے والا ہے۔ اب یہ آٹھ گھنٹے آپ وہیں استعمال کریں گے جہاں وہ مالک آپ کو بتلا رہا ہے۔ اب اگر کچھ وقت ایسا ہے کہ جس میں آپ کا کوئی دوست آ گیا اور آپ اس کے ساتھ بات کر رہے ہیں یا اس میں آپ اخبار پڑھ رہے ہیں یا اس میں آپ کہیں دور دوسری جگہ چلے گئے؛ تو یہ آپ نے خیانت کی۔ اس لئے کہ یہ آٹھ گھنٹے آپ کے نہیں تھے، آپ تو تنخواہ کے بدلے میں یہ آٹھ گھنٹے بیچ چکے ہیں، یہ وقت آپ کا نہیں ہے، یہ وقت تو آپ تنخواہ کے بدلے میں سیٹھ اور مالک کو دے چکے ہیں، اب اس نے آپ کو جہاں استعمال کرنے کا پابند کیا ہے اسی میں استعمال کریں، اگر اس میں سے ایک منٹ بھی آپ ضائع کریں گے؛ تو یہ خیانت کہلائے گی۔

ملازمین کے لئے سبق آموز طرزِ عمل

''اکابر کا تقویٰ'' نامی ایک کتاب ہے اس میں اس قسم کے بہت سے واقعات آپ پڑھیں گے۔ ہمارے اکابر دیوبند میں سے ایک بزرگ ہیں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ درس کے درمیان کوئی ملنے والا آ گیا تو گھڑی دیکھ کر اس کو نوٹ کر لیتے تھے کہ آٹھ بجے یہ آدمی آیا، اب ان کی کوشش تو یہ ہوتی تھی کہ جلدی سے اس کو نمٹا دیں، جب وہ واپس چلا جاتا تو وقت دیکھ کر اس کو بھی نوٹ کر لیتے کہ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر گیا۔ اس طرح کا کوئی بھی

وقت ہوتا تو اس کو ڈائری میں نوٹ کر لیتے اور مہینے کے اخیر میں اس کو جوڑ کر ایک دن کے برابر ہو جاتا تو اس کی تنخواہ وصول نہیں کرتے۔ اس لئے کہ جب ہم نے یہ وقت وہاں لگایا نہیں جس کا ہمیں کہا گیا تھا، تو اتنی تنخواہ بھی ہم نہیں لیتے۔ خود ہی لکھ کر اطلاع کر دیتے کہ آدھے دن کی یا پورے دن کی تنخواہ نہ دی جائے اس لئے کہ اتنا وقت دوستوں کی ملاقات میں یا دوسرے آنے جانے والوں کی ملاقات میں خرچ ہوا ہے۔ اس بات کا خاص اہتمام کرتے یعنی ان حضرات کے یہاں یہ چیز بہت اہم تھی۔ حالانکہ ان کی تنخواہ کتنی ہوتی تھی، مہینہ کی دس پندرہ روپیہ تنخواہ ہوتی تھی۔ اس میں بھی یہ حال ہوتا تھا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے تھی۔ جب آپ کی عمر زیادہ ہوئی تو شوریٰ والوں نے طے کیا کہ تنخواہ بڑھائی جائے، اس میں اضافہ کیا جائے اور پندرہ روپے کی جائے۔ کمیٹی والوں نے طے کر کے پندرہ روپے کر دی اور شوریٰ میں پاس کر دیا۔ حضرت کو معلوم نہیں تھا۔ جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ دینے کے لئے آدمی آیا تو اس نے پندرہ روپے دیئے۔ حضرت نے واپس کر دیئے کہ میری تنخواہ تو دس روپے ہی ہے۔ اس نے کہا کہ کمیٹی والوں نے اضافہ کر دیا ہے، اور بجائے دس کے پندرہ روپے کر دی ہے، آپ قبول کر لیجیے۔ تو حضرت نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی، پہلے مَیں جوان تھا تو دس روپے تنخواہ تھی، اب تو مَیں بوڑھا ہو گیا اور بوڑھا ہونے کی وجہ سے وہ بات بھی نہیں رہی، اس لئے تنخواہ میں کمی ہونی چاہیے تھی نہ کہ زیادتی۔ شوریٰ والوں نے بہت کہا لیکن آپ نے زائد پانچ روپے قبول نہیں کیے، بلکہ وہی دس روپے تنخواہ لیتے رہے۔

﴿پھر تو دنیا میں جھگڑے ہی ختم ہو جائیں﴾

بہر حال! امانت والا وصف بہت اونچا وصف ہے۔ آج کل تو مزاج یہ بن گیا ہے کہ ملازمین کی طرف سے مطالبات ہوتے ہیں کہ ہماری تنخواہ بڑھائی جائے، ہمارے حقِ رخصت میں اضافہ کیا جائے اور پھر نعرے بازی، جلسے اور یونین قائم کی جاتی ہے۔ ان کے اوپر کیا ذمہ داری ہے، ان کے فرائض کیا ہیں؛ اس کی ادائیگی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں! ہر جگہ یہ نعرہ ہے کہ ہمیں یہ حق دو، ہمیں وہ حق دو۔ تم پر دوسروں کا جو حق ہے وہ ادا کرنے کی بات نہیں رہی۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا﴾ تم پر جو حق ہے، تم پر جو ذمہ داری ہے؛ وہ ادا کرو۔ اب تمہارا حق دوسرے پر جو ہے اس کے مطالبہ کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ لیکن یہاں معاملہ اُلٹ گیا۔ ہمارے معاشرے میں ہم دیکھ رہے ہیں، گھروں میں خاندانوں میں محلوں میں، بستیوں میں جھگڑے اور لڑائیاں ہیں، اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ ہر ایک اپنا حق مانگ رہا ہے لیکن دوسرے کے حق کو دینے کی فکر نہیں کر رہا ہے۔

ہم لوگوں نے سبق ہی الٹا پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ سیدھا سبق تو یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ نے شوہر کو بیوی کے حقوق بتلائے ہیں کہ تمہاری بیوی کے تم پر یہ حقوق ہیں، اور بیوی کو شوہر کے حقوق بتلائے کہ تم پر تمہارے شوہر کے یہ حقوق ہیں۔ اسی طرح باپ کو بیٹے کے حقوق بتلائے کہ آپ باپ ہیں تو آپ پر بیٹے کے یہ حق ہیں، اور بیٹے کو باپ کے حقوق بتلائے کہ تم بیٹے ہو تو تم پر باپ کے یہ حقوق ہیں۔ شریعت نے ہر ایک کو دوسرے کا حق کیا ہے وہ بتلایا اور کہا کہ اس کو ادا کرو۔ لیکن اب کیا ہو گیا کہ شوہر کو جو سبق پڑھنا چاہیے تھا کہ بیوی کا میرے اوپر کیا حق ہے، وہ پڑھنے کے بجائے وہ پوچھتا ہے کہ میرا حق بیوی پر کیا ہے۔ اگر مولویوں سے

سوال کرے گا، مفتیوں سے فتویٰ پوچھے گا تو یہ نہیں پوچھے گا کہ بیوی کا حق مجھ پر کیا ہے، بلکہ یہ پوچھے گا کہ میرا حق بیوی پر کیا ہے۔ دوسرے کا جو سبق تھا وہ پوچھتا ہے، اپنا سبق بھول گیا۔ یہی حال بیوی کا ہے کہ بیوی پوچھتی ہے کہ شوہر پر میرا حق کیا ہے۔ یہ نہیں پوچھتی کہ شوہر کا حق میرے اوپر کیا ہے۔

بھائی! سیدھی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو وہی چیز پوچھنی چاہیے جو خود کرنے کی ہے۔ شوہر کو بیوی کے حق ادا کرنے ہیں، اس لئے وہ یہی پوچھے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب رہے شوہر کے حق؛ تو وہ تو بیوی ادا کرے گی، لہٰذا شوہر اس کے بارے میں پوچھ کر کیا کرے گا۔ اسی طرح بیوی کو شوہر کا حق ادا کرنا ہے، لہٰذا وہ یہ پوچھے کہ شوہر کا حق میرے اوپر کیا ہے۔ وہ یہ کیوں پوچھتی ہے کہ میرا حق شوہر پر کیا ہے۔ وہ تو شوہر کو ادا کرنا ہے تو وہ پوچھے۔

اسلام نے تمہارے اوپر دوسرے کے جو حق ہیں وہ بتلائے ہیں۔ شوہر کو بتلایا کہ بیوی کا یہ حق ہے، اور بیوی کو بتلایا کہ شوہر کا یہ حق ہے۔ اب جو سبق خود کا تھا وہ بھول گیا اور جو دوسرے کا تھا وہ رٹنا شروع کر دیا؛ تو جھگڑے شروع ہو گئے۔ اگر ہر ایک اپنا اپنا سبق یاد کرنے لگے اور اس کو ادا کرنے کی کوشش کرے؛ تو دنیا میں جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔

اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ آقا کا حق کیا ہے یہ غلام سیکھے۔ ملازم یہ سیکھے کہ میرے اوپر آقا کا کیا حق ہے۔ اور آقا یہ سیکھے کہ میرے اوپر ملازم کا کیا حق ہے۔ دونوں اپنی اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اس کو ادا کرنے کا اہتمام کریں تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوگا۔

﴿دفتری سامان بھی امانت ہے﴾

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ جیسا کہ مَیں نے کہا کہ ملازمت کا وقت بھی امانت ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ یہ دفتری سامان بھی امانت ہے مثلاً آپ سرکاری کھاتے میں نوکری کرتے ہیں۔ آپ کلکٹر ہیں، گورنر ہیں، افسر ہیں۔ آپ کو سرکاری کوئی شعبہ دیا گیا ہے، آپ اس میں انچارج ہیں۔ اس کے لئے آپ کو آفس دی گئی، آفس میں ٹیبل، کرسی، فون، گاڑی اور بہت ساری چیزیں آپ کو اس لئے دی گئی ہیں تاکہ آپ کو ڈیوٹی انجام دینے میں سہولت ہو، لہٰذا اس کے لئے تو آپ یہ ساری چیزیں استعمال کر سکتے ہیں، اسی میں سے ایک کاغذ اور پینسل ہے اس کو بھی آپ اسی کام میں استعمال کر سکتے ہیں جس کے لئے وہ دیا گیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کام میں آپ استعمال کریں گے؛ تو یہ خیانت میں شمار ہوگا۔ اسی طرح گاڑی آپ خود استعمال کرنے کے بجائے آپ کے دوست کو دیں۔ وہ فون جو آپ کو آفس کے کام کے لئے دیا گیا ہے، اس کو آپ دوسری جگہ پر لگائیں گے؛ تو یہ خیانت کہلائے گی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ مدرسہ میں بیٹھنے کے لئے چھوٹا سا گدا دیا جاتا ہے ایک مرتبہ آپ اس گدے پر تشریف فرما تھے اور سبق پڑھا رہے تھے، جب سبق سے فارغ ہوئے تو کوئی دوست ملنے کے لئے آیا، اس سے گفتگو کرنا شروع کی تو اس گدے سے ہٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کیوں ہٹ گئے؟ تو جواب دیا کہ مدرسہ والوں نے اس پر بیٹھ کر سبق پڑھانے کے لئے یہ گدی دی ہے، دوستوں سے باتیں کرنے کے لئے نہیں دی ہے۔

بہرحال! یہ دفتری سامان بھی امانت ہے،اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم امانت کے بارے میں کتنا اہتمام کرتے ہیں۔حالانکہ اس کا بھی آدمی کو بڑا اہتمام ہونا چاہیے۔

﴿ایک ضروری مسئلہ﴾

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی دوسرے کی چیز جو آپ کے یہاں عاریت کے طور پر آئی ہے وہ بھی امانت ہے،اس کی ادائیگی کا پورے طور پر آپ کو اہتمام کرنا چاہیے۔کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ پلیٹ کے اندر کسی کے یہاں سے آپ کے یہاں کھانے کی کوئی چیز آئی۔تو وہ پلیٹ اتنی دیر کے لئے آئی ہے کہ وہ کھانے کی چیز اس کے گھر سے آپ کے گھر تک پہنچ جائے۔اس لئے نہیں آئی کہ وہ پلیٹ ہی رکھ کر اسی میں سے آپ کھانا شروع کردیں۔اب چلئے وہ تو کھالیا اس کے بعد بھی پلیٹ بھیجنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔اس کی کہاں اجازت ہے،اس کو منع لکھا ہے۔

کسی نے آپ کو راز کی کوئی بات یہ سمجھ کر کہی کہ آپ اس کی بات کو بھید رکھیں گے، لیکن آپ نے دوسرے کو بتلا دیا۔اس نے آپ پر جو اعتماد کیا تھا اس کو مجروح کیا؛ تو یہ بھی خیانت کہلائے گی۔

بہرحال! امانت کا مفہوم بہت عام اور بڑا وسیع ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر جزو اس عموم مفہوم میں آجاتا ہے۔اسی لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿لا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا أَمَانَةَ لَهُ (مسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۵۶۷)﴾ جس آدمی کے اندر امانت کا وصف اور امانت والی خوبی نہیں تو یوں سمجھو کہ وہ کامل مؤمن ہی نہیں۔کامل مؤمن اسی وقت بن سکتا ہے جب اس میں جذبۂ امانت ہو۔جب اس کے اندر یہ وصف ہوگا تو کوئی دیکھے یا نہ دیکھے،کوئی کہے یا نہ کہے، کوئی ٹوکے یا نہ ٹوکے؛ وہ اپنی طرف سے ہی امانت کو ادا کرنے کا اہتمام کرے گا۔

اَلْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَةِ

ادائے امانت کی تاکید

﴿مجلس ۲﴾

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۹؍مئی ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔أمابعد.

وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: آیَۃُالْمُنَافِقِ ثَلاثَۃٌ: اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَاوَعَدَأَخْلَفَ وَاِذَااؤْتُمِنَ خَانَ. وفی رِوَایۃٍ: وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُؤْمِنٌ.

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ یہ باب امانت کی ادائیگی کے سلسلے میں چل رہا ہے۔امانت سے کیا مراد ہے؟ وہ مَیں آپ حضرات کے سامنے عرض کر چکا ہوں۔اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیتیں پیش فرمائی تھیں ان کی تشریح آپ کے سامنے آ چکی ہے۔اب ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی نشانیاں تین ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کسی سے وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ یہاں اس روایت کو اسی تیسرے جزو کی وجہ سے لائے ہیں۔

ایک روایت میں ایک زیادتی اور بھی ہے کہ جس میں یہ تین باتیں ہوں تو یہ منافق کی علامت ہے، پھر چاہے وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں؛ پھر بھی وہ کامل مسلمان نہیں ہے بلکہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ منافق ہے۔

منافقین؛ اور ان کا پس منظر

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک مستقل گروہ تھا جن کو منافقین سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے مؤمن کی صفت ہے ایمان، کافر کی صفت ہے کفر، مشرک کی صفت ہے شرک؛ اسی طرح منافق ہے جس کی صفت ہے نفاق۔

حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں تین قسم کے لوگ تھے۔ وہاں قبیلے اور خاندان کے اعتبار سے پہلے سے دو جماعتیں آباد تھیں۔ ایک تو وہ حضرات تھے جن کی دعوت پر نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے، اور وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے؛ وہی حضرات انصار کہلائے۔ ان کے دو قبیلے تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج۔ یہ لوگ مذہب کے اعتبار سے مشرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، ان کے بھی دو بڑے مشہور قبیلے تھے، بنوقریظہ اور بنونضیر۔ یہودیوں کے دونوں قبیلوں میں آپس میں ٹکراؤ، لڑائیاں اور مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ اسی طریقے سے مشرکین کے جو دو قبیلے تھے اوس اور خزرج؛ ان میں بھی زمانۂ جاہلیت میں آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا، بعد میں اوس اور خزرج میں بھی اسلام آیا۔

چونکہ یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق مکہ مکرمہ حج کے لئے جایا کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں نبی کریم ﷺ اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق عرب کے مختلف قبائل جو حج کے لئے وہاں آتے تھے ان میں اسلام کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ والوں کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کی، شروع میں ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے، بعد میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کے لئے مکہ مکرمہ میں آزادی کے ساتھ

اسلام کی دعوت پیش کرنا مشکل تھا، مکہ والوں اور قریش کی طرف سے بہت سخت رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں، اس لئے حضور اکرم ﷺ چاہتے تھے کہ آزادی کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرنے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ عرب کے جو قبائل حج کے موقعہ پر آتے تھے ان کے سامنے اپنی بات پیش کیا کرتے تھے کہ یہاں میرے لئے مشکلات اور رکاوٹیں ہیں، مجھے اپنے یہاں لے چلو، تاکہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے آزادی کے ساتھ پیش کرسکوں۔ چنانچہ اوس اور خزرج کے سامنے بھی آپ نے اپنی یہ بات رکھی۔ چونکہ ان کے کچھ لوگ اسلام لا چکے تھے۔

منیٰ میں جہاں جمرۂ عقبہ ہے جس کو بڑا شیطان کہتے ہیں وہاں سب سے پہلے اسلام پر بیعت ہوئی تھی، یہی پہلی بیعت ''بیعتِ عقبۂ اولیٰ'' کہلاتی ہے۔ ''عقبہ'' اصل میں گھاٹی کو کہتے ہیں، اسی گھاٹی میں یہ جمرہ واقع ہے، اس لئے اس کو جمرۂ عقبہ کہا جاتا ہے۔ خیر! وہ لوگ شروع میں تو تھوڑے تھے، لیکن بعد میں ان میں اضافہ ہوا اور وہ ستّر [۷۰] سے زیادہ آدمی ہو گئے تھے اور بعد والی بیعت ''بیعتِ عقبۂ ثانیہ'' کہلاتی ہے۔

بہر حال! ان کے سامنے جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی بات رکھی تو ان لوگوں نے آپ کی اس پیشکش کو قبول کیا اور کہا کہ ہم آپ کو اپنے یہاں لے جاتے ہیں اور آپ کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں اور ہم آپ کے اس کام میں آپ کا پورا تعاون کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے چچا ہیں، انہوں نے ان لوگوں سے - جو بعد میں انصار کہلائے - کہا کہ اے انصار کی جماعت! دیکھو! ہم نے ان کی پوری پوری حفاظت کی ہے، جس کی وجہ سے یہ بڑی عزت وحفاظت کے

ساتھ مکہ میں ہیں، اگر تم ان کو اپنے یہاں بلا کر وہ عدے پورے کرو گے جو تم ابھی کر رہے ہو اور مخالفین سے ان کی حفاظت کرو گے؛ تب تو ٹھیک ہے، اور اگر ان کو لے جا کر دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو پھر ان کو یہیں رہنے دو، اس لئے کہ یہ اپنی قوم اور اپنے وطن میں عزت وحفاظت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ اسی میں ایک بات یہ طے ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ میں رہ کر ہم نبی کریم ﷺ کا پورا تعاون کریں گے اور آپ کی حفاظت کریں گے۔ (سیرۃ ابن ہشام، ۲/۱۸۹)

خیر! بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو ہجرت کی اجازت ملی اور آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اوس اور خزرج کے جو لوگ اسلام لے آئے تھے وہ تو مؤمن اور مسلمان کہلاتے تھے اور ان کے جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے وہ مشرک کہلاتے تھے اور تیسرا گروہ یہودیوں کا تھا۔ تو گویا مذہب کے لحاظ سے تین جماعتیں تھیں (۱) مؤمنین (۲) مشرکین (۳) یہود۔ یہ تینوں مدینہ منورہ میں آباد تھے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے کارنامے

چنانچہ بخاری شریف میں روایت موجود ہے (بخاری جلد۲، صفحہ ۶۵۵، کتاب التفسیر) کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ - جو قبیلۂ خزرج کے سردار تھے - بیمار ہوئے، نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کے لئے سواری پر تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، راستہ میں دیکھا کہ ایک جگہ چند لوگ جمع ہیں جن میں مسلمان، مشرکین اور یہود تھے، ان میں عبداللہ بن ابی بھی تھا جو مشرک تھا اور ابھی اس نے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ آپ گذر رہے تھے تو سواری کی وجہ سے غبار اُڑ رہا تھا اور وہ غبار مجلس

والوں پر بھی آ رہا تھا تو عبداللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک ڈھانپ دی اور کہنے لگا کہ ہم پر غبار نہ اُڑایا جائے۔ دراصل وہ نبی کریم ﷺ سے یوں بھی جلا ہوا تھا کہ آپ کے تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اس کو اپنا سردار بنانا تجویز کیا تھا، لیکن اسلام کی دعوت جب مدینہ منورہ میں پھیلی تو یہ سارا پروگرام جو پہلے سے طے شدہ تھا وہ عمل میں نہیں آ سکا۔ اسی لئے اس کو آپ ﷺ سے جلن تھی اور حسد تھا۔

بہرحال! حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ بھی تھی کہ جب کوئی مجمع دیکھتے تو مجمع کی مناسبت سے اللہ کا پیغام ان کے سامنے پیش فرماتے تھے، لہٰذا حضور اکرم ﷺ نے تو یہ مجمع دیکھ کر آگے بڑھنا موقوف کیا، اپنی سواری سے اترے اور ان کے سامنے قرآن پاک کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں اور اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ آپ ہماری مجلس میں آ کر اس طرح کرتے ہیں اور ہماری باتوں کے بیچ میں دخل اندازی کرتے ہیں، آپ کی باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں، لیکن کوئی آپ کے پاس آپ کے گھر آوے تو اس کے سامنے دعوت پیش کیا کیجیے، ہماری مجلسوں کو اس طرح نہ بگاڑیئے۔ اس پر وہاں جو مؤمنین موجود تھے ان میں اور اس میں کچھ تو تو میں میں بھی ہوئی۔ اس کی اس روش سے نبی کریم ﷺ کو دُکھ پہنچا، آپ آگے بڑھے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے پہنچے اور وہاں ان سے تذکرہ کیا کہ عبداللہ بن ابی (ابو حباب اس کی کنیت تھی) ابو حباب نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! آپ اس کو چھوڑ دیجیے، اس لئے کہ یہاں والوں نے اس کو اپنا سردار بنانا تجویز کیا تھا لیکن آپ جب ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے اور اسلام کی دعوت پھیلی تو یہ سارا بنا بنایا

نظام رکھا رہ گیا، اس لئے اس کے دل میں آپ کے متعلق جلن ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اسی وجہ سے کرتا ہے، آپ اس سے درگذر فرمائیے۔ ویسے بھی جب تک جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا وہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو تاکید تھی کہ ان اہلِ کتاب و مشرکین کی طرف سے جو ایذائیں اور تکلیفیں آپ کو پہنچائی جاتی ہیں ان پر صبر سے کام لیجیے۔ اس کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور قریش کے ساتھ بدر میں مقابلہ ہوا اور اس میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تو اس واقعہ کے پیش آنے تک تو عبداللہ بن ابی اور دوسرے لوگ کھلّم کھلاّ مشرک تھے لیکن بدر کے واقعہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو کامیابی اور فتح عطا فرمائی اور اس کے حالات مدینہ منورہ پہنچے کہ مشرکین کے ستّر لوگ مارے گئے جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے اور ستّر آدمی قید ہوئے، تو اس کی وجہ سے ایک خوف اور ہیبت سی چھا گئی اور عبداللہ بن ابی نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب کھل کر ان لوگوں کی مخالفت کرنا مناسب نہیں ہے، ہمیں اپنی روش اور طریقہ بدلنا چاہیے، اگرچہ دل میں جو دشمنی تھی وہ ختم نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس نے کہا کہ اب ہم ایسا کریں کہ ظاہر میں تو اسلام کا لبادہ اوڑھ لیں، اور اندرونی طور پر جو عداوتیں کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں گے، تاکہ ظاہری مسلمانی کی وجہ سے ان کی طرف سے ہمیں کوئی مشکل و تکلیف نہیں پہنچے گی، اور ہماری جان و مال محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ اس طرح یہ ایک نئی جماعت شروع ہوئی جنہوں نے اپنی زبان سے اسلام کا اظہار کیا اور دل میں مسلمان نہیں تھے بلکہ وہ اپنے پرانے عقیدوں کے اوپر قائم تھے اور مشرک تھے ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِؤُنَ﴾ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ایمان والوں کے ساتھ ملاقات کرتے تھے تو یوں

کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے سرکش لوگوں سے ملتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں کا ٹھٹّھا کر رہے ہیں اور ظاہری طور پر ان کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔اب تک تین جماعتیں تھیں، اب یہ چوتھا گروہ پیدا ہوا جو ظاہری اعتبار سے تو مؤمنین کے اندر شامل تھا لیکن حقیقی طور پر مشرکین کا گروہ تھا، یہاں سے نفاق کی ابتداء ہوئی۔عبداللہ بن ابی اس کا سردار کہا جاتا ہے اور اس کے ہمنوا بھی بہت سارے لوگ تھے، جو اسی برائی میں مبتلا تھے جس کو قرآن پاک میں نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ان لوگوں کی طرف سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا اور نبی کریم ﷺ کی وفات تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور عبداللہ بن ابی کا انتقال غزوۂ تبوک کے بعد ہوا ہے۔حضرت عائشہ صدیقہؓ پر زنا کی تہمت لگائی گئی تھی اس میں بھی اس کا بڑا حصہ اور ہاتھ تھا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لئے بھی وہ بہت کوشش کرتا رہتا تھا، اہلِ اسلام کو مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچانا اس کا شیوہ تھا

منافقین کے ساتھ آنحضور ﷺ کا برتاؤ

اس کے باوجود نبی کریم ﷺ اس کے اس ظاہری ایمان کی وجہ سے اس کے ساتھ وہی معاملہ فرماتے تھے جو اہل ایمان کے ساتھ کیا جاتا تھا۔بعض مرتبہ مخلصین صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض بھی کیا کہ اس کا ایسا معاملہ ہے، اس لئے اس کے قتل کی ہمیں اجازت دیجیے، لیکن نبی کریم ﷺ نے کبھی اجازت نہیں دی، بلکہ آپ فرماتے کہ یہ لوگ جب اپنے آپ کو ایمان والا کہتے ہیں، اس کے باوجود مَیں ان کے قتل کی اجازت دے دوں اور قتل کراؤں تو دوسرے لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کراتے ہیں، اور یہ چیز لوگوں کو ایمان سے برگشتہ کرنے کا اور اسلام سے دور رکھنے کا سبب بنے گی (بخاری شریف،۳۵۱۸) بہر حال!

نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ بڑے اخلاق و محبت سے پیش آتے رہے اور ان کے ساتھ ایمان والوں جیسا ہی معاملہ ہوتا تھا، اگرچہ آپ بھی جانتے تھے کہ یہ لوگ منافق ہیں۔

بلکہ غزوۂ تبوک سے واپسی میں تو ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے قتل کی سازش بنائی تھی (نعوذ باللہ من ذالک) آپ ﷺ ایک گھاٹی میں سے گذر رہے تھے، اس وقت ان لوگوں نے قتل کرنا چاہا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور جن لوگوں نے یہ اسکیم اور سازش تیار کی تھی ان کے نام سے بھی حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے واقف کیا، حضور ﷺ نے اُن لوگوں کے یہ نام حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے تھے، اسی لئے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ صاحبُ سر الرسول ''حضور کے راز دار'' کہلاتے تھے۔ (مجمع الزوائد۔۱۰۳۲۹)

غزوۂ تبوک کے کچھ دنوں کے بعد عبداللہ بن ابی بیمار ہوا اور اس کا انتقال ہوا، اس کے ایک بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا وہ مخلص مؤمن تھے، اس کے انتقال کے بعد وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے، آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھایئے اور اس کے کفن کے واسطے اپنا کرتہ بھی عنایت فرمایئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مَیں آتا ہوں۔ آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھنا منظور فرمالیا اور کفن کے لئے کرتہ بھی عنایت فرمایا۔ (بخاری شریف۔۱۲۶۹)

غزوۂ مریسیع اور عبداللہ بن اُبی کی فتنہ انگیزی

غزوۂ بنوالمصطلق کے موقعہ پر عبداللہ بن ابی نے نبی کریم ﷺ کے خلاف انصار کو بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ غزوۂ بنوالمصطلق (جس کا نام غزوۂ مریسیع بھی ہے) سے جب مسلمان واپس آرہے تھے، اور اسی میں حضرت عائشہؓ کے اوپر تہمت والا واقعہ بھی

پیش آیا تھا۔اس غزوہ سے واپسی میں ایسا ہوا کہ ایک جگہ پر مسلمانوں کے لشکر نے قیام کیا۔ وہاں پانی کی قلّت تھی کچھ گڑھوں میں بارش کا تھوڑا سا پانی موجود تھا تو جو لوگ پہلے پہنچے انہوں نے پانی کے ان گڑھوں کے اوپر اپنا چمڑہ، ڈھال وغیرہ ڈال کر قبضہ کرلیا۔اسی میں ایک انصاری اور مہاجری کا تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا تو ایک مہاجری نے جو حضرت عمرؓ کا خادم تھا ایک انصاری کو دھپّہ مار دیا اور ان دونوں میں لڑائی تیز ہوگئی تو دونوں نے اپنی اپنی جماعت کو مدد کے واسطے پکارا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔انصاری نے پکارا﴿یَالَلْأَنْصَار﴾ اے انصار! میری مدد کے لئے آؤ۔ نبی کریم ﷺ کے گوشِ مبارک میں جب یہ آواز پہنچی تو آپ نے ارشاد فرمایا ﴿مَابَالُ دَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ﴾ یہ جاہلیت والا نعرہ کون لگا رہا ہے؟ یعنی گروہ، قبیلے اور جماعت کی بنیاد پر کسی کو مدد کے واسطے پکارنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا (بخاری شریف۔۳۵۱۸) اسلام تو حق کی بنیاد پر حمایت کرنے کا حکم دیتا ہے ﴿اَلْمُسْلِمُ أَخو الْمُسْلِمِ، لايَظْلِمُهُ وَلايَسْلِمُهُ (بخاری،۲۴۴۲)﴾ ایک مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ خود اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے اور نہ اس کو ظالم کے حوالے کرتا ہے، بلکہ ہر حال میں اس کی مدد کرتا ہے۔اسی لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا﴿أُنْصُرْ أَخاكِ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً﴾ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ایک صحابی نے سوال کیا﴿يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ مَظْلُوماً فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ ظَالِماً؟﴾ اگر وہ مظلوم ہے تو مَیں اس کی مدد کروں یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ظالم ہوتے ہوئے اس کی کیسے مدد کروں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا﴿أَنْ تَمْنَعَهُ عَنِ الظُّلْمِ﴾ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو (بخاری شریف۔۲۴۴۳) یعنی ظلم کر کے وہ دوسرے کسی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہا ہے اور اپنا نقصان کر رہا ہے، اس کو ظلم سے روکو؛ یہ اس

کی مدد ہوئی۔ بہرحال! اسلام قبیلے، برادری یعنی جماعت یا پارٹی کی بنیاد پر کسی کی حمایت کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اسی کو تعصب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿تحزّب اور تعصّب کیا ہے؟﴾

بھائی! یہ ہماری جماعت کا آدمی ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، اب وہ حق پر ہو یا ناحق پر؛ آپ اس کی حمایت کریں، اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ یہ تو اہل باطل کا شیوہ اور طریقہ ہے۔ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ آپ حق کا ساتھ دیجیے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اور مظلوم کی حمایت کیجیے۔ اسلام کی تعلیمات یہی ہیں۔

بہرحال! جب یہ نعرہ بلند ہوا کہ اے مہاجرین، اے انصار، اور حضور ﷺ کے گوشِ مبارک میں یہ آواز پڑی تو آپ نے پوچھا کہ کیا بات ہے مَیں جاہلیت والا نعرہ سن رہا ہوں، پھر فرمایا کہ یہ بدبودار نعرہ ہے، اسلام میں اس کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں ہے۔

بہرحال! آپس میں تکرار بھی ہوئی، حضور ﷺ فوراً پہنچے اور دونوں کو ٹھنڈا کیا اور دونوں سے ایک دوسرے کو معاف کرایا۔ یہ قصہ تو رفع دفع ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی کو معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہوا ہے، چونکہ لشکر بڑا ہوتا ہے اور پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوتا ہے، تو بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، ایک حصہ میں واقعہ پیش آیا اور یہ اس وقت حاضر نہیں تھا بلکہ دوسرے حصہ میں تھا۔ اس کو بعد میں معلوم ہوا تو اس کو موقعہ مل گیا اور اس نے اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ دیکھو! اچھا اچھا کھلا کر تم لوگوں نے ان کو بڑا کیا ہے، اب یہ تمہارے ہی خلاف کھڑے ہو گئے ہیں، اب تو ایسا ہی ہوتا رہے گا، ان سے کوئی اچھی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ پھر اس نے کہا کہ اگر ان کو کھلانا پلانا چھوڑ دو، تو یہ آپ ہی آپ یہاں سے بھاگ جائیں گے ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی

مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا﴾ سورۂ منافقون میں یہ آیت ہے۔ان پر خرچ نہ کرو، کھلاتے پلاتے ہو اس لئے پڑے ہوئے ہیں، کھلانا پلانا چھوڑ دو گے تو آپ ہی آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔اور پھر یہ بھی کہا کہ جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو جو عزت والا ہے وہ ذلیلوں کو نکال دے گا۔عزت والا بول کر اس نے اپنی ذات مراد لی، اور ذلیل بول کر نعوذ باللہ حضور اکرم ﷺ کی طرف اشارہ تھا۔

جس وقت وہ یہ باتیں کر رہا تھا تو وہ یوں سمجھتا تھا کہ سننے والے سب میرے ہمنوا ہیں، لیکن ان میں ایک صغیر السن (کم عمر) صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے جب یہ سنا تو اسی وقت کہا کہ میں تیری یہ بات حضور اکرم ﷺ تک پہنچاؤں گا۔اب یہ بھی سٹپٹایا کہ یہ کیا ہو گیا، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ چونکہ چھوٹے تھے، اس لئے براہِ راست حضور تک پہنچنے کے بجائے انہوں نے جا کر اپنے رشتہ کے جو چچا تھے ان سے کہا۔انہوں نے حضور تک یہ بات پہنچائی۔حضور اکرم ﷺ نے ان کو بلایا اور عبداللہ بن ابی کو بھی بلایا اور پوچھا کہ تم نے ایسی بات کہی ہے؟ اس نے قسم کھا کر انکار کر دیا کہ میں نے نہیں کہی۔اب لوگ حضرت زید کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں کہ بچہ ہو کر بڑے آدمی کے خلاف ایسی بات کر رہا ہے۔حضرت زید کہتے ہیں کہ میرے لئے تو منہ چھپانا مشکل ہو گیا، حالانکہ اس نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ بڑے آدمی کے مقابلہ میں کوئی چھوٹا ایسی بات کہے تو لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔اسی طرح حضرت زید کے ساتھ بھی معاملہ ہوا کہ سب ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں اور یہ منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں سوچا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری بات کی ضرور تائید اور تصدیق کی جائے گی۔اس کے بعد ہی سورۂ منافقون

نازل ہوئی اور اس میں سارا قصہ بیان ہوا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سفر کے دوران میرے قریب آئے اور میرا کان پکڑ کر ملا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کان کی تصدیق فرمائی ہے۔ جب یہ ساری آیتیں نازل ہوئیں تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اجازت دیجیے اس کی گردن اُڑا دوں۔ حضور نے اجازت نہیں دی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو اس کے بیٹے تھے وہ مخلص مؤمن تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ میرے باپ کا ایسا معاملہ ہوا تو وہ خود حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے باپ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر ایسا ہے تو آپ مجھے کہیے، مَیں اس کا سر لا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، کسی اور کو نہ کہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو کہیں اور وہ میرے باپ کو قتل کر دے اور بعد میں پھر بیٹے والی غیرت پیش آ جائے اور میں اس کے ساتھ ویسا معاملہ کر لوں۔ اس لئے اگر آپ کا ارادہ اس کے قتل کا ہے تو مجھے ہی کہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! ہم تو تمہارے باپ کے ساتھ اچھا ہی سلوک کرنا چاہتے ہیں، ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ (مسند الحمیدی۔۱۲۴۰)

خیر! اس کے بعد جب مدینہ منورہ قریب آیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کی سواری کے اونٹ کو روک لیا، اور اس کی نکیل پکڑ کر اونٹ کو بٹھا دیا اور اس پر پیر رکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جب تک کہ تو اس بات کا اقرار نہیں کرے گا کہ مَیں ذلیل ہوں اور نبی کریم ﷺ عزت والے ہیں اور پھر جب تک حضور ﷺ اجازت نہیں دیں گے؛ مَیں تجھے مدینہ میں داخل ہونے نہیں دوں گا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ جمع ہو گئے اور عبداللہ بن ابی اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے کہ مَیں تو عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، بچوں سے بھی زیادہ ذلیل

ہوں۔لیکن حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ جب تک حضور اجازت نہیں دیں گے؛ مَیں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ تشریف لائے اور ان سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو اور جانے دو، تب انہوں نے جانے دیا۔

بہرحال! یہ مخلص مؤمن تھے انہوں نے آکر درخواست کی تو ان کے اس اخلاص کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے درخواست منظور فرمائی کہ ٹھیک ہے، مَیں جنازہ کی نماز بھی پڑھاؤں گا اور کرتہ بھی عنایت فرمایا (بخاری شریف، حدیث نمبر۴۹۰۷۔کتاب التفسیر، سورۂ منافقون، حدیث نمبر۴۹۰۵)

بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کا سر اپنے گود میں لے کر اپنا لعابِ دہن بھی اس کے منہ میں ڈالا اور پھر اس کی نماز جنازہ پڑھائی (بخاری شریف۔۱۲۷۰) جب نمازِ جنازہ پڑھانے کیلئے آپ آگے بڑھے اور کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا کرتہ پکڑلیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! اس کی نمازِ جنازہ آپ پڑھا رہے ہیں؟ اس نے فلاں موقعہ پر ایسا کیا تھا، فلاں وقت یوں تکلیف پہنچائی تھی وغیرہ وغیرہ۔اس کے سارے کارنامے گنوار ہے ہیں اور پھر باری تعالیٰ نے تو قرآنِ پاک میں یہ فرمایا ہے ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان منافقین کو معاف نہیں کریں گے، پھر بھی آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستّر سے زیادہ مرتبہ دعاءِ مغفرت کرنے سے اس کی معافی ہو سکتی ہے تو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں (بخاری شریف۔۱۳۶۶) یہ حضور ﷺ کے اخلاق تھے، اسی کا نتیجہ ہوا کہ سینکڑوں کی تعداد میں ایسے منافقین تھے جو مخلص بن گئے، یعنی انہوں نے دل سے ایمان و اسلام کو قبول کرلیا۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ منافقین کی جماعت کے پیدا ہونے کا پس منظر کیا تھا۔انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام قوت پکڑ رہا ہے اور مسلمانوں کی طاقت بڑھتی جارہی ہے تو وہ مشرکین جو کھل کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے انہوں نے اپنا طریقۂ عمل بدلتے ہوئے یہ روش اپنائی کہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بباطن وہ کافر ہی رہے، انھیں کو منافق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کو کہتے ہیں۔

شرّاحِ حدیث نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ لفظ نفاق ''نافقہ'' سے بنا ہے۔ یربوع نامی ایک جانور آتا ہے، جس کو پہاڑی چوہا (جنگلی) کہتے ہیں۔اس کی عادت یہ ہوتی ہے کہ زمین کے اندر بل بناتا ہے اور اس میں اپنے آنے جانے کے لئے ایک سوراخ بناتا ہے، لیکن اس بل میں دوسری طرف ایک سوراخ اور بھی بناتا ہے جس کو کھلا نہیں رکھتا بلکہ نرم مٹی سے بند رکھتا ہے تاکہ دیکھنے میں معلوم ہو کہ وہاں کوئی سوراخ نہیں ہے، بالکل ہموار زمین معلوم ہوتی ہے۔جب شکاری اس کو پکڑنے کے لئے اس کے عام آنے جانے کے راستے میں گھات لگاتا ہے اور اس کو دیکھتا ہے کہ اس راستے سے اندر داخل ہوا ہے، جب باہر نکلے گا تو اس کو پکڑوں گا۔لیکن وہ اس دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتا ہے۔تو یہ دوسرا سوراخ جس کو اس نے چھپا کر بنا رکھا تھا اسی کو عربی زبان میں ''نافقہ'' کہتے ہیں اور جس سوراخ سے عام طور پر آتا جاتا ہے اس کو ''قاصعہ'' کہتے ہیں۔گویا ایک راستے سے داخل ہوا اور دوسرے راستے سے نکل گیا۔اسی طرح منافق بھی ایک راستے سے ایمان میں داخل ہو کر دوسرے راستہ سے نکل گیا، اسی لئے اس کو منافق کہتے ہیں۔حقیقی منافق تو یہی ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان کے اوپر ایمان ہو۔حقیقی نفاق نفاقِ اعتقادی ہے۔

﴿نفاقِ عمل﴾

لیکن علماء نے نفاق کی ایک دوسری قسم بیان کی ہے اور وہ نفاقِ عمل ہے۔آدمی دل سے تو ایمان والا ہی ہے، ایمان کے معاملہ میں کوئی دوسری بات نہیں ہے، اس نے سچّے دل سے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کیا ہے، اور اپنے آپ کو جو مسلمان ظاہر کیا ہے؛ وہ صحیح معنٰی میں ظاہر کیا ہے؛ لیکن ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے معاملہ میں وہ ڈھیلا پڑتا ہے۔ ایک آدمی جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں؛ ان کو وہ قبول کرتا ہے، اور گویا وعدہ کرتا ہے کہ مَیں اس پر عمل کروں گا، اپنی زندگی اسی کے مطابق درست کروں گا۔تو یہ دل سے تو ایسا ہی ہے لیکن عملی طور پر اپنی کمزوری کی وجہ سے پورے طور پر اپنے آپ کو ان اعمال اور اخلاق میں ڈھال نہیں پاتا۔نفس کے دھوکہ میں آکر جھوٹ بول دیتا ہے۔جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے ان کو نہیں کرتا، جن کاموں سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے اپنے آپ کو نہیں بچاتا۔تو گویا اس نے ایمان کے ذریعہ جن چیزوں کا اقرار کیا تھا کہ مَیں اپنے اعمال واخلاق کو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق درست کروں گا، لیکن نہیں کرسکا، تو گویا اس نے اپنے ظاہر کو دل کے اقرار کے خلاف بنایا؛ اسی کو نفاقِ عمل کہتے ہیں، اگرچہ یہ شرک کے برابر نہیں ہے۔

جو حقیقی اور اصلی منافق ہیں ان کا حکم تو یہ ہے ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ وہ تو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے یعنی مشرکین سے بھی زیادہ خطرناک عذاب میں ہوں گے۔لیکن نفاقِ عمل کا حکم یہ ہے کہ وہ آدمی اپنی جگہ پر مؤمن ہے

لیکن عملی طور پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اپنے اعمال واخلاق کو اس طرح کے نہیں بنا پایا جیسے ایک مؤمن کے اعمال واخلاق ہونے چاہئیں، اس لئے وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا، یا اگر توبہ کرلی اور اللہ تعالیٰ نے قبول کرلی تو پھر پہلے ہی جائے گا۔

﴿یہ منافقین کے اعمال ہیں﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جس میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے ﴿آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثَةٌ﴾ منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ گویا جس آدمی کے اندر یہ تین باتیں- جو آگے کہی جارہی ہیں- موجود ہوں تو وہ اپنے آپ کو اگر یہ سمجھتا ہے کہ میں مؤمن ہوں؛ لیکن ایسا نہیں ہے، یہ ایمان کی خصلتیں نہیں ہیں بلکہ منافق کی عادتیں ہیں، یعنی یہ وہ باتیں ہیں جو اُس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے اندر پائی جاتی تھیں، اہلِ ایمان میں یہ باتیں نہیں ہوتی تھیں گویا حضور اکرم ﷺ اس ارشاد کے ذریعہ سے ایمان والوں کو اس بات کی تلقین کرنا چاہتے ہیں اور تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچاؤ، یہ اہلِ ایمان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ یہ تو منافقین کے اعمال ہیں اور جب تم اپنے آپ کو اہلِ ایمان بتلاتے ہو اور حقیقت میں مؤمن ہو؛ تو پھر اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچانا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے آگے فرمایا ﴿وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُؤْمِنٌ﴾ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور یوں سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا معاملہ صرف عبادات تک محدود نہیں ہے، ہم نے اپنے ناقص علم کی وجہ سے اسلام کو عبادات کے اندر محدود کررکھا ہے۔ ایک آدمی نماز وروزہ کا اہتمام کرتا ہے، تلاوت کا اہتمام کرتا ہے، ذکرو اذکار کی پابندی کرتا ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ مَیں پکا مسلمان ومؤمن ہوں، چاہے وہ بازار

میں جا کر کسی کے ساتھ سودا کرنے میں جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہو، یا کسی کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہو، اس کو پورا کرنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو، یا کسی نے اس کے پاس کوئی امانت رکھ دی تو وہ اس کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھتا بلکہ اس میں خیانت سے کام لیتا ہے۔ یہ سب ہو رہا ہے لیکن چونکہ وہ نماز اور روزہ کا پابند ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ مَیں سو فیصد دین پر عمل کر رہا ہوں، حالانکہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور یوں سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان و مؤمن ہوں، پھر بھی وہ کامل مسلمان نہیں ہے؛ اگر اس میں یہ تین باتیں موجود ہیں۔

وہ تین باتیں کونسی ہیں؟ ﴿اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے ﴿وَاِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ﴾ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے ﴿وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ﴾ اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت سے کام لے۔ حضور ﷺ بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ تین کام مؤمن کے نہیں ہیں بلکہ منافقین کے ہیں۔ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بچانے کا اہتمام کرے۔

﴿بہترین مثال سے وضاحت﴾

ایک آدمی کو کھانسی بھی ہو رہی ہے، ناک بھی بہہ رہی ہے، آنکھوں میں سے پانی بھی جاری ہے اور پھر وہ یوں کہے کہ مَیں تندرست ہوں، مجھے کوئی بیماری نہیں ہے؛ تو لوگ کہیں گے کہ بھائی! تیرے اندر نشانیاں اور علامتیں تو بیماروں والی پائی جا رہی ہیں اور پھر تو اپنے آپ کو تندرست ظاہر کرتا ہے؛ یہ بات غلط ہے۔ اسی طریقہ سے جو اوصاف اور برائیاں منافقین کی ہیں یا کفر والوں کی ہیں وہ اعمال ہم کر رہے ہیں اور پھر یوں کہیں کہ ہم مسلمان

ہیں اور ایمان والے ہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک ایمان والے کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ یہ کام کرتے ہوئے اپنے آپ کو مؤمن سمجھنا مناسب نہیں ہے۔اس لئے ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ ان سے بچنے کا اہتمام کرے۔

جھوٹ کی شناعت......ابوسفیان کا قصہ

جھوٹ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بری چیز ہے، ہر مذہب وملت میں اور ہر زمانہ میں جھوٹ کو بُرا سمجھا گیا اور اس کو ایسی خصلت اور وصف قرار دیا گیا جس سے بچنا ہر شخص اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے ،اور جو آدمی اس میں مبتلا ہو اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ زمانۂ جاہلیت میں یعنی حضور اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے عرب کے اندر جو دور چل رہا تھا کہ جس میں وہ لوگ ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھے،لیکن وہ بھی اپنی طرف جھوٹ کی نسبت کو بہت برا سمجھتے تھے،کوئی ان کو جھوٹا کہے؛ یہ ان کو گوارا نہیں تھا۔

آپ ﷺ نے ۸ ھ میں دنیا کے مختلف بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت کے خطوط بھیجے تھے،تو اس میں قیصرِ روم کے نام بھی ایک خط بھیجا تھا۔حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اس خط کو لے کر گئے تھے۔بُصریٰ جو شام کے علاقے میں واقع ہے،وہ ریاست تھی،اس کا حاکم قیصر کے ماتحت تھا،حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے وہ نامہ مبارک اس کے حوالے کیا تاکہ وہ قیصر تک پہنچائے،اس نے حضرت دحیہ کو قیصر تک پہنچایا۔جس زمانے میں حضور اکرم ﷺ کا یہ نامۂ مبارک قیصر کے نام بھیجا گیا تھا؛ قیصر اپنے دارالسطنت قسطنطنیہ سے چل کر منت کو پورا کرنے کے واسطے بیت المقدس آیا ہوا تھا، یہ بھی خط لے کر وہیں پہنچے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ خط ایک ایسی شخصیت کی طرف سے بھیجا گیا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا بھیجا ہوا نبی بتلاتی

ہے، تو اس نے اپنا دربار سجایا اور لوگوں سے کہا کہ کیا ایسے کچھ لوگ یہاں مل جائیں گے جو اس آدمی کے حالات سے واقف ہوں جنہوں نے یہ خط بھیجا ہے؟ اتفاق کی بات کہ اسی زمانے میں حضرت ابوسفیان جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ ایک تجارتی قافلہ لے کر شام پہنچے ہوئے تھے۔ درباریوں نے جستجو کی کہ عرب کا کوئی شخص یہاں ہے، تو معلوم ہوا کہ عرب کا ایک تجارتی قافلہ آیا ہوا ہے، چنانچہ انہیں کو پکڑ کر لے گئے۔ قیصر نے ان سے پوچھا کہ فلاں شخص سے آپ لوگ واقف ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا کہ مَیں ان کے متعلق تم سے کچھ سوالات کروں گا، تم اس کا صحیح جواب دینا۔ اور پھر قیصر نے یہ انتظام کیا کہ ابوسفیان کو آگے بٹھایا اور ان کے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور بیچ میں ترجمان کو بٹھایا اور ان کے ساتھیوں سے یوں کہا کہ اگر یہ غلط بات کہیں تو مجھے بتلا دینا، اور پھر سوالات کئے۔ بات لمبی ہے جس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کا خاندان کیسا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ خاندان تو بڑا اعلیٰ و اشرف ہے، اونچے حسب ونسب والے ہیں۔ پھر اس نے اور کچھ چیزیں پوچھیں، ان سب کے جوابات انہوں نے صحیح صحیح دیئے۔ چونکہ اس زمانے میں ابوسفیان حضور ﷺ کے دشمن تھے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میرا دل چاہا کہ حضور کے خلاف جواب دوں لیکن پھر میرے دل میں آیا کہ میرے ساتھی کہیں گے کہ انہوں نے جھوٹ بولا، اس نسبت کو مَیں نے اپنے لئے گوارا نہیں کیا۔

اس قصہ کو سنا کر میں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ غور کیجیے کہ زمانۂ جاہلیت میں کفر وشرک کی حالت میں بھی اور ساری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی اپنی طرف جھوٹ کی نسبت کو وہ لوگ گوارا نہیں کرتے تھے۔

(فتح الباری، باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر، کتاب المغازی۔ ص ۱۰۴/۸۔ کتاب التفسیر ۶۵۳/۲۔ بخاری حدیث نمبر ۷)

جھوٹ صرف زبان سے ہی نہیں ہوتا

جھوٹ ایک بہت بری خصلت ہے، اسلام میں بھی اس سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے، نبوت کے بعد سب سے اونچا مقام صدیقیت کا ہے۔صدیق یعنی سب سے زیادہ سچا۔ گویا اس کے اندر بھی اسی وصف کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔اور ہم یوں سمجھتے ہیں کہ صدق کا تعلق صرف زبان سے ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ صدق وصفا کا تعلق اعمال، اقوال، اخلاق ساری چیزوں سے ہے، آدمی صرف بات کا سچا ہو یہی مطلوب نہیں بلکہ عمل کا بھی سچا ہو، اس کے لئے بھی صدق کا استعمال ہوتا ہے، اور عمل میں اگر وہ خلاف واقعہ ظاہر کر رہا ہے تو اس کو بھی جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے ﴿اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَالَمْ يُعْطَ كَلَابِثِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ (ابوداؤد ۴۹۹۷)﴾ کسی کو اللہ کی طرف سے کوئی چیز ملی نہ ہو، اور وہ اپنے عمل سے ظاہر کرے کہ یہ چیز مجھے ملی ہے؛ تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہن رکھے ہوں یعنی وہ سر سے پاؤں تک جھوٹ کے اندر لدا ہوا ہے۔ جیسے ایک آدمی کے پاس دولت وثروت نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو لباس سے ایسا ظاہر کرتا ہے کہ میں بہت مالدار ہوں؛ تو یہ جھوٹا ہے۔

ایک عورت نے آکر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ میرے شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے، تو مَیں کبھی کوئی چیز جو میرے شوہر نے مجھے نہیں دی ہے بلکہ کہیں اور سے میرے پاس آئی ہو، اس کے متعلق اپنی سوکن کو یوں کہوں کہ یہ چیز ہمارے شوہر نے مجھے دی ہے، تاکہ اس کو جلاؤں؛ تو ایسا کر سکتی ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ (مسند احمد۔۲۵۳۴۰)

یہاں پر علماء نے لکھا ہے کہ یہ اسی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آدمی کے حقیقت

میں جو حالات ہیں اس کے خلاف ظاہر کرے؛ یہ بھی جھوٹ ہے۔ جیسے ایک شخص مالدار نہیں ہے اور اپنے آپ کو مالدار ظاہر کر رہا ہے، عملی طور پر ایسا لباس اور ایسی سجاوٹ و بناوٹ کر کے ایسا انداز اختیار کرے کہ لوگ یوں سمجھیں کہ یہ بڑا کروڑ پتی ہے؛ وہ بھی اسی میں داخل ہے۔

اسی طرح ایک آدمی عالم نہیں ہے اور اپنے آپ کو عالم ظاہر کر رہا ہے؛ وہ بھی اس میں داخل ہے، یعنی عملی طور پر یہ جھوٹ کے اندر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صدق کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے بلکہ اعمال و اخلاق وغیرہ سے بھی ہے۔

بہرحال! مَیں تو یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جھوٹ ایک ایسی خصلت ہے جس کو زمانۂ جاہلیت میں بھی سب سے برا سمجھا جاتا تھا حالانکہ اس زمانہ میں بہت ساری برائیاں پائی جاتی تھیں۔ اب ہمارے زمانہ میں جھوٹ کی بہت ساری شکلیں ایسی رائج ہوگئیں ہیں کہ سمجھدار دین دار اور پرہیزگار لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں اور اس کے باوجود یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ مَیں جھوٹ کے اندر مبتلا ہوں، آئندہ مجلس میں ان شاء اللہ اس سلسلہ میں عرض کروں گا۔

اَلْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَةِ

ادائے امانت کی تاکید

﴿مجلس ۳﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئاٰتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلاثَۃٌ؛ اِذَاحَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَاوَعَدَ أَخْلَفَ وَاِذَااؤْتُمِنَ خَانَ. وفی روایۃ :وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُؤْمِنٌ.

گذشتہ مجلس میں بھی یہ روایت آ چکی تھی، نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ منافق کی علامت اورنشانی تین باتیں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ زیادتی بھی موجود ہے کہ چاہے وہ نماز پڑھتا ہواور روزے رکھتا ہواور اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں؛ لیکن وہ منافق ہے۔گذشتہ مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ نفاق کیا چیز ہے،اور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جو مختلف گروہ تھے، اہل ایمان، اہلِ کفر، یہود اور منافقین؛ ان کی تفصیل بھی کر چکا ہوں۔

یہ جو تین علامتیں بتلائی گئی ہیں ان میں سے ایک ہے ﴿اِذَاحَدَّثَ کَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔جھوٹ کے سلسلے میں بتلایا تھا کہ جھوٹ ایک ایسی قبیح اور شنیع حرکت ہے کہ تمام مذاہب وملل میں اس کو بُرا سمجھا جاتا رہا ہے۔دنیا میں جتنے بھی مذاہب اور ملّتیں گذری ہیں یا اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے کسی بھی مذہب میں جھوٹ کو اچھی صفت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو ایک بُرا وصف قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ

بتلا چکا ہوں کہ زمانۂ جاہلیت میں نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جب لوگ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور ہر برائی ان لوگوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی، لیکن وہ بھی جھوٹ کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ابوسفیان کا قصہ بھی تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔

آپ ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولا

نبی کریم ﷺ نے جھوٹ سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ مذاق میں بھی جھوٹ کے ارتکاب کی اجازت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کبھی کبھار خوش طبعی اور مزاح فرمالیا کرتے تھے۔ لیکن آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ مزاح میں بھی کبھی اپنی زبانِ مبارک پر جھوٹی بات نہیں لاتے تھے، اور نبی کریم ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ سے منع فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں بھیجے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی۔ اس بوڑھیا نے جب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بات سُنی تو مایوس ہو کر روتے ہوئے واپس جانے لگی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو واپس بلاؤ اور فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جنت کے اندر بوڑھیوں کو بھی جب بھیجے گا تو جوان بنا کر بھیجے گا، قرآن پاک میں موجود ہے ﴿اِنَّـآ اَنْشَـاْنٰـاهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰاهُنَّ اَبْكَاراً﴾ ہم عورتوں کو ایک نیا وجود عطا کریں گے اور ان کو نوجوان اور کنواری لڑکیاں بنا کر جنت میں بھیجیں گے۔ گویا کوئی بھی بوڑھی عورت بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، بلکہ جوان بن کر جائے گی۔ تو نبی کریم ﷺ نے خوش طبعی بھی فرمائی لیکن اس میں بھی کوئی غلط بات آپ نے نہیں کہی۔ جب یہ سُنا تو وہ بڑھیا خوش ہوگئی۔ (حدیث نمبر ۲۴۱۔ باب ماجاء فی مزاح رسول اللہ ﷺ شمائلِ ترمذی۔ ص ۱۱۳)

اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست

کی کہ اے اللہ کے رسول! سواری کے لئے اونٹ دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم آپ کو اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس پر اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اونٹنی کا بچہ میرے کیا کام آئے گا؟ اس پر مَیں سفر کیسے کروں گا؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ﴿هَلْ تَلِدُ الْإِبِلُ إِلَّا النُّوقُ﴾ اونٹ کو بھی تو اونٹنی ہی جنتی ہے یعنی جس اونٹ کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ بھی آخر اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔ (باب ماجاء فی مزاح رسول اللہ ﷺ۔ شمائلِ ترمذی۔ ص ۱۱۳)

بہرحال! نبی کریم ﷺ بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے، لیکن اس میں بھی کبھی اپنی زبانِ مبارک سے کوئی ایسی بات جو خلافِ واقعہ ہو، نہیں نکالتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی عورت نے اپنے بچے کو قریب بلانے کے لئے کہا کہ ادھر آؤ، مَیں تمہیں کچھ دیتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ جس وقت تم نے اس بچہ کو بلانے کے لئے یہ جملہ استعمال کیا کہ مَیں تمہیں کچھ دوں گی؛ تو کیا اس وقت کچھ دینے کا ارادہ تھا، یا ایسے ہی بہلانے کے لئے اور قریب بلانے کے واسطے یہ جملہ کہہ دیا تھا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے پاس کھجور کا ایک دانہ تھا، مَیں نے دل میں یہ نیت کی تھی کہ جب یہ بچہ قریب آئے گا تو یہ کھجور دوں گی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے دل میں کسی چیز کے دینے کا ارادہ نہ ہوتا؛ تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

(حدیث نمبر ۴۹۹۱۔ ابوداؤد۔ التشدید فی الکذب)

﴿ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکٹ جھوٹی گواہی ہے ﴾

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جھوٹ سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور جھوٹ ہے بھی بہت بری صفت۔ ہم لوگ بھی اس کو برا سمجھتے ہیں اور اس سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ہمارے زمانہ میں جھوٹ کی بعض صورتیں و شکلیں ایسی رائج ہوگئی ہیں کہ

جس وقت آدمی اس کا ارتکاب کررہا ہوتا ہے؛ اس وقت اس کو خیال بھی نہیں آتا کہ مَیں جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔

حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے، دین دار تھے، نماز وروزہ کے پابند، ذکر وتلاوت کا اہتمام کرنے والے، بزرگوں کے ساتھ تعلق اور نسبت رکھنے والے تھے، وہ سعودیہ میں رہتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کب واپس جارہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ مَیں نے میڈیکل سرٹیفکٹ بھیج دیا ہے، مزید آٹھ روز رہوں گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکٹ بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ کہا کہ ڈاکٹر کے پاس یہ لکھوا کر بھیجا ہے کہ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ سفر کرسکے (سب جانتے ہیں کہ میڈیکل سرٹیفکٹ کی حقیقت کیا ہے) اس طرح مزید آٹھ روز یہاں ٹھہرنے مل جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ دین دار آدمی ہیں، صوم وصلوۃ کے پابند ہیں، بزرگوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہیں اور اس طرح جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس چھٹیاں نہیں تھیں تو آپ کو ملازمت پر واپس چلے جانا چاہیے تھا، اور اگر مزید رکنا ہی تھا تو تنخواہ کٹوا کر آپ رُک سکتے تھے۔ آپ نے یہ کیا طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح میڈیکل سرٹیفکٹ بنوا کر بھیج دیا اور اپنی چھٹیوں کے اندر وسعت کروالی یہ تو صریح جھوٹ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ مولانا! آج تک کبھی اس کی طرف توجہ نہیں گئی کہ مَیں اس طرح کرکے جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔ تو دیکھئے! آج کل اس طرح سے میڈیکل سرٹیفکٹ بنوا کر استعمال کئے جاتے ہیں؛ واقعہ یہ ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔

﴿جھوٹی گواہی کی شناعت﴾

اور سرٹیفکٹ تو ایک طرح کی گواہی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جہاں جھوٹ سے منع فرمایا ہے وہاں جھوٹی گواہی کو تو بہت ہی بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا﴿أَلاَ أُخبِرُکُمْ بِأَکْبَرِ الْکَبَائِرِ﴾ مَیں تم کو بڑے گناہوں سے آگاہ نہ کروں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ضرور کیجیے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا﴿أَلاِشْرَاکُ بِاللهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا﴿عُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ﴾ ماں باپ کی نافرمانی کرنا﴿وَشَھَادَةُ الزُّوْرِ﴾ اور جھوٹی گواہی دینا۔ جو صحابی اس روایت کو نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے پہلی دو باتیں ارشاد فرمائیں اس وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ سیدھے بیٹھ گئے اور بار بار فرمانے لگے ﴿أَلاَ وَشَھَادَةُ الزُّوْرِ﴾ سنو! یہ جھوٹی گواہی بھی بڑا گناہ ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم تمنا کرنے لگے ﴿لَیْتَهُ سَکَتَ﴾ کاش! آپ خاموش ہو جائیں (بخاری شریف۔حدیث نمبر۵۹۷۶۔عقوق الوالدین من الکبائر) مطلب یہ ہے کہ اس جملے کو ہمارے سامنے بار بار دہرانے سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹی گواہی کی قباحت واضح ہو جائے، وہ تو الحمدللہ واضح ہو چکی ہے، اب آپ بار بار یہ جملہ دہرانے کی زحمت کیوں فرما رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ جھوٹی گواہی کی قباحت کو بتلانے کے لئے ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور اس چیز کو بار بار بتلایا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی خطرناک چیز ہے۔

اب جھوٹا سرٹیفکٹ جو جاری کیا جاتا ہے؛ یہ تو صریح جھوٹ ہے۔ اس کے اندر جھوٹ کا ایک گناہ تو ہے ہی؛ لیکن ساتھ ہی اس میں دوسرا گناہ بھی ہے کہ گواہی دے کر دوسرے کو دھوکہ میں ڈالا جا رہا ہے۔

کیریکٹر سرٹیفکٹ کب دیا جاسکتا ہے

اسی طرح کبھی کیریکٹر سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔حالانکہ کیریکٹر سرٹیفکٹ دینے والے کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔آج کل تو میڈیکل سرٹیفکٹ دینا ڈاکٹروں کا ایک پیشہ بن گیا ہے۔ایک ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے کہنے لگے کہ ملازمت کرنے والوں کو دس پندرہ روپیہ کے اندر اس طرح سے لکھ کر دینا پڑتا ہے۔تو کیا یہ دس پندرہ روپے حلال ہیں؟مَیں نے کہا کہ دس پندرہ روپیہ کے اندر آپ اپنا دین بیچ رہے ہیں۔یہ تو بہت خطرناک گناہ ہے،اس سے تو بچنے کی سخت ضرورت ہے۔

بہرحال!اس طرح کی چیزیں اب اتنی عام ہوتی جارہی ہیں کہ آدمی کا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا کہ مَیں ایسی حرکت کر کے جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔بہت سوں کے متعلق کریکٹر سرٹیفکٹ بھی جاری کیا جاتا ہے کہ مَیں اس سے واقف ہوں،حالانکہ اس کے حالات سے پورے طور پر واقفیت نہیں ہوتی۔کریکٹر سرٹیفکٹ جاری کرنے کے لئے جس قسم کی واقفیت ضروری ہے جب تک کہ وہ پورے طور پر نہ ہو؛وہاں تک کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کا اخلاقی سرٹیفکٹ دے۔

اخلاق ومزاج ناپنے کا تھرمامیٹر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کسی سے کسی کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا آدمی ہے؟ اس نے کہا کہ بڑا اچھا آدمی ہے۔آپ نے پوچھا کہ کیا کبھی کوئی لین دین کا معاملہ ان کے ساتھ کیا ہے؟اس نے کہا کہ لین دین تو کبھی نہیں کیا۔پھر آپ نے پوچھا کہ کبھی اس کے ساتھ سفر کرنے کی نوبت آئی ہے؟کہا کہ یہ بھی نہیں آئی۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کسی

کے اخلاق و عادات اور اس کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے دو ہی شکلیں ہیں، یا تو تم اس کے ساتھ کوئی لین دین کرو جس سے پتہ چلے کہ اس کا مزاج کیسا ہے اور شریعت پر برابر عامل ہے یا نہیں۔ یا اس کے ساتھ سفر کی نوبت آئے۔ جب تم نے ان دونوں میں سے کوئی بھی تجربہ اس کے ساتھ نہیں کیا تو تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم یہ کہو کہ بڑا اچھا آدمی ہے۔اور آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ سننے کے قابل ہے ﴿لَعَلَّکَ رَأَیْتَہُ یَرْکَعُ وَیَسْجُدُ﴾ شاید تم نے اس کو رکوع، سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا؟ مطلب یہ ہے کہ کسی کے اخلاق سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے صرف اس کا نمازی ہونا کافی نہیں ہے۔ بہر حال! یہ بہت اہم چیز ہے۔ ہمارے سماج میں ایسی چیزوں کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔

﴿سفارش کب کی جائے؟﴾

سفارش کے معاملہ میں بھی ایسا ہوتا ہے۔حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی ہی فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جدہ میں تھا، ایک دین دار شخص نے میرے پاس ایک آدمی کو سفارشی خط لے کر بھیجا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس خط لے کر آرہے ہیں، اصل میں ہندوستان کے باشندے ہیں، آپ ان کے لئے پاکستانی سفارت خانے کے اندر سفارشی خط لکھ دیجیے کہ ان کے لئے پاکستانی پاسپورٹ بن جائے۔ اب ہوا یہ تھا کہ وہ صاحب پاکستان جانا چاہتے تھے تو انہوں نے پاکستانی سفارت خانہ میں یہ درخواست دے رکھی تھی کہ میں اصل میں پاکستان کا باشندہ ہوں اور میرا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے، میرے لئے نیا پاسپورٹ جاری کر دیا جائے اور حقیقت کچھ دوسری تھی، اب ان سفارت خانے والوں نے مطالبہ کیا کہ

کوئی جان پہچان والا ایسا ہے جو تمہارے متعلق یہ شہادت اور گارنٹی دیتا ہو کہ تم اصالتہً پاکستان کے رہنے والے ہو۔اور مولانا فرماتے ہیں کہ ایک دین دار قسم کے بڑے آدمی تھے جنہوں نے اس طرح خط لکھ کر بھیجا تھا۔حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تصدیق یا سفارش نامہ لکھ کر دینا؛ ایک بڑا جھوٹ ہے ﴿اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ کسی کے متعلق اگر آپ تصدیق جاری کر رہے ہیں تو اس کے متعلق واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔

ہمارے حضرت مفتی محمود صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ مدرسہ والا کوئی آتا تھا اور تصدیق نامہ لکھوانا چاہتا تھا تو اگر حضرت وہاں تشریف لے گئے ہوتے تو پھر اس مدرسہ کو جس پوزیشن میں دیکھا ہوتا اس کی وضاحت کر دیتے تھے کہ مثلاً میرا وہاں جانا ہوا اور رجسٹر کے اندر اتنے طلباء کے نام دیکھے اور اتنے طلبہ کی زیارت ہوئی۔اپنی آنکھوں سے جو حال دیکھا ہوتا وہ لکھ دیتے تھے۔اور اگر کہیں جانا نہ ہوا ہوتا تو پھر وہ مدرسہ والے لاکھ کوشش کرتے کہ حضرت تصدیق نامہ لکھ دیں لیکن آپ معذرت فرما دیا کرتے تھے۔

﴿تصدیق نامہ لکھنے کے شرائط﴾

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو تصدیق نامہ لکھ دینا ایک طرح کی شہادت ہے، جب تک اس جگہ کو دیکھا نہ ہو؛ وہاں تک اس کی اجازت نہیں ہے میرے لئے بھی یہ بڑی مصیبت ہوگئی ہے، بہت سے چندہ والے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورت سے حاجی ابرہیم صاحب دادا نے کہا ہے کہ ڈابھیل سے مفتی احمد خانپوری اگر تصدیق لکھ دیں تو ہم آپ کی مدد کریں گے، وہ وہاں آ کر میرے سر پڑ جاتے ہیں کہ آپ لکھ دیجیے، مَیں کہتا ہوں کہ دیکھو! مَیں نے آپ کا مدرسہ دیکھا نہیں ہے، پھر کیسے لکھ دوں؟ اگر آپ کے

مدرسہ میں گیا ہوتا تو جو کیفیت دیکھی ہوتی؛ وہ ضرور لکھ دیتا، لیکن آپ کے یہاں آنا ہوا نہیں ہے تو کیا لکھوں؟ اب مدرسہ والے بڑے ناراض ہوتے ہیں کہ آپ مدرسہ کی مدد کروایئے، تو مَیں کہتا ہوں کہ بھائی! مجھ سے جتنی ہوسکتی ہے، مَیں اتنی مدد کردیتا ہوں، باقی تصدیق نامہ نہیں لکھ دوں گا، پھر کہتے ہیں کہ آپ نے مدد کی ہے تو ہم آپ کی یہ رسید دکھلائیں؟ مَیں کہتا ہوں کہ وہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! فلاں صاحب نے بھی اتنے پیسے دیئے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ میرے پیسے دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں نے یہ مدرسہ دیکھا ہے، مَیں تو آپ پر اعتماد کرتے ہوئے مدد کررہا ہوں۔ مجھے اس میں کوئی اشکال نہیں، آپ چاہیں تو بتلاتے رہیں۔ باقی میں تحریری طور پر لکھ کر نہیں دوں گا کہ یہ مدرسہ اس طرح کا ہے۔ اس لئے کہ مَیں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اگر دیکھا ہوتا تو تصدیق لکھ دیتا۔

بہرحال! ﴿اِذَاحَدَّثَ کَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ نبی کریم ﷺ اس کو منافق کی علامت اور نشانی قرار دے کر اہلِ ایمان کو اس بات کی طرف متنبہ فرمارہے ہیں کہ ایک مؤمن کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کلام و گفتگو میں جھوٹ کا استعمال کرے۔ مؤمن کے لئے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاوے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ اس کی وجہ سے فرشتے اس سے دور چلے جاتے ہیں۔ (رواہ الترمذی۔ مشکوۃ ۲/۴۱۳)

﴿وعدہ خلافی﴾

﴿وَاِذَاوَعَدَاَخْلَفَ﴾ منافق کی علامت کے طور پر دوسری چیز بتلائی ہے کہ جب وہ

وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔کسی سے اگر وعدہ کیا جائے تو شریعت اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ اس وعدہ کو پورا کیجیے اور نبھایئے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔

اگر کسی کے دل میں یہ بات ہے کہ وعدہ کہاں پورا کرنا ہے؛ تو اس کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔اس لئے اگر آپ کے دل میں اس بات کے پورا کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو وعدہ بھی نہ کیجیے، ورنہ یہ نفاق ہے۔مثلاً آپ نے کسی سے وعدہ کیا کہ آئندہ مہینہ سو روپے دوں گا تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔البتہ اگر وعدہ کرتے وقت آپ کے جو حالات تھے، اس کے پیشِ نظر آپ نے وعدہ کرلیا تھا،مثلاً آپ کے کاروبار کی آمدنی کو دیکھتے ہوئے آپ کو یقین تھا کہ مَیں آئندہ مہینہ اس قابل ہو جاؤں گا کہ اس کی سو روپے کی مدد کروں گا اور اسی بنیاد پر آپ نے وعدہ کیا تھا۔لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو آپ کی وہ پوزیشن باقی نہیں رہی، حالات میں تبدیلی آ گئی اور کچھ ایسی شکلیں اور رکاوٹیں پیدا ہوگئیں کہ جن امیدوں پر آپ نے وعدہ کیا تھا وہ باقی نہیں رہی؛ تو اس صورت میں شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ آپ اس سے معذرت طلب کر لیجیے۔اس سے کہہ دیجیے کہ جس وقت میں نے وعدہ کیا تھا اس وقت میری یہ پوزیشن تھی اور مجھے توقع تھی، میرا کاروبار اچھے انداز سے جا رہا تھا اس لئے میں یہ سمجھا تھا کہ آئندہ ماہ آپ کی مدد کرسکوں گا، لیکن حالات نے ایسا رُخ بدلا اور پلٹا آیا کہ کاروبار میں نقصان ہو گیا اور رکاوٹیں ایسی پیدا ہوگئیں کہ آپ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے سے اب مَیں معذور ہوں۔اگر واقعتہً ایسے اعذار ہوں تو پھر معذرت کی جاسکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ وعدہ خلافی سمجھی جائے گی جس پر وعید سنائی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات وعدے کو پورا کرنے کے معاملہ میں بہت تاکید کرتی ہیں

ایسے حالات میں کہ ہمارے تمہارے جیسا آدمی اس وعدے کو پورا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن نبی کریم ﷺ اس کی تاکید فرماتے ہیں۔

نہایت کڑے وقت میں بھی آپ ﷺ نے وعدہ خلافی نہیں فرمائی

غزوۂ بدر کے ذیل میں روایتوں میں ایک واقعہ لکھا ہے، جو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے (الاصابہ،۱/۳۳۱،ابن جابر۔رواہ مسلم،۱۷۸۲۔الوفاء بالعھد۔اباب الجھاد) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو صاحب سِرّ الرسول کہلاتے ہیں، وہ اوران کے والد دونوں اسلام قبول کرتے ہوئے سفر کرکے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ جارہے تھے۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ابوجہل ایک ہزار کا لشکر لے کر مکہ مکرمہ سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ باپ بیٹے (حضرت حذیفہ اوران کے والد یمان) دونوں کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی، اس نے ان سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم مدینہ منورہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے جارہے ہیں، ہم اسلام قبول کرچکے ہیں۔تو ابوجہل نے کہا کہ تم وہاں جاؤ گے تب تو ان کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑائی میں حصہ لوگے، اس لئے ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کو گرفتار کرلیا اوراپنے پاس روک لیا۔انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے خلاف لڑنے کے لئے نہیں جارہے ہیں، ہم تو حضور کی ملاقات وزیارت کے لئے جارہے ہیں۔اس نے کہا کہ اگر تم اس بات کا وعدہ کرو کہ وہاں جانے کے بعد ہمارے مقابلہ میں حصہ نہیں لوگے اور شرکت نہیں کروگے تو مَیں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ان دونوں نے وعدہ کرلیا تو ابوجہل نے ان دونوں کو چھوڑ دیا۔جب یہ دونوں مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ لشکر لے کر اس طرف آرہے ہیں۔ان حضرات نے حضور کو تمام

تفصیل بتلائی اور جب معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ مشرکین کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں تو انہوں نے درخواست پیش کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجیے، اگرچہ ہم سے اُن لوگوں نے وعدہ تو لیا ہے لیکن یہ وعدہ تو مجبوری کے حالات میں زبردستی لیا گیا ہے۔ گویا گردن پر تلوار رکھ کر لیا گیا ہے، ایسے وعدے کا کیا اعتبار کیا جائے لیکن نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ تم نے وعدہ کر لیا ہے کہ میری ملاقات وزیارت کے لئے جا رہے ہو، ہمارے ساتھ مل کر ان کے مقابلے کے لئے نہیں آؤ گے، اس لئے تم کو ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا کڑا وقت تھا، مشرکین کا لشکر ایک ہزار کی تعداد میں تھا، مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی اور وہ بھی نہتے۔ اسّی (۸۰) اونٹ اور صرف دو (۲) گھوڑے تھے، چھ (۶) یا آٹھ (۸) تلواریں تھیں اور دوسروں کے پاس تو ہتھیار بھی نہیں تھے۔ کسی کے پاس ڈنڈا، کسی کے پاس کچھ اور تھا، ایک ایک آدمی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت میں اضافہ کر سکتا تھا، ایسے حالات میں بھی حضور ﷺ نے ان دونوں کو اپنے ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے تمہارے جیسا ہوتا تو یوں سوچتا کہ یہ تو بڑی معذوری کا وقت ہے، دشمن کا مقابلہ ہے اور انہوں تو زبردستی وعدہ لیا ہے، اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا۔

بھائی! اصل میں جہاد کاہے کے لئے ہے؟ جہاد تو اعلاءِ کلمۃُ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمے کی سربلندی اور اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے۔ اگر وعدہ خلافی کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، لہٰذا شریعت کا ایک حکم توڑ کر جہاد کرنا کیا معنٰی رکھتا ہے۔

﴿مصلحت کے نام سے احکامِ شرع کی خلاف ورزی﴾

آج کل ایک عام مزاج بنتا جارہا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مصلحت کا تقاضہ ہے اس لئے یوں کرلیا جائے۔ایک مرتبہ ایک مدرسہ سے ہمارے پاس استفتاء آیا کہ ہمارے مدرسہ کے ایک بڑے معاون ہیں جو فلاں ملک میں رہتے ہیں اور وہ لاکھوں کی مقدار میں مدد کرتے ہیں، ان کا مطالبہ یہ ہے کہ مدرسہ میں جب درس ہورہا ہو، اس کی ویڈیو کیسٹ اُتار کر ہمارے پاس بھیجی جائے، جس میں مدرس صاحب اور طلبہ کو بتلایا گیا ہو؛ تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ ہم نے اس کا جواب دیا کہ آپ نے یہ مدرسہ کیوں قائم کیا ہے؟ اسی لئے قائم کیا ہے کہ دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری کیا جائے، اس کی ترویج واشاعت ہو، اللہ تعالیٰ راضی ہوں اور اللہ کے احکام پر لوگ عمل پیرا ہوں، اب اگر آپ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کو توڑ کر مدرسہ چلارہے ہو؛ تو ایسا مدرسہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب نہیں ہے۔اس پر تو پکڑ ہوگی۔اس لئے ایسی چیزوں کی اجازت نہیں ہے۔

بعض مرتبہ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت مصلحت کا تقاضہ ہے کہ ایسا کرلیا جائے، لیکن سمجھ لینا چاہیے کہ مصلحت کے نام سے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔حضرت حذیفہ اور ان کے والد کا جو واقعہ ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا اس میں ان دونوں سے جبراً وعدہ لیا گیا تھا، پھر بھی نبی کریم ﷺ اس وعدہ کو توڑنے کی اور اس کے خلاف کرنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دے رہے ہیں، حالانکہ اس وقت مسلمانوں کے جو حالات تھے وہ سب کے سامنے عیاں ہیں۔

بہرحال! آج کل لوگوں کے اندر ایک مزاج بنتا جارہا ہے کہ دینی مصلحت کے نام

سے دینی احکام کو توڑنا؛ اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔لہٰذا اس سے بھی بچنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔

ملکی قوانین کی خلاف ورزی بھی وعدہ خلافی ہے

بہر حال! وعدہ خلافی کو بھی نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور کسی حال میں بھی وعدہ کی خلاف ورزی کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔بعض چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے سماج میں رائج ہیں اور کوئی بھی اس کو وعدہ خلافی نہیں سمجھتا، مثلاً ہم اس ملک میں رہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس ملک کا شہری قرار دیتے ہیں اور اس حیثیت سے ہم نے اس ملک والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم یہاں کے قانون کا احترام کریں گے اور اس پر چلیں گے، بشرطیکہ کسی گناہ کا حکم نہ ہو۔اب اگر ہم یہاں کے کسی قانون کو توڑتے ہیں تو یہ اس ملک والوں کے ساتھ کئے گئے وعدے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ایک بات یاد رہے کہ اگر کسی ملک کا کوئی قانون ایسا ہے کہ جس میں کسی گناہ کا کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ تو کوئی ملک ہی کیا بلکہ اگر ماں باپ یا کوئی اور بڑا بھی کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو؛ تو اس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔شریعت نے ایک اصول بتلا دیا ہے ﴿لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (کنز العمال، ۶۲۲۵)﴾ لیکن ملک کا کوئی قانون ایسا ہے کہ اس پر عمل کرنے میں شریعت کے خلاف نہیں ہوتا ہے اور وہاں پر اگر ہم قانون کی مخالفت کر رہے ہیں تو گویا ہم نے یہاں کے شہری ہونے کی حیثیت سے اس ملک والوں سے جو وعدہ کیا ہے اور اطمینان دلایا ہے کہ

یہاں کے قانون کا احترام کریں گے اور اس پر چلیں گے؛ اس کو توڑ رہے ہیں۔ یہ وعدہ خلافی کہلائے گی۔

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے تو ملک کا قانون ہونے کی حیثیت سے اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ ٹریفک کے قانون پر چلنے کی وجہ سے شرعی طور پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، ٹریفک کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے ملک میں ایک قانون بنایا ہے، اس پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی تو لازم نہیں آرہی ہے۔ جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو اس قانون پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ بائیں طرف گاڑی چلائیں، جب سگنل ریڈ (RED) ہو تو گاڑی روک دیں، اس میں بہت سارے فائدے بھی ہیں۔ اگر آپ اس قانون کی پابندی کریں گے تو بہت سی جانیں بھی محفوظ رہیں گی، اور بہت سا نقصان جو ہوسکتا ہے اس سے بھی حفاظت ہو جائے گی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صراحتاً لکھا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والی کوئی بات نہ ہو، یا حد سے زیادہ ظلم نہ ہو؛ تو پھر اس قانون پر عمل کرنا شہری ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ آج کل مسلمان اس چیز میں بھی بڑی کوتاہی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے متعلق اور اسلام کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بڑے شکوک و شبہات اور بدگمانیاں پھیلتی جارہی ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مذہب ان کو یہ تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسی طرح کسی اور ملک میں چلے جائیں تو وہاں پر بھی وعدہ لیا جاتا ہے کہ جب تک ہم آپ کے ملک میں رہیں گے، یہاں کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور قانون

کا احترام کریں گے؛ تو وہاں بھی اس کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں عملی طور پر ایک طرح کا وعدہ ہے۔ جس طرح زبانی وعدہ ہوتا ہے اسی طرح عملی وعدہ بھی ہوتا ہے، اس کا بھی پاس ولحاظ رکھنا چاہیے، ورنہ وعدہ خلافی پر جو وعیدیں آئی ہیں؛ ہم ان میں داخل ہو جائیں گے

﴿وَاِذَاائْتُمِنَ خَانَ﴾ تیسری چیز بیان فرمائی کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ امانت اور خیانت کی ساری تفصیل پہلے عرض کر چکا ہوں۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے یہ تین باتیں ایسی ارشاد فرمائیں ہیں کہ ان کو منافق کی علامت قرار دے کر ایمان والوں کو متنبہ کیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ ایک مؤمن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچائے۔ یہ باتیں مؤمن کا طریقہ اور شیوہ نہیں ہیں۔ یہ تو منافق کا شیوہ ہے۔ ان سے بچنا چاہیے۔

اَلْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَةِ

ادائے امانت کی تاکید

﴿مجلس ۴﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًاعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ أمابعد:

۲۰۰۔عن حذیفۃبن الیمان قَالَ: حَدَّثَنَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ حَدِیْثَیْنِ قَدْرَأَیْتُ أَحَدَھُمَا وَأَنَا أَنْتَظِرُ الْاٰخَرَ............الیٰ اٰخرہٖ

﴿امانت ایک فطری وصف ہے﴾

امانت کے سلسلے میں یہ باب چل رہا تھا، یہ روایت حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو دو باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں سے ایک تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور دوسرا جو ارشاد اور پیشین گوئی فرمائی ہے اس کے آنے کا انتظار ہے۔ پہلی بات امانت کے متعلق آپ نے ارشاد فرمائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر آدمی کے اندر فطری طور پر امانت کا وصف رکھا ہے، جتنے بھی اوصافِ حمیدہ یعنی خوبیاں ہیں ہر انسان کے اندر ان کا کچھ حصہ فطری طور پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر آگے چل کر وہ آدمی ودیعت کی گئی اس خوبی کو بڑھا وادے اور اس وصف کو ترقی دینے کے لئے ان طریقوں کو اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں ارشاد فرمائے ہیں؛ تو اس میں ترقی اور اضافہ ہوگا، اور اگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرے گا تو ہوسکتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس کا وہ وصف ختم ہوجائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس وصفِ امانت کے سلسلے میں

ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کے اندر طبعی طور پر یہ وصف رکھا جاتا ہے جیسے اور طبعی امور ہوتے ہیں کہ غصہ بھی طبعی امر ہے جو ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے، اسی طرح یہ امانت والا وصف بھی فطری طور پر آدمی کے دل میں ڈالا جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل کیا اور اس میں بھی امانت کے سلسلے میں کچھ باتیں ارشاد فرمائی گئیں جیسا کہ شروع میں تذکرہ آیا تھا ﴿اِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ اِلىٰ اَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت تک پہنچاؤ اور ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ﴾ میں بھی امانت کا تذکرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امانت کے سلسلے میں قرآن پاک کے اندر بھی تاکید آئی ہے۔ گویا قرآن نے بھی اس کی اہمیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور امانت کے تقاضوں کو بجالانے کی تاکید فرمائی۔ جس طرح قرانِ پاک میں امانت کے بارے میں تاکید آئی ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور طریقوں میں بھی اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے ایک حدیث بھی گذر چکی ہے کہ امانت کے تقاضوں کو چھوڑنا اور امانت میں خیانت کرنا مؤمن کا وصف نہیں ہے بلکہ یہ تو منافق کی شان ہے، مؤمن کی خوبی تو یہ ہے کہ وہ امانت کے تقاضوں کو بجالائے، گویا سنت میں بھی اس کی تاکید آئی ہے۔ تو ایک تو فطری طور پر یہ چیز لوگوں کے قلوب میں موجود تھی، پھر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تاکید فرمائی گئی، جس کی وجہ سے اس میں مزید روشنی پیدا ہوئی، اور پھر سنت کے اندر اس کی تاکید آئی تو اور اضافہ ہوا، تو گویا لوگوں میں یہ چیز عام ہوئی۔

آناً فاناً تبدیلی

﴿ثُمَّ حَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِ الْأَمَانَةِ﴾ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس

طرح آپ ﷺ نے امانت کے وصف کے لوگوں کے اندر موجود ہونے اور اس میں ترقی کرنے کے متعلق ہمیں آگاہ فرمایا، اسی طریقہ سے یہ وصفِ امانت لوگوں کے اندر سے اُٹھالیا جائے گا، اس کی پیشین گوئی بھی آپ ﷺ نے فرمائی۔ چنانچہ اس کے اُٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کو بتلایا کہ آدمی جب سوئے گا اُس وقت اس کے قلب کے اندر یہ جذبۂ امانت موجود ہوگا، لیکن جب اُٹھے گا تو اس میں تبدیلی آچکی ہوگی کہ امانت کا جذبہ جس مقدار کے طبیعت میں موجود تھا؛ وہ کم ہوگیا ہوگا۔

اب یہ کم کیوں ہوا؟ یہ اس روایت میں نہیں بتلایا ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی نعمتوں سے محروم کیا جاتا ہے، جیسے دنیوی اور ظاہری نعمتیں ہیں، اسی طریقہ سے یہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کے اندر پیدا کئے جاتے ہیں وہ روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں، جس طرح معصیت، گناہ اور نافرمانی کا اثر ظاہری نعمتوں پر پڑتا ہے، اور گناہوں کی وجہ سے ظاہری نعمتوں سے محروم کردیا جاتا ہے، اسی طرح نافرمانیوں، معصیتوں اور گناہوں کی وجہ سے باطنی اوصاف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں؛ ان سے بھی محروم کردیا جاتا ہے۔

﴿ جذبۂ امانت ختم ہونے کی حسی کیفیت ﴾

خیر! اس امانت کے اُٹھائے جانے کی شکل کیا ہوگی وہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی جب سویا تھا اس وقت اس کے دل میں یہ چیز موجود تھی لیکن جب اُٹھا تو اس کے اندر سے یہ جذبہ تھوڑا سا کم کردیا گیا، وہ نعمت جس مقدار میں دی گئی تھی اس میں کمی آگئی ﴿فَيَظَلُّ أَثَرُهَا مِثْلَ الْوَكْتِ﴾ پس اس کا اثر چھوٹے سے نشان کی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ آدمی کے جسم کی

کھال کی جو رنگت ہوتی ہے تو کبھی کبھی اس میں دوسرے رنگ کا چھوٹا سا داغ پڑ جاتا ہے؛ اسی کو عربی زبان میں ﴿وَکْت﴾ سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اس وصفِ امانت کی کمی کا اثر اس طرح نمایاں ہوگا۔

﴿ثُمَّ نَامَ النَّوْمَةَ فَقُبِضَ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهِ﴾ پھر انہیں نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وصف کے اٹھا لئے جانے کا وقتِ مقررہ آ پہنچا ہے، اور تقدیر تو وجود میں آ کر ہی رہتی ہے اس لئے بھی یہ ہوتا ہے کہ پھر جب دوبارہ سوتا ہے تو پھر امانت اس کے اندر سے نکالی جاتی ہے ﴿فَيَظَلُّ أَثَرُهَا مِثْلَ أَثَرِ الْمَجَلِ﴾ اور اس کا اثر ایسا نمایاں ہوتا ہے جیسے محنت ومشقت کا کام انجام دینے کے بعد آدمی کی کھال میں پڑ جاتا ہے۔ آدمی محنت ومشقت کا کام کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کی کھال سخت ہو جاتی ہے۔ پہلے والا اثر تو صرف رنگ پر پڑا تھا، کھال کی نرمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اور دوسرا اثر جو آیا تو اس نے کھال کی جو کیفیت تھی یعنی اس کی نرمی میں بھی اثر پیدا کر دیا یعنی وہ بجائے نرم رہنے کے سخت ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ امانت کے وصف کے اٹھائے جانے کا جو اثر دوسری مرتبہ آیا وہ پہلے والے اثر کے مقابلے میں زیادہ ہوگا۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ ہوگا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ جذبۂ امانت لوگوں میں سے بالکلیہ ختم ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وصف سے دھیرے دھیرے محروم کیا جائے گا اور یہ نعمت چھین لی جائے گی، اس کی کیفیت کیا ہوگی اس کو نبی کریم ﷺ ایک مثال سے سمجھا رہے ہیں ﴿كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهُ عَلَىٰ رِجْلِكَ﴾ کہ کھال میں اثر ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آگ کا انگارہ پاؤں پر ڈال کر لڑھکا دیں تو کھال پھول جائے گی، اور اگر انگارہ وہیں رہے تو کھال کو جلا دے گا۔ لیکن جب انگارہ لڑھک جائے گا تو کھال پھول جائے گی اور اُبھری ہوئی محسوس ہوگی،

حالانکہ اندر کچھ بھی نہیں ہوتا۔اور انگارہ کس طرح لڑھکتا ہے اس کو نبی کریم ﷺ نے حسی اور مشاہداتی طور پر سمجھانے کے لئے ایک کنکر ہاتھ میں اُٹھایا اور اپنے پاؤں پر لڑھکا کر بتلایا کہ یہ کنکر کس طرح لڑھکتا ہے، اس طرح سے انگارہ لڑھکتا ہے۔

رائی کے دانہ کے برابر بھی امانت نہ ہوگی

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب جذبۂ امانت اُٹھالیا جائے گا اور یہ اچانک نہیں ہوگا بلکہ دھیرے دھیرے ختم ہوگا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ آپس میں معاملات کریں گے، لیکن ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہوگا جو اس وصفِ امانت میں پورا اترتا ہو۔ یہاں تک کہ خال خال لوگوں کے متعلق نام لے کر یہ کہا جائے گا اور ایسی باتیں ہوں گی کہ فلاں بستی میں فلاں قبیلے میں ایک آدمی امانت دار موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض آدمیوں کے متعلق لوگ باتیں کریں گے کہ کیسا بہادر اور جری آدمی ہے، کیسا سنجیدہ ہے، کیسا دانا اور سمجھ دار ہے، سب کچھ ہے لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان ساری تعریفوں کے باوجود اس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی امانت نہیں ہوگی۔ بہت تعریفیں ہوں گی کہ بڑا سمجھ دار ہے لیکن وصفِ امانت نہیں ہے۔ حالانکہ امانت ہی پر ساری بنیاد ہوتی ہے۔

جس سے چاہو معاملہ کرلو

دیکھئے! حضور ﷺ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں، ایک تو یہ کہ امانت کیسے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر یہ چیز پیدا فرمائی، پھر قرآن وسنت کی تعلیمات سے اس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتی ہے اور اس وصف میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ بات بھی بتلا دی کہ

امانت کیسے اُٹھائی جائے گی۔ گویا ان دو باتوں کے متعلق حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں۔ ان میں سے ایک تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور دوسری کا انتظار ہے۔ کیا بات دیکھ لی وہ بتلاتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کسی سے بھی معاملہ کرنا چاہتا تو آنکھ بند کر کے کر لیتا تھا، یہ نہیں سوچتا تھا کہ مَیں جس کے ساتھ معاملہ کرنے جارہا ہوں وہ کیسا ہے؟ وہ امانت کے تقاضوں کو پورا کرے گا یا نہیں؟ ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پورا معاشرہ امانت کے وصف سے ایسا مزین تھا کہ جس سے چاہو معاملہ کرلو، ہر ایک کے اندر یہ وصف موجود تھا۔ اسی کو فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ أَتَیٰ عَلَیَّ زَمَانٌ وَمَا أُبَالِیُ أَیُّکُمْ بَایَعْتُ﴾ میرے اوپر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ مَیں کس کے ساتھ سودا کر رہا ہوں، اس لئے کہ اس زمانہ میں معاشرہ کے اندر مسلمان ہوں یا غیر مسلم ایسے لوگ تھے، اگر مسلمان ہے تو اس کی دین داری اس کو حق لوٹانے کی طرف مجبور کرتی تھی، یعنی اس میں دین داری اتنی عام تھی اور جذبۂ امانت قائم تھا اور اس کی دین داری اس کو خیانت کا ارتکاب کرنے نہیں دیتی تھی، ہر مسلمان کا حال ایسا ہی تھا۔

﴿وَاِنْ کَانَ نَصْرَانِیًّا﴾ اور اگر وہ نصرانی یا یہودی ہوتا تو ان کے ساتھ بھی آنکھ بند کر کے معاملہ کر لیتا تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ اس میں دین داری تو نہیں تھی لیکن ان کے ذمہ دار اور بڑے (چوہدری) لوگ ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے وہ حق ادا کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

اب اس زمانہ میں آپ دیکھئے کہ دھیرے دھیرے معاشرہ پر سے بڑوں کی پکڑ بھی ختم ہوگئی ہے، بڑوں کی پکڑ بھی ماتحت کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اگر غیر مسلم ہوتا تو اس میں اگرچہ دین داری تو نہیں ہوتی تھی لیکن اس کے

بڑوں کی وجہ سے وہ میرا حق دینے پر مجبور ہوتا تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جس وقت یہ حدیث بیان کررہے ہیں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک عرصہ گذر چکا تھا اس وقت فرماتے ہیں کہ آج تو حال یہ ہوگیا ہے کہ گنے چنے لوگ باقی ہیں جن کے متعلق آدمی کو اعتماد ہوتا ہے کہ یہ میرا حق برابر ادا کریں گے اور خیانت سے کام نہیں لیں گے، اس لئے چند ہی لوگ ایسے ہیں جن سے مَیں معاملہ کرتا ہوں۔

اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ انتظار کس چیز کا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ابھی بھی امانت باقی ہے، انتظار اس بات کا ہے کہ وہ بچی ہوئی امانت بھی بالکلیہ ختم ہوجائے گی۔

آپ اندازہ لگائیے جب کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ حضرات صحابہ کا دور ختم نہیں ہوا تھا اور یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اور آج ہمارا دَور جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صدیوں دور ہو چکا ہے، آج جذبۂ امانت کتنا باقی رہ گیا ہوگا؟ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جنت کا دروازہ کون کھلوائے گا؟

امانت کی اہمیت بتلانے کیلئے ایک اور روایت پیش کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ساری دنیا ختم کردی جائے گی اور قیامت قائم ہوجائے گی اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ پیدا کرکے جمع کریں گے، اُس وقت مومنین اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے، یہاں تک کہ ان کو جنت کی نعمتیں بتلانے کے واسطے جنت کو ان سے قریب کیا جائے گا اور ان کے داخلے کا وقت قریب ہوگا، لیکن جنت کے دروازے بند ہوں گے، اور دروازوں کے کھلوانے کا مسئلہ ہوگا۔ اہل ایمان جن کے حق میں جنت کا فیصلہ ہوا ہے وہ منتظر ہوں گے کہ دروازہ کھلے تو ہم جنت میں جائیں، سب اہل

ایمان حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ اے ابا حضور! آپ جنت کا دروازہ کھلوادیجیے تاکہ ہم اندر چلے جائیں۔اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ تم کو جنت سے تمہارے ابا کی غلطی نے ہی تو نکالا ہے،مَیں یہ کام نہیں کرسکوں گا۔یعنی جنت کا دروازہ کھلوانا میرا کام نہیں ہے، وہ معذرت کردیں گے۔یہ ان کی تواضع کی بات ہے بات یہ ہے کہ جنت کا دروازہ کھلوانا کسی اور کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔بہرحال! تواضع کے طور پر معذرت پیش کردیں گے اور کہیں گے کہ میرے بیٹے ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل ایمان جنت کا دروازہ کھلوانے کی درخواست لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اوران سے کہیں گے کہ حضرت! آپ دروازہ کھلوایئے۔ حضرت ابراہیم جواب میں عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں، جنت کا دروازہ کھلوانا میرا کام نہیں ہے،مَیں اللہ کا خلیل ضرور تھا لیکن دور دور سے تھا،یعنی بالکل قرب کا جو مقام ملنا چاہیے وہ بات نہیں تھی۔حضرت ابرہیم علیہ السلام کے کہنے کا حاصل یہ تھا کہ باری تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست کلام کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔اچھا ایسا کرو کہ تم حضرت موسیٰ کے پاس جاؤ جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست کلام کیا،اللہ تعالیٰ سے شرفِ مخاطبت سے مشرف ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا فرمائی ہے، گویا ان کو اتنا قرب تو حاصل ہوا، یہ ایک طرح کی فضیلت ہے۔اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ان سے بڑھ کر ہے جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔خیر! تمام لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اوران سے عرض کریں گے کہ آپ سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، آپ کو شرفِ مخاطبت سے نوازا، آپ دروازہ کھلوایئے وہ عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں، یہ کام میرا نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

پاس جاؤ، وہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ ہیں یعنی ان کا وجود ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نتیجے میں ہوا کہ بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کُـنْ'' کے نتیجے میں پیدا ہوئے اس لئے ان کو ''کلمۃُ اللہ'' کہا جاتا ہے اور ''روح اللہ'' اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو احیاءِ موتیٰ کا معجزہ عطا فرمایا تھا۔ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے تو وہ بھی جواب میں عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، چنانچہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے۔

شراح لکھتے ہیں کہ پہلے ہی سے یہ ہوسکتا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں یہ ڈالا جاتا کہ وہ اولاً ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور اپنی درخواست پیش کرتے لیکن اس صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ فوقیت اور آپ کی یہ امتیازی شان جو دوسرے انبیاء کرام کے مقابلہ میں ہے وہ ظاہر اور نمایاں نہ ہوتی۔ سب کے پاس بھیج کر بتلا دیا گیا کہ یہ کام سوائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور سے ہو سکنے والا نہیں ہے، اس لئے یہ سب کرایا گیا۔

امانت دار کے لئے پل صراط پر آسانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھیں گے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی کہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں خصوصی مقام پر جا کر اللہ تعالیٰ کی ایسی خوبیاں بیان کریں گے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے دل میں القاء کیا جائے گا جو اِس وقت مَیں نہیں جانتا، اُس وقت باری تعالیٰ بتلائیں گے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی خوبیاں بیان کروں گا اور دیر تک سجدے میں رہوں گا۔ پھر باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ کہیے؛ آپ کی بات سنی جائے گی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ امانت اور رحم یعنی رشتہ داری جو پیدائشی اور نسبی رشتہ داری ہوتی ہے وہ دونوں کھڑے رہیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خاص شکل عطا کی جائے اور پھر یہ دونوں پُل صراط کے دونوں طرف دائیں اور بائیں کھڑے رہیں گے

بس! یہاں تو یہ روایت اسی اہمیت کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ ہر ایک کو پل صراط پر سے گذرنا ہے اس کے لئے آدمی اگر مدد حاصل کرنا چاہتا ہے تو امانت اور صلہ رحمی ان دونوں چیزوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنا زیادہ ان چیزوں کا خیال رکھیں گے اتنی ہی وہاں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

آج کل جس طرح امانت کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے اسی طرح صلہ رحمی کے اندر بھی کوتاہی ہوتی ہے۔ حالانکہ صلہ رحمی کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن آپس کی لڑائیاں، نااتفاقیاں اور آپس کی کدورتیں اتنی عام ہوگئی ہیں کہ بس اللہ کی پناہ۔ خاندانوں میں، بھائیوں میں، رشتہ داروں میں آپس میں صلہ رحمی یعنی رشتہ داری کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام بالکل باقی نہیں رہا۔ صلہ رحمی کے سلسلے میں آگے باب آئے گا۔

خیر! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پل صراط پر سے گذر کر جنت میں جانا ہے، تم میں سے سب سے پہلے ایک جماعت بجلی کی طرح گذرے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! بجلی کی طرح گذرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بجلی کو نہیں دیکھا کہ جب وہ کوندتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آئی اور پلک جھپکنے میں آسمان سے لے کر زمین تک کا کروڑوں میل کا اتنا بڑا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ گذر جائیں گے۔

اس کے بعد ایک جماعت وہ بھی ہوگی جو ہوا کی طرح تیزی سے گذر جائے گی یعنی پہلے والوں سے کچھ کم رفتار سے گذریں گے۔ پھر ایک جماعت پرندوں کی طرح گذرے گی اور اس کے بعد والی جماعت تیز رفتار اونٹ کی طرح گذرے گی۔

﴿تَجْرِیْ بِهِمْ أَعْمَالُهُمْ﴾ مختصر یہ کہ ان کو ان کے اعمال چلائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے اعمال جس درجے کے ہوں گے اسی طرح کی تیزی اس کے اندر آئے گی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی پل صراط پر کھڑے رہیں گے، جس وقت امت پل صراط سے گذر رہی ہوگی اُس وقت نبی کریم ﷺ نگرانی فرمارہے ہوں گے اور اُس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں گے ﴿رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ﴾ اے اللہ! سلامتی سلامتی۔ مطلب یہ ہے کہ میری اُمت سلامتی کے ساتھ پار ہو جائے۔

یہاں تک کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے اعمال پل صراط پر سے ان کو پار کرانے سے عاجز ہوں گے، ان کے اعمال میں اتنی قوت نہیں ہوگی کہ وہ اگلوں کی طرح سے پل صراط سے گذ جائیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ بچہ جس طرح سرین کے بل گھسٹتا ہوا چلتا ہے ایسے گھسٹ کر پل صراط پر سے جائیں گے۔ اور پل صراط کے دونوں طرف آنکس لگے ہوئے ہوں گے (آنکس یعنی وہ لوہا جو دونوں طرف سے مُڑا ہوا ہو، جس کو ہم آنکڑا کہتے ہیں) اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے گرانے کا حکم دیا جائے گا، اہل کفر اور وہ جن کا جہنم میں جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے ہے، ان کو یہ آنکس کھینچ کر جہنم میں گرا دیں گے۔ اور جن کو جہنم سے بچانا مقصود ہے وہ کسی بھی طرح سے گذر جائیں گے، تیزی کے ساتھ ہو یا گرتے پڑتے؛ لیکن پار ہو جائیں گے۔ اور بعض ایسے ہوں گے کہ مخدوش اور زخمی ہو کر

بھی نجات پا جائیں گے اور بعض وہ بھی ہوں گے کہ جو پچھاڑ کر جہنم میں گرادیئے جائیں گے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ جہنم کی گہرائی ستر سال کی ہے، یعنی جہنم اتنی گہری ہے کہ گرنے والا مسلسل ستر سال تک گرتا رہے؛ تب اس کی تہہ میں پہنچے گا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ادائے قرض کا فکر

ایک قصہ پیش کرتے ہیں کہ ایک صحابی کی طرف سے امانت کا کتنا لحاظ واہتمام کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابوخبیب تھی وہ فرماتے ہیں کہ جنگِ جمل (یہ ایک جنگ ہے جو حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی) کے دن جب میرے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدان میں کھڑے ہوئے تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ مَیں ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے فرمایا ﴿يَا بُنَيَّ! إِنَّهُ لَا يُقْتَلُ الْيَوْمَ إِلَّا ظَالِمٌ أَوْ مَظْلُومٌ﴾ اے میرے بیٹے! آج کوئی بھی نہیں قتل ہوگا مگر ظالم یا مظلوم ہو کر۔ یعنی جو حق پر ہے وہ مظلوم بن کر قتل ہوگا اور جو ناحق ہے وہ ظالم بن کر قتل ہوگا، اور میں یوں سمجھتا ہوں کہ مَیں مظلومیت کے ساتھ قتل کیا جاؤں گا اور میرا سب سے بڑا بوجھ میرے قرضے کا ہے۔ یہاں اس روایت کو لاکر یہی بتلانا مقصود ہے کہ عین اپنی موت کی گھڑی کے اندر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جس فکر نے گھیر رکھا تھا وہ ادائے امانت کا جذبہ تھا کہ لوگوں کے جو مطالبے میرے اوپر ہیں وہ کس طرح سے ادا ہوں اور انہوں نے اس کے لئے کتنا اہتمام کیا کہ عین میدانِ جنگ میں جبکہ صفِ قتال میں کھڑے ہوئے ہیں، اپنے صاحبزادے کو بلا کر اس سلسلے میں تاکید فرمارہے ہیں اور اپنے بیٹے سے

کہتے ہیں کہ ہمارا قرضہ ہمارے مال میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑے گا۔یعنی قرضہ اتنا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ملکیت میں سے کچھ باقی نہیں رہے گا،ساری ملکیت قرضہ ادا کرنے میں ختم ہوجائے گی۔پھر وصیت کے طور پر کہا کہ دیکھو!میرے مرنے کے بعد ہماری ملکتوں کو بیچ دینااور سب سے پہلے میرا قرضہ ادا کرنااور قرضہ ادا کرنے کے بعد جو بچ جائے اس کے تہائی کے سلسلے میں وصیت کرتا ہوں اور اس تہائی کا تہائی تمہارے بیٹوں کو یعنی میرے پوتوں کو دینا۔چونکہ بیٹے موجود تھے اس لئے پوتے وراثت میں سے حصہ نہیں پاتے، اس لئے حسن سلوک کے طور پر یہ وصیت فرمائی۔

ہشام کہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بعض اولاد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بعض اولاد اور بیٹوں کی ہم عمر تھیں یعنی بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ چچا بھتیجوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا اور اس وقت حضرت زبیر کے نو (۹) بیٹے اور نو (۹) بیٹیاں تھیں۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ میرے والد حضرت زبیر اپنے قرضہ کے متعلق مجھے تاکید کرتے رہے اور انہوں نے مجھے یہ کہا کہ اے میرے بیٹے!اگر میرے دین کی ادائیگی سے تم عاجز ہوجاؤ تو پھر میرے مولیٰ سے مدد چاہنا۔لفظ مولیٰ عربی زبان میں آقا کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔دوست کے لئے بھی بولتے ہیں اور اس زمانہ میں غلام ہوا کرتے تھے اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا ہو تو آزاد کئے ہوئے غلام کو بھی مولیٰ کہتے ہیں۔حضرت زبیر نے جب لفظِ مولیٰ استعمال کیا تو حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ واللہ!مَیں نہیں سمجھا کہ انہوں نے لفظِ مولیٰ بول کر کیا مراد لیا ہے،اس لئے مَیں نے پوچھا ﴿یَاأَبَتِ!مَنْ مَوْلَاکَ؟﴾ ابا جان!آپ کا مولیٰ کون ہے؟ ﴿قَالَ:أَللّٰہُ﴾ فرمایا:اللہ تعالیٰ۔

دیکھئے! ان حضرات کا یقین کیسا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعد میں جب بھی دین کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ اور دشواری پیش آتی تھی تو فوراً مَیں دعا کرتا ﴿یَامَوْلٰی الزُّبَیْرِ! اِقْضِ عَنْهُ الدَّیْنَ﴾ اے زبیر کے آقا! زبیر کا دین ادا کردیجیے تو فوراً سہولت پیدا ہوجاتی تھی۔ یہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

انہوں نے یہ وصیت کی اور میدانِ جنگ میں شہید ہوگئے، روپیہ پیسہ نہیں چھوڑا، بلکہ چند زمینیں چھوڑی تھیں، ان میں سے ایک غابہ میں تھی۔ غابہ مدینہ منورہ کے قریب ایک علاقہ ہے، اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک زمین چھوڑی تھی اور مدینہ منورہ میں گیارہ مکان اور بصرہ میں دو مکان اور کوفہ میں ایک مکان اور مصر میں ایک مکان چھوڑا تھا، انہوں نے پیسے نہیں چھوڑے تھے بلکہ یہ ملکتیں تھیں۔

اور ان کے قرضے کی نوعیت کیا تھی؟ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہوتا یہ تھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بڑے سخی تھے اور کوئی بھی ان کے پاس امانت رکھنے کے واسطے آتا تو وہ کہتے کہ یہ بطورِ امانت نہیں بلکہ بطورِ قرض دو، اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ضائع ہوجائے۔

﴿امانت اور قرض میں فرق﴾

دیکھو! امانت کسی کے پاس رکھو تو مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیہ امانت رکھی تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس نے آپ کے اس ایک لاکھ روپے کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی، جس طرح وہ اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے، ہو بہو اس نے آپ کے ایک لاکھ روپے کو بھی محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ جس طرح اپنے پیسے تجوری میں رکھتا ہے اسی طرح آپ کے پیسے بھی تجوری میں رکھے، تالا لگایا اور پوری احتیاط کی، لیکن اس کے

بعد بھی خدانخواستہ چوری ہوگئ؛تو اس صورت میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔جس کے پاس پیسہ رکھوایا تھا اس کے پاس سے آپ ایک روپیہ بھی تاوان کے طور پر لے نہیں سکتے۔جو گیا وہ آپ کا گیا۔ہاں!اگر وہ اس کی حفاظت میں کوتاہی کرتا اور ضائع ہوجاتا تو آپ وصول کرسکتے ہو۔امانت کا یہ حکم ہے۔

اس کے برخلاف وہی ایک لاکھ روپے آپ کسی کو دیں اور کہیں کہ یہ امانت نہیں ہے بلکہ قرض ہے؛تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو وہ استعمال کرسکتا ہے۔امانت میں تو جوں کا توں رہنے دینا پڑے گا لیکن قرض میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔اور آپ جب بھی مانگیں اس کو ایک لاکھ پورے واپس دینے پڑیں گے۔اگر وہ اس کے پاس ہلاک بھی ہوگئے،چاہے استعمال نہ کئے ہوں،محفوظ رکھے ہوں لیکن وہ قرض کے نام سے تھے تو واپس کرنے پڑیں گے۔قرض کا حکم یہ ہے۔

امانت کا دوسرا حکم بھی سن لیجیے۔وہ حکم یہ ہے کہ آپ نے اس کو جو دیا ہے،ہو بہو اسی کو محفوظ رکھنا ضروری ہے،اس میں ذرّہ برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں کرسکتے۔جو نوٹ اور گڈی اور جو روکڑی (رقم) دی ہے؛وہی محفوظ رکھنا پڑے گا۔اس میں سے ایک نوٹ بھی بدلنا چاہے تو نہیں بدل سکتے۔مثلاً آپ کا دیا ہوا نوٹ پُرانا ہے،اس کی جگہ وہ نیا نوٹ رکھنا چاہتا ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔جو دیا ہے وہی واپس کرنا ہے،یہ امانت کا حکم ہے۔تو امانت کے اندر یہ دو باتیں ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔

خیر!حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی شخص امانت رکھنے کے واسطے آتا تھا تو اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے یوں کہتے تھے کہ مَیں پوری حفاظت کروں گا لیکن اگر ضائع

ہو جائیں گے تو تم وصول نہیں کر سکو گے، اس لئے مجھے قرض کے نام سے دے دو، مَیں خرچ کرتا رہوں گا، جب تم کو ضرورت ہو، مجھ سے مانگ لینا، مَیں واپس دے دوں گا۔ تو قرض میں یہ آسانی ہے کہ جس کے پاس رکھی گئی ہے وہ استعمال بھی کر سکتا ہے اور دینے والے کو فائدہ یہ ہے کہ وہ سینہ ٹھوک کر اس کے پاس سے واپس لے سکتا ہے۔ اس لئے حضرت زبیر بھی اس سے قرض کے نام سے لیتے تھے۔ گویا اس طرح لوگوں کے پیسے آتے تھے اور وہ سخاوت میں خرچ کر ڈالتے تھے۔ اسی طرح کی امانتوں میں ان کا قرضہ بہت بڑھ گیا تھا۔

راوی کہتے ہیں کہ حالانکہ کبھی کوئی عہدہ انہوں نے نہیں لیا اور کسی جگہ صدقات کی وصولیابی کے لئے بھیجا جاتا تھا وہ ذمہ داری بھی قبول نہیں کی اور کوئی اور چیز بھی نہیں تھی۔ تو پھر ان کی آمدنی کیا تھی؟ کسی غزوے میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کے ساتھ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کے ساتھ جاتے تھے، مطلب یہ ہے کہ ان کی آمدنی کسی اور طریقے نہیں تھی، مالِ غنیمت کے طور پر جو مال مل جاتا تھا؛ وہی ان کے پاس تھا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد جب مَیں نے ان کا قرضہ گنا تو بائیس لاکھ درہم نکلا۔ اُس زمانے کے بائیس لاکھ درہم تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے رشتہ کے چچازاد بھائی تھے، وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے اور پوچھا کہ اے بھتیجے! میرے بھائی کا کتنا قرضہ ہے؟ حضرت عبداللہ نے سوچا کہ اگر پورا قرضہ بتلاؤں گا تو معلوم نہیں وہ کیا سوچیں گے، اس لئے مَیں نے ابا کا قرضہ چھپانے کے لئے کہا کہ ایک لاکھ ہے۔ اب ان کے جواب کو جھوٹ پر

محمول نہ کیا جائے،اس لئے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ایک لاکھ کے علاوہ نہیں ہے، بلکہ ایک لاکھ کہا تو ایک لاکھ قرضہ تو تھا ہی۔ بائیس لاکھ میں ایک لاکھ آ ہی جاتا ہے۔حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں نہیں سمجھتا کہ تمہاری ملکتوں سے یہ ادا ہو جائے گا یعنی اِس وقت تمہارے پاس جتنی ملکتیں ہیں یہ بھی تمہارے اس ایک لاکھ کے قرضے کو ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے ان سے کہا کہ اچھا! اگر بائیس لاکھ ہوں تو؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو تمہاری طاقت سے باہر کی چیز ہے۔پھر انہوں نے کہا کہ اچھا! ٹھیک ہے اگر تم سے یہ قرضہ ادا نہ ہو تو مجھ سے مدد مانگنا۔انہوں نے جواب میں کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے معذرت کر دی۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے غابہ والی زمین ایک لاکھ ستر ہزار میں خریدی تھی،اس کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سولہ لاکھ میں بیچا۔ایک لاکھ ستر ہزار کے سولہ لاکھ ملے۔پھر انہوں نے اعلان کیا کہ جن کے قرضے ہمارے ابا کے اوپر ہیں وہ فلاں جگہ آ کر مجھ سے ملو اور وصول کر لو۔

دیکھو! یہاں اصل میں یہ بات بتلانا چاہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں لوگوں کا قرضہ ادا کرنے کا اور امانت کی ادائیگی کا جذبہ موجود تھا تو جو زمین ایک لاکھ ستر ہزار میں خریدی گئی تھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے کتنے گُنے دلوائے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس اعلان پر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے،ان کا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر چار لاکھ دَین تھا،انھوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

سے کہا کہ اگر تم چاہو تو مَیں یہ دین معاف کر دیتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب میں فرمایا: نہیں۔ پھر عبداللہ بن جعفر نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے اس مطالبہ کو تم جب تک کہو وہاں تک مَیں مؤخر کر دیتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب میں فرمایا: نہیں۔تو عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے پھر اس زمین کا ایک ٹکڑا مجھے دے دو۔عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک کا حصہ لے لو۔

پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کا کچھ حصہ بیچ کر والد کا سارا قرضہ ادا کر دیا، پھر بھی اس زمین کے ساڑھے چار پلاٹ بچ گئے۔اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ان کے پاس عمرو بن عثمان منذر بن زبیر اور عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ غابہ والی زمین کی کیا قیمت لگائی گئی ہے؟ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ ایک پلاٹ کی قیمت ایک لاکھ درہم ہے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کتنے پلاٹ بچ گئے ہیں؟ عبداللہ بن زبیر نے جواب میں کہا کہ ساڑھے چار پلاٹ۔اس پر منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا ایک پلاٹ مَیں ایک لاکھ میں خریدتا ہوں۔عمرو بن عثمان نے کہا کہ مَیں نے اس کا ایک پلاٹ ایک لاکھ میں خرید لیا۔عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں نے بھی اس کا ایک پلاٹ ایک لاکھ میں خرید لیا۔اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب کتنے بچ گئے؟ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ ڈیڑھ پلاٹ۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے اس کو ڈیڑھ لاکھ میں خرید لیا۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے بعد میں اپنے حصہ میں آئی

ہوئی زمین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو چھ لاکھ میں بیچی۔

جب حضرت عبداللہ بن زبیر اپنے والد کا سارا دین ادا کر چکے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی اولاد نے کہا کہ اب ہماری میراث ہمارے درمیان تقسیم کرو۔تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم !جب تک چار سال تک موسمِ حج میں یہ اعلان نہ کرلوں کہ جس کا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اوپر قرضہ ہو، وہ ہم سے آکر وصول کر لے؛ وہاں تک میراث تقسیم نہیں کروں گا۔ چنانچہ ہر سال موسمِ حج میں یہ اعلان کرتے تھے،جب چار سال اس طرح پورے ہوئے تب وصیت کے مطابق ایک ثلث نکالا اور باقی مال ورثاء کے درمیان تقسیم کیا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں تھیں، ہر ایک کے حصہ میں بارہ لاکھ درہم آئے،اس حساب سے ان کا پورا مال پانچ کروڑ دو لاکھ ہوا۔

اس وقعہ کو بیان کر کے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ حضرات امانت کی ادائیگی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ میدانِ جنگ میں مرتے مرتے بھی اسی کی فکر فرمائی اور وصیت کی، پھر ان کے بیٹے نے بھی اتنا اہتمام کیا کہ سب کو بلا بلا کر امانت لوٹائی،اور چار سال تک موسم حج میں اعلان کرواتے رہے؛ تاکہ امانت حق والے تک پہنچ جائے۔

اس روایت سے یہ سبق بھی ملا کہ اگر امانت اور قرض کی ادائیگی کا سچا جذبہ موجود ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی کیسی مدد ہوا کرتی ہے،اور پھر برکتیں بھی کیسی ہوتی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی امانت کی ادائیگی کا اہتمام کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

تَحْرِيمُ الظُّلْمِ وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

﴿مجلس ۱﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًاعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً .أمابعد:—

قال اللّٰہتعالیٰ:مَالِلظَّالِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَاشَفِيْعٍ يُّطَاعُ

وقال اللّٰہتعالیٰ:وَمَالِلظَّالِمِيْنَ مِن نَّصِيْرٍ

﴿قابلِ توجہ بات﴾

اس باب میں ظلم کی حرمت کو بتلایا گیا ہے یعنی کسی کی حق تلفی، کسی کا حق مارنا، کسی کا حق ادانہ کرنا، اورکسی کے ساتھ زیادتی کرنا حرام ہے "وَالْأَمْرُبِرَدِّالْمَظَالِمِ""مَظَالِم،مَظْلِمَةٌ" کی جمع ہے۔ بندوں کا جوحق ماراجاتا ہے اس کو﴿مَظْلِمَةٌ﴾ کہتے ہیں۔ اگرکسی کا جانی یامالی حق مارا ہے، تو اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ بڑااہم مسئلہ ہے۔

عام طور پر جب ہم لوگ اپنے آپ کوشریعت کا پابند بنانے کا اہتمام کرتے ہیں، تو ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ نوافل کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔اشراق اورچاشت پڑھیں، تہجد پڑھیں، تلاوت وتسبیحات خوب شروع کردیں۔ یقیناً یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہیں، لیکن ان نوافل کے مقابلہ میں فرائض اور واجبات اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی؛ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔نوافل کا حال تو یہ ہے کہ اگرآپ نوافل کواس کی شرطوں کے ساتھ اداکریں گےتو آپ کواجروثواب حاصل ہوگا اوراللہ تعالیٰ کا قرب حاصل

ہوگا، اوراس کی شرط یہ ہے کہ ان نوافل کے ساتھ ساتھ فرائض و واجبات کا اہتمام کیا جائے، اگر کوئی آدمی صرف نوافل پر اکتفا کرتا ہے، اور فرائض و واجبات کا اہتمام نہیں کرتا، تو ایسے نوافل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں ہیں۔تو فرائض و واجبات اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح دوسری چیز جو بہت ضروری اور اہم ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچانا، بندوں کی حق تلفی اور ظلم و زیادتی سے بچانا۔اس لئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند چیزوں کی خصوصیت کے ساتھ ان کو تلقین فرمائی تھی، اس میں ایک یہ بھی تھا ﴿اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان سے بچو؛ سب سے بڑے عبادت گزار ہوجاؤ گے (ترمذی شریف، ۲۳۰۵) تو سب سے بڑی عبادت تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئیں چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

﴿نفس کا بڑا دھوکہ﴾

ہمارا نفس ہم کو بہت زیادہ دھوکہ میں رکھتا ہے۔نوافل کی طرف ہمیں جھکا کر اس کی مشغولی کو ہمارے لئے کافی قرار دیتا ہے، اوراس کے بعد آدمی یوں سمجھتا ہے کہ اب فرائض، واجبات اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ یہ طریقہ اس کے لئے آخرت کے اعتبار سے بربادی کا ذریعہ ہے۔نوافل کا درجہ تو فرائض کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اور فرائض کے اندر جو کمی ہوگی اللہ تعالیٰ ان نوافل کے ذریعہ پوری فرمائیں گے یہ خاص چیز ہے کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں بہت زیادہ اہتمام،

توجہ اور دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاتھوں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ خاص کر وہ لوگ جن سے ہمیں دن رات واسطہ پڑتا ہے جیسے ماں، باپ، بیوی، بچے، بھائی، بہن اور دوست واحباب یا اگر کوئی کاروبار کرتے ہیں تو آپ کے ماتحت کام کرنے والے ملازمین؛ ان سب کے حقوق کی ادائیگی کی طرف بہت زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ذرا سی حق تلفی آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔ اس لئے لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لینا، اور حق تلفی کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر کسی کی حق تلفی ہوئی ہے، تو چاہے سو سال پہلے ہوئی ہو، اور اس کے بعد آپ سو سال تک عبادتیں کرتے رہے ہوں، تب بھی اس حق تلفی کی تلافی ہونے والی نہیں ہے جب تک کہ وہ معاف نہ کرے۔ یہ بات یاد رہے۔

باب کا عنوان

اسی لئے عنوان میں یہ جملہ لائے ”وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ“ یعنی بندوں کے جو حقوق ہم سے ضائع ہوئے ہیں ان کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا۔ مثلاً کسی کو ہم نے گالی دے کر تکلیف پہنچائی، کسی کو تہمت لگا کر تکلیف پہنچائی، کسی کو جسمانی اذیت اور تکلیف پہنچائی، کسی کو اور کسی انداز سے پریشان کیا اور ستایا؛ تو ان سب چیزوں کے متعلق جب تک صاحبِ معاملہ کے ساتھ صفائی نہیں ہوگی؛ وہاں تک بات بننے والی نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے کتنے ہی روئیں اور گڑگڑائیں، رات رات بھر عبادتیں کریں اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ اے اللہ! مَیں نے تو تیرے بندوں کو بہت ستایا ہے، تو معاف کردے۔ وہاں سے بھی جواب مل چکا ہے کہ جب تک کہ بندہ معاف نہیں کرے گا وہاں تک معاف نہیں ہے۔ سارا معاملہ اسی پر موقوف ہے۔

اسی طرح اگر مالی اعتبار سے کسی کا کوئی حق ہم پر باقی ہے، تو اس کی ادائیگی کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے۔ اگر دنیا میں ہم نے یہ معاملہ صاف نہیں کیا تو پھر آخرت میں جب تک کہ یہ حقوق ادا نہیں ہوں گے؛ وہاں تک جنت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ جنتیوں تک کے متعلق بھی یہ صراحت ہے کہ جن کے متعلق جنت کا فیصلہ ہو گیا ہو گا، ان کو بھی جب تک بندوں کے حقوق کی صفائی نہیں ہو گی وہاں تک پل صراط پر روک دیا جائے گا، اور جب تک یہ معاملہ صاف نہیں ہو گا وہاں تک آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہو گی اور جنت میں جانے نہیں دیا جائے گا۔ یہ بڑا اہم معاملہ ہے، اسی اہمیت کو یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

﴿ کوئی دوست اور سفارشی نہیں ہوگا ﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ﴿مَالِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾ "حَمِيْمٌ" قریبی دوست کو کہتے ہے، جس کو ہم اپنی زبان میں لنگوٹیا (લંગોટિયો) کہتے ہیں تو جن لوگوں نے ظلم سے کام لیا ہے اور حق تلفی کی ہے، لوگوں کے جانی یا مالی حقوق ضائع کیے ہیں، تو قیامت کے دن ان کا کوئی دوست نہیں ہو گا، اور نہ کوئی سفارشی ہو گا جس کی سفارش مانی جائے یعنی ان حقوق کے معاملہ میں ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کے معاملہ میں درگذر سے کام لیں گے، لیکن بندوں کے حقوق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ دخل نہیں دیں گے۔

مَیں ہمیشہ ایک مثال دے کر بتلاتا ہوں کہ اگر کسی کے بیٹے کو آپ نے مارا، پھر آپ اس کے باپ کے پاس جا کر کہیں کہ مَیں نے آپ کے بیٹے کو مارا ہے، آپ مجھے معاف کر دو، تو وہ کیا جواب دے گا؟ وہ یہی کہے گا کہ بھائی! تم اسی سے معافی مانگو، وہ میرا بیٹا ہے تو کیا ہوا،

آپ کا معاملہ اس سے ہے، آپ نے جب معاملہ اس کے ساتھ کیا ہے، تو اب مجھے معاف کرنے کا کیا حق ہے، مَیں معاف نہیں کروں گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی بندوں کے سارے معاملات انہیں پر چھوڑ رکھے ہیں۔ لہٰذا دنیا میں جب تک اللہ تعالیٰ نے جسم میں جان باقی رکھی ہے، آدمی کو چاہیے کہ سوچ کر اور غور و فکر کر کے ان سارے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرلے۔ یہ بہت اہم ہے۔ جب تک کہ یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا، وہاں تک دوسری عبادتوں میں بھی برکت آنے والی نہیں ہے۔

یہاں باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا کہ قیامت کے روز ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور کوئی ایسا سفارشی بھی نہیں ہوگا جس کی سفارش قبول کی جائے۔ بلکہ اس دن تو یہ معاملہ اپنے اعمال اور نیکیوں کے ذریعہ چکانا پڑے گا۔

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِن نَّصِيْرٍ﴾ اس آیت میں تو بالکل ہی نفی کردی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حق تلفی کرنے والوں کا کوئی مددگار ہی نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ بھی اس کی سفارش نہیں کریں گے۔ سیدھی بات ہے۔

﴿نہایت اہم روایت﴾

اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی عادت کے مطابق روایتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک روایت حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ہے جو پہلے گذر چکی ہے، اسی کا حوالہ انہوں نے یہاں دیا ہے۔ لیکن بڑی اہم روایت ہے اس لئے مَیں اس کو پھر سے بیان کردیتا ہوں۔

عن سعید بن عبدالعزیز عن ربیعة بن یزید عن أبی ادریس الخولانی عن أبی ذر جندب بن جنادة رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيْمَا يَرْوِىْ عَنِ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى أَنَّهٗ قَالَ:..........

ربیعہ بن یزید ایک بڑے تابعی ہیں، وہ ابوادریس خولانی سے نقل کرتے ہیں، اور حضرت ابوادریس خولانی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے، اور وہ نبی کریم ﷺ سے، اور حضور ﷺ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشادات ایک تو قرآن میں ہیں جس کو وحی متلو کہا جاتا ہے۔ اور جب حدیث میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد نقل کریں کہ باری تعالیٰ نے یوں فرمایا تو وہ ''حدیث قدسی'' کہلاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا

تو باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ﴿یَاعِبَادِیْ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُہٗ بَیْنَکُمْ محرماًفَلا تَظَالَمُوْا﴾ اے میرے بندو! مَیں نے اپنی ذات کے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا، اللہ تعالیٰ تو سب کے مالک ہیں، وہ جو چاہیں کریں، مالک اور آقا اپنے غلام کے ساتھ جو معاملہ چاہے کرسکتا ہے، اس کا مختار کل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کا کپڑا ہے، اور آپ مالک ہیں، آپ اپنے اس کپڑے کا جو چاہیں کریں، کاٹ کر پھینک دیں، آگ لگا دیں، آپ سے کوئی پرشش نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اگر اسراف ہوا ہے، تو وہاں پوچھ ہوگی وہ الگ بات ہے، لیکن دنیا میں اگر کوئی آدمی پوچھے گا تو آپ یہی کہیں گے کہ مَیں مالک و مختار ہوں، آپ کو مجھے کہنے کا کیا حق ہے؟ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ساری چیزوں کے مالک ہونے کے باوجود فرماتے ہیں کہ مَیں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی ظلم کا صدور نہیں ہوتا۔ اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کی حق تلفی کرو اور زیادتی کرو، اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔

عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ......

﴿یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّامَنْ ھَدَیْتُہٗ فَاسْتَھْدُوْنِیْ أَھْدِکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو مگر وہ جس کو مَیں ہدایت دوں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دیں گے؛ وہی راہِ راست پر آسکتا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نہ دیں وہ راہِ راست پر نہیں آسکتا ہے۔ اسی کو کہتے ہے کہ تم سب گمراہ ہو لیکن میں جس کو ہدایت دوں وہ راہِ راست پر آئے گا، لہٰذا تم مجھ سے ہدایت مانگو، مَیں تم کو راہِ راست پر چلاؤں گا اور ہدایت دوں گا۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے لئے ہدایت مقدر ہے، تو وہ ہدایت یاب ہوگا اور راہ راست پر چلے گا۔ لیکن اس کے باوجود بندوں کی بندگی اور عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا سوال کرتے رہیں۔ آپ راہ راست پر چل رہے ہیں آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ راست مقدر ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں حکم دیا گیا کہ تم ہدایت مانگو، اسی لئے روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ میں یہ دعا ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ پڑھی جاتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ سے راہ راست پر چلنے کا سوال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے۔ گویا عبدیت کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے رہیں، اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔

ہمیشہ مجھ سے مانگتے رہو

﴿یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُہٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر وہ جس کو مَیں کھانا دوں۔ ظاہر ہے کہ

اللہ تعالیٰ جس کو کھانا نہ دیں، اس کو کھانا کون دے سکتا ہے۔اسی لئے تم مجھ سے کھانا مانگو،مَیں تم کو کھانا دوں گا۔گویا بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ بندوں کو اپنی ساری حاجتیں چھوٹی اور بڑی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہئیں۔حاجتیں پوری ہورہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں کھانا دے رہے ہیں تب بھی ہماری عبدیت اور بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے روزی مانگتے رہیں۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مل رہا ہے تو یہ سوچیں کہ ابھی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، جب نہیں ملے گا تو مانگیں گے۔ بلکہ جب مل رہا ہے اسی زمانہ میں مانگنے کی عادت ڈالو۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، تو اگر آرام کے زمانہ میں بھی اس کی دعا کا سلسلہ جاری تھا تو اس آواز کو سن کر فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ! جانی پہچانی آواز ہے۔اور اگر کوئی آدمی راحت و آرام کے زمانہ میں اللہ کو یاد نہیں کرتا، اور جب تکلیف آتی ہے تو دعا مانگتا ہے، تو فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ کوئی اجنبی آواز ہے، آج تک تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ (شعب الایمان، ۱۱۴۰)

مثلاً ایک آدمی آپ سے ملتا رہتا ہے، حالات ٹھیک ہیں تب بھی ملاقات کرتا رہتا ہے، پھر کوئی مصیبت آئی تب بھی ملا اور تکلیف میں آپ سے آکر درخواست کی، تو آپ فوراً دھیان دیں گے اور سوچیں گے کہ یہ تو اپنا ملنے والا ہے۔اور اگر حالات ٹھیک رہے اس زمانہ میں تو کبھی بھول سے سلام بھی نہیں کیا، اب جب مصیبت آئی، تو آپ کے پاس آیا تو آپ کیا کہیں گے؟ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیں عبدیت کا معاملہ رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمارے سلام کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بندے ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ روزی مل رہی ہے تب بھی

ہم اللہ تعالیٰ سے روزی مانگتے رہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم مجھ سے کھانا مانگو؛ مَیں تمہیں کھانا دوں گا۔

﴿یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ عَارٍاِلَّامَنْ کَسَوْتُهُ فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو یعنی تمہارے پاس کپڑا نہیں مگر مَیں جس کو کپڑا دوں، لہٰذا تم مجھ سے کپڑا مانگو؛ مَیں تم کو کپڑا پہناؤں گا۔ گویا بندوں کو اپنی ساری ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے رہنا چاہئیں اور یہ مانگتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ! تو ہماری تمام ضرورتوں کی کفالت فرما، ہمیں کھانا دے، ہمیں کپڑا دے، ہماری ساری ضرورتیں پوری فرما۔ پوری ہو رہی ہوں تب بھی مانگتا رہے۔

﴿ہم تو سراپا گناہ ہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِوَأَنَاأَغْفِرُالذُّنُوْبَ جَمِیْعاً فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْلَکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم رات اور دن گناہ کرتے ہو، مَیں سارے گناہوں کو معاف کرتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے گناہوں کی معافی مانگو، مَیں تمہارے گناہوں کو معاف کردوں گا۔ ہم سے دانستہ نادانستہ گناہ تو سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں، حدیثِ پاک میں ہے ﴿کُلُّکُمْ خَطَّاؤُوْنَ وَخَیْرُالْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ﴾ تم سب خطا کار اور گنہ گار ہو، اور بہترین گنہ گار وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔ انسان کی سرشت، مزاج اور طبیعت میں یہ بات رکھی ہوئی ہے، اس لئے نافرمانی کا صدور اس سے ہوتا ہی ہے، لہٰذا اس کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگنے کا اہتمام کرتا رہے۔ ایسا نہیں جیسا بعضوں کا حال ہوتا ہے کہ جب کوئی حالات آگئے تو کہتا ہے میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب سے کوئی گناہ ہی

نہیں ہوا ہے۔حالانکہ ہمارا وجود ہی گناہ ہے ﴿وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لایُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ﴾ تمہارا وجود ہی گناہ ہے۔ہم تو سراپا گناہ ہیں۔

بہر حال! ہماری عبادتوں کا حال بھی ایسا ہی ہے کہ اگر ہم ان کا جائزہ لیں تو سمجھ میں آجائے کہ ہماری عبادتیں، عبادتیں نہیں ہیں بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں سزا نہیں دیتے یہی اس کا بڑا احسان ہے۔ہم نماز پڑھتے ہیں تو کیا ہمارا پورا دل نماز میں لگا ہوا ہوتا ہے؟ جس وقت ہم تلاوت کر رہے ہوتے ہیں، تو کیا ہماری پوری توجہ تلاوت کی طرف ہوتی ہے؟ اس تلاوت پر ہمیں ثواب ملے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہو؟

کوئی بچہ آپ سے بات کر رہا ہو اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہو تو آپ کیا کریں گے؟ ایک طمانچہ ماریں گے اور کہیں گے کہ کیا کرتا ہے؟ مجھ سے بات کرتا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، تیرا دھیان کدھر ہے؟ ہم اپنے ماتحتوں کی ذرا سی غفلت کو برداشت نہیں کرتے۔اور جب ہم خود اللہ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں تو کیسا دل لے کر اور کیسی توجہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری عبادتیں بھی ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر ہمیں سزا نہیں دیتے یہی کافی ہے۔اس پر ثواب دینا اور انعام ملنا تو بڑی بات ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مَیں گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو؛ مَیں تمہارے گناہوں کو معاف کروں گا۔لہٰذا آدمی کو ہمیشہ استغفار کا اور گناہوں کی معافی مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔بلکہ نبی کریم ﷺ تو فرماتے ہیں کہ مَیں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔حالانکہ حضور ﷺ تو گناہوں سے پاک اور معصوم تھے لیکن آپ کا یہ عمل امت کی تعلیم اور سکھلانے کے لئے ہے۔

﴿یہ ہمارے بس میں ہے ہی نہیں﴾

﴿یَا عِبَادِیْ اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم اس مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے نقصان پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا کے لوگ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا چاہیں تو ان میں طاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچا سکیں۔

﴿وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ﴾ اور تم لوگ مجھے فائدہ اور نفع پہنچانے کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم سب فائدہ پہنچاؤ۔ سب بندے چاہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچائیں، تو یہ ہمارے بس میں ہے ہی نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچائیں۔ ہم میں وہ استطاعت ہی نہیں ہے۔ ساری چیزوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

﴿من نہ گردم پاک از تسبیح شاں﴾

یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَازَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا

اے میرے بندو! تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے انسان اور جنات، تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار آدمی جیسے دل والے ہو جائیں۔ یعنی سارے انسان، سارے جنات، اولین و آخرین سب؛ دنیا میں سب سے زیادہ اللہ کی اطاعت کرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کے فرمانبردار بندے جیسے بن جاویں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے میری سلطنت اور میرے ملک میں ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں ہوگی۔ اللہ کی عظمت میں، اللہ کی بڑائی میں، اللہ کی کبریائی میں اس سے کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔

سب لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہیں، نیک بن گئے ہیں تو اس کی وجہ سے

اللہ تعالیٰ کی شان بڑھ گئی، ایسا نہیں ہے۔اس کی وجہ سے اللہ کی شان میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ بندوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے محتاج نہیں ہیں۔بندوں کو خود ہی اپنی فرمانبرداری اور اطاعت کا فائدہ پہنچتا ہے، اور اپنے گناہوں کا نقصان بھی خود انہیں کو پہنچتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:-

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں ❁ پاک ہم ایشاں شوند و در فشاں

بندے جو سبحان اللہ کہتے ہیں اس کی وجہ سے مَیں پاک نہیں ہوتا۔سبحان اللہ کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے۔ہم یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے، تو ہمارے یہ کہنے سے اللہ کی ذات میں پاکی نہیں آتی، بلکہ اس سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے ہم خود ہی پاک ہوتے ہیں۔ ہماری زبانوں کی گندگی سبحان کہنے سے دور ہوتی ہے، سبحان اللہ کہنے سے اللہ کی ذات اور شان میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی ہے۔یہ تو ہمارا فائدہ ہے۔

يَاعِبَادِیْ لَوْأَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْاعَلٰی أَفْجَرِقَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍمِّنْكُمْ مَانَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُّلْكِیْ شَيْئاً

اس حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا کیسا ظہور ہو رہا ہے۔فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے تمہارے انسان اور جنات تم میں سب سے زیادہ بدکار آدمی جیسے بن جاویں تو اس کی وجہ سے میری کبریائی اور سلطنت میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ ساری دنیا کے لوگ؛ دنیا کے سب سے بدترین آدمی اور سب سے زیادہ اللہ کے نافرمان بندے جیسے بن جاویں، تو اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے لامحدود خزانے﴾

﴿یَاعِبَادِیْ لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْافِیْ صَعِیْدٍوَاحِدٍ، فَسَأَلُوْنِیْ،فَأَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْأَلَتَہٗ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنْدِیْ اِلَّاکَمَایَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَاأُدْخِلَ الْبَحْرُ﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، انسان اور جنات؛ ایک میدان میں بیک وقت کھڑے ہو جائیں، اور مجھ سے اپنی ساری حاجتیں، سوالات اور جو جو تمنائیں ہوں؛ وہ سب مانگیں، اور ہر آدمی نے جو جو مانگا، وہ سب کا سب مَیں سب کو دے دوں؛ تو میرے دینے کی وجہ سے میرے خزانوں میں اتنی بھی کمی نہیں آئے گی جتنی سمندر کے اندر ایک سوئی ڈبونے کی وجہ سے آتی ہے۔ یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لئے دی ہے، ورنہ سمندر کتنا ہی بڑا سہی، لیکن ختم ہونے والی چیز ہے۔ اور سوئی اس کے مقابلہ میں کتنی ہی چھوٹی سہی، لیکن وہ بھی فانی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا نہیں ہے

تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا اپنی ساری حاجتیں بیک وقت مانگیں، اور وہ سب مَیں پوری کر دوں، تو میرے خزانوں میں اتنی کمی نہیں آئے گی جتنی سوئی ڈبونے سے سمندر میں آئی ہے۔ حالانکہ سوئی چکنی اور لوہے کی ہونے کی وجہ سے اس پر بہت معمولی پانی آتا ہے، اور سمندر کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت بھی نہیں ہے۔ لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے خزانے اتنے ہیں کہ یہ سب پورا کر دوں تب بھی اس میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے۔

﴿بھلے عمل کا بھلا نتیجہ﴾

﴿یَاعِبَادِیْ اِنَّمَاھِیَ أَعْمَالُکُمْ أُحْصِیْھَالَکُمْ،ثُمَّ أُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا﴾ اے میرے بندو!

یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لئے رکارڈ اور محفوظ کرتا ہوں۔ آدمی دنیا میں جو کچھ کرتا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہوتا ہے۔ قیامت کے روز جب نامۂ اعمال میں سب کچھ نظر آئے گا تو بندہ کہے گا ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ أَحْصَاهَا﴾ اس نوشتے کا کیا حال ہے کہ کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں ہے، سب کچھ اندر موجود ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہم تو کر کے بھول جاتے ہیں لیکن ہمارے نامۂ اعمال میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، قیامت کے دن ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جن کو مَیں تمہارے لئے ریکارڈ کرتا تھا آج مَیں تم کو اس کا بدلہ دوں گا، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ ملے گا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی، وہ اس کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی، وہ بھی اس کو دنیا میں اور آخرت میں دیکھ لے گا۔

آدمی کوئی عمل کرے اور یوں سمجھے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں آنے والا ہے، یہ اس کی حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، اسی لئے فرمایا ﴿فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللهَ﴾ کوئی آدمی اگر اپنے نامۂ اعمال میں بھلے اعمال کو دیکھتا ہے، یعنی اگر کسی سے نیک اعمال وجود میں آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے نیک عمل کی توفیق دی، مَیں تو اس لائق نہیں تھا۔ گویا نیک اعمال کا ہم سے سرزد ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی کی وجہ سے ہے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، لہٰذا آدمی اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے۔

﴿وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّآ نَفْسَهٗ﴾ اور اگر کچھ دوسرا نظر آ رہا ہے یعنی غلط

اعمال سرزد ہورہے ہیں، تو اپنے علاوہ کسی اور کو ملامت نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو ہی کوسے کہ اس میں ہماری ہی کمی وکوتاہی ہے۔

﴿بار بار پڑھتے رہنے کے قابل روایت﴾

اس روایت کو ربیعہ بن یزید سے نقل کرنے والے سعید بن عبدالعزیز ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ربیعہ یوں کہتے تھے ﴿كَانَ أَبُوْاِدْرِيْسَ اِذَاحَدَّثَ بِهٰذَاالْحَدِيْثِ حَثَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ﴾ جب حضرت ابوادریس خولانی اس روایت کو بیان کرتے تھے تو اس روایت کی عظمت کی وجہ سے دوزانو بیٹھ جاتے تھے۔

یہ ایسی روایت ہے کہ آدمی اس کو کاغذ پر لکھ لے، اور بار بار اس کا مطالعہ کرتا رہے اور دیکھتا رہے، تو اس کی وجہ سے ایمان میں اضافہ ہوگا اور نیک اعمال کی توفیق ہوگی۔ بزرگوں کے یہاں اس کا معمول رہا ہے، ہمارے یہاں بھی اس قسم کی چیزوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت امام احمد بن حنبل سے یہ روایت سنی ہے کہ اہل شام کے پاس اس سے بہتر حدیث نہیں ہے۔ یعنی اس کا مضمون عجیب وغریب ہے۔

﴿ظلم سے بچو﴾

۲۰۳. وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: اِتَّقُوْاالظُّلْمَ، فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاتَّقُوْاالشُّحَّ، فَاِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰى اَنْ سَفَكُوْادِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْامَحَارِمَهُمْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ظلم سے، کسی کا حق مارنے سے اور کسی پر زیادتی کرنے سے بچو، اس لئے کہ ظلم قیامت کے دن اندھیریوں کی شکل اختیار

کرے گا۔جس نے بھی ظلم کیا ہے قیامت کے روز اس کو راستہ نہیں ملے گا، وہ اندھیریوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ جو اہل ایمان ہیں ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے نور کا راستہ دکھلائیں گے،لیکن جن کے اعمال بد ہیں، وہ اعمال بدان کے لئے اندھیریوں کی شکل اختیار کریں گے۔

اگلوں کو ہلاک کرنے والی صفت

﴿وَاتَّقُوا الشُّحَّ﴾ اور حرص وبخل سے بچو۔''شُح'' کہتے ہیں ایسا بخل جس میں حرص اورلالچ بھی ملا ہوا ہو۔جس کے مزاج میں لالچ بھی ہے اور اس لالچ کی وجہ سے بخل بھی ہے تو وہ حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیتا ہے،اوراسی بخل نے جو لالچ کے ساتھ ملا جلا ہوتا ہے؛تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔

﴿حَمَلَهُمْ عَلىٰ اَنْ سَفَكُوْا دِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ﴾ اس کے نتیجے میں وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے۔مال کی لالچ ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے سامنے والے کے ساتھ خیانت بھی کرتا ہے اور اس کا قتل بھی کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اسی بخل اور لالچ کے نتیجے میں حلال قرار دیتے تھے۔یعنی اس کے ساتھ حلال کا سا معاملہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل کا نمونہ

۲۰۴ .وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ:لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ اِلىٰ أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَآءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَآءِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم لوگ حق والوں کا حق ادا کرو۔اگر یہاں نہیں

کیا تو قیامت کے دن تم کو ان کے حقوق ادا کرنے پڑیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت کے روز بغیر سینگ والی بکری کے لئے سینگ والی بکری سے بدلہ لیا جائے گا۔یعنی اگر دنیا میں سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سینگ والی بکری کا سینگ نکلوا کر بغیر سینگ والی بکری کو دیں گے اور کہا جائے کہ تم اپنا بدلہ لے لو۔حالانکہ جانور شریعت کے احکام کے مکلّف نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی شانِ عدل وانصاف ظاہر فرمائیں گے اور اس طرح فیصلہ ہوگا تو پھر اگر انسانوں نے کسی کی حق تلفی کی ہے، یا کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے؛ تو بھلا ان کو کیسے چھوڑا جائے گا؟ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دنیا کے اندر حقوق ادا کرلو، ورنہ پھر وہاں تو یہ معاملہ پیش آنے والا ہے۔

تَحْرِيْمُ الظُّلْمِ وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

﴿مجلس ۲﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

۲۰۵. وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: کُنَّانَتَحَدَّثُ عَنْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَالنَّبِیُّ ﷺ بَیْنَ أَظْھُرِنَاوَلانَدْرِیْ مَاحَجَّةُالْوَدَاعِ،حَتّٰی حَمِدَاللّٰہَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ،وَأَثْنٰی عَلَیْہِ،ثُمَّ ذَکَرَ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَأَطْنَبَ فِیْ ذِکْرِہٖ وَقَالَ:مَابَعَثَ اللّٰہُ مِن نَّبِیٍّ اِلَّاأَنْذَرَہٗ أُمَّتَہٗ:أَنْذَرَہٗ نُوْحٌ وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ بَعْدِہٖ،وَأَنَّہٗ أَن یَّخْرُجَ فِیْکُمْ فَمَاخَفِیَ عَلَیْکُمْ مِنْ شَأْنِہٖ فَلَیْسَ یَخْفٰی عَلَیْکُمْ، اِنَّ رَبَّکُمْ لَیْسَ بِأَعْوَرَ،وَأَنَّہٗ أَعْوَرُعَیْنِ الْیُمْنٰی،کَأَنَّ عَیْنَہٗ عِنَبَةٌطَافِیَةٌ.اَلااِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ دِمَآءَ کُمْ وَأَمْوَالَکُمْ کَحُرْمَةِیَوْمِکُمْ ھٰذَا،فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا،فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا.اَلاَ ھَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا:نَعَمْ.قَالَ:أَللّٰھُمَّ اشْھَدْ،ثَلاثًا.وَیْلَکُمْ أَوْوَیْحَکُمْ أُنْظُرُوْا،لاتَرْجِعُوْابَعْدِیْ کُفَّاراً یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (رواہ البخاری)

چونکہ باب قائم کیا تھا کہ کسی کی حق تلفی اور ظلم کا حرام ہونا،اس بات کو بتلانے کے لئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت پیش کررہے ہیں۔

حجۃ الوداع کا مطلب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم لفظ حجۃ الوداع اپنی زبان سے بولتے تھے اوراس کا تذکرہ کرتے تھے،درانحالیکہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما

تھے یعنی آپ بقیدِ حیات تھے، لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ عنقریب نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے جانے والے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ۱۰ سنہ ھ میں جو حج کیا تھا وہ حج کی فرضیت کے بعد پہلا ہی حج ہے جو آپ نے کیا، اور جب آپ حج کے لئے تشریف لے جانے والے تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں میں باقاعدہ اعلان کرایا کہ میں حج کے لئے جانے والا ہوں تم لوگ بھی میرے ساتھ حج کے لئے تیاری کرو۔ چنانچہ بہت بڑی مخلوق نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کے لئے چلی، اسی حج کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جو خطبے دیے تھے اس میں ایک موقعہ پر یہ بھی فرمایا ﴿لَعَلِّی لاأَرَاکُمْ بَعْدَعَامِیْ هٰذَا﴾ شاید اس سال کے بعد میں تم کو دیکھ نہ پاؤں گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ حجۃ الوداع اسی سے نکلا ہے، گویا حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو الوداع کہا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی موجودگی میں ہم لوگ اپنی زبان سے لفظ حجۃ الوداع تو بولتے رہتے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے جانے والے ہیں۔

اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر یہ کہہ رہے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو اکابر صحابہ تھے جیسے کہ حضرات شیخین اور دوسرے حضرات صحابہ؛ وہ بھی اس کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جو بڑے حضرات تھے وہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب سمجھتے ہوں، لیکن ان کے مقابلہ میں جو چھوٹے حضرات تھے وہ اس لفظ کو اپنے کلام میں اور اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے اور ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے

درمیان زیادہ باقی رہنے والے نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی فقاہت

جیسا کہ حجۃ الوداع ہی کے موقعہ پر سورۂ نصر نازل ہوئی تو اس سورت کے متعلق روایتوں میں ایک قصہ آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس حاضری دینے کے معاملہ میں اکابر صحابہ کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے، حالانکہ عمر کے اعتبار سے ان اکابر صحابہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان بڑا فرق تھا، وہ بڑے بڑے حضرات جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات؛ ان کی اولاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہم عمر تھیں۔ اسی لئے ایک موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات کہی کہ جس وقت ہم لوگ آپ کی خدمت میں موجود ہوتے ہیں اس وقت آپ ان کو بھی آنے کی اجازت دیتے ہیں (فرق مراتب کا تقاضہ یہ تھا کہ ہر ایک کے لئے اس کے مرتبہ کے مطابق وقت الگ کیا جائے بڑوں کی حاضری کا جو وقت ہے اس میں چھوٹوں کو وہاں حاضری کی اجازت نہ دی جائے، اس کے پیش نظر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ جب ہم موجود ہوتے ہیں اس وقت آپ ان کو حاضری کی اجازت دیتے ہیں) حالانکہ ہمارے بیٹے ان کی عمر کے ہیں اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اس وقت تو یہ جواب دے دیا، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے موقعہ پر جب کہ سب حضرات موجود تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس میں یہ سوال قائم کیا کہ ”سورۂ نصر“ کے متعلق آپ

حضرات کیا کہتے ہیں؟ وہاں جو اکابر صحابہ موجود تھے ان میں سے کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ہمیں تعلیم اور تلقین دی ہے کہ جب فتوحات کا سلسلہ ہو تو اس وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں لگ جانا چاہیے۔ کسی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس طرح مختلف جوابات دیے گئے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا کہ اے ابن عباس! آپ کیا کہتے ہیں؟ مَیں نے عرض کیا کہ اس کے متعلق میرے دل میں ایک اور چیز ہے۔ کہا: بتلاؤ، بڑوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو کم محسوس کرتے ہوئے شرمانے کی اور خاموش رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو مَیں نے عرض کیا کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کی خبر دی ہے کہ جب مکہ فتح ہو جائے اور لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوں، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا دنیا سے رخصتی کا وقت قریب آ چکا ہے، اب آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور استغفار میں اپنا وقت لگائیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس روز حضرت امیر المؤمنین نے یہ مجلس اسی لئے قائم کی تھی کہ گویا ان لوگوں کو بتایا جائے کہ میں ان کو قریب کیوں رکھتا ہوں۔

(المعجم الکبیر، ۱۰۴۷۰)

خیر! حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ دیکھو "سورۂ نصر" کے متعلق یہ چیز کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے؛ وہ سب حضرات نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح لفظ حجۃ الوداع کو اپنے کلام اور گفتگو میں تمام صحابہ استعمال تو کرتے تھے لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت قریب آ چکا ہے، اور آپ ہمارے درمیان زیادہ رہنے والے نہیں ہیں۔

﴿خطبۂ حجۃ الوداع﴾

خیر! نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں (جو خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر دیا) اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر آپ نے اسی خطبہ میں دجال کا تذکرہ کیا اور تفصیل سے اس کی علامتیں اور اس کے احوال اور کوائف بتلائے۔اور پھر اپنے اسی خطبہ میں آپ نے یہ بات بھی ارشاد فرمائی ﴿مَابَعَثَ اللّٰہُ مِن نَّبِیٍّ اِلَّاأَنْذَرَہُ أُمَّتَہُ﴾ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے جتنے بھی نبی بھیجے، ہر نبی نے اپنی امت کو دجال کے فتنے سے ڈرایا ہے

﴿أَنْذَرَہُ نُوحٌ وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ بَعْدِہٖ﴾ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا اور آپ کے بعد جتنے بھی نبی آئے سب نے اپنی اپنی امتوں اور قوموں کو دجال سے ڈرایا کہ وہ بڑا فتنہ ہے اور اس سے ایمان پر زد پڑ سکتی ہے۔اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہے اور اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، لہٰذا دجال کے ظہور کے متعلق یہ بات تو طے ہو چکی کہ آپ کی امت ہی میں وہ ظاہر ہوگا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر دجال کے حالات اور اس کے متعلق تفصیلات تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوں اور تم اس کے متعلق ساری معلومات جان نہ پائے ہو، تو مَیں تمہیں ایک کھلی ہوئی علامت بتلا دیتا ہوں جس کے بعد دجال کی دوسری تفصیلات جاننے کی ضرورت نہیں ہے، اور اسی ایک علامت ذریعہ سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ خدا نہیں ہے، اس لئے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا، وہ کہے گا کہ مَیں خدا ہوں ﴿اِنَّ رَبَّکُمْ لَیْسَ بِأَعْوَرَ وَأَنَّہٗ أَعْوَرُعَیْنِ الْیُمْنٰی﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ میں کوئی عیب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بھینگا نہیں ہے یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں کوئی عیب نہیں ہے، اور دجال کی دائیں آنکھ عیب دار ہے۔اس کی آنکھ میں کیا ہے؟ ﴿کَأَنَّ عَیْنَہٗ عِنَبَۃٌ طَافِیَۃٌ﴾ اس کی آنکھ ایسی باہر نکلی ہوئی ہوگی جیسے انگور کے خوشے

میں سے باہر نکلا ہوا دانہ ہوتا ہے۔آپ حضرات نے انگور کا خوشہ دیکھا ہوگا کہ اس کا پورا خوشہ بالکل ترتیب سے ہوتا ہے لیکن اس میں سے ایک آدھ دانہ باہر نکلا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح اس کی داہنی آنکھ باہر نکلی ہوئی ہوگی۔گویا یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ یہ دجال ہے، بلکہ اس کی پیشانی پر بھی ﴿ک،ف،ر﴾ لکھا ہوا ہوگا جس کے متعلق حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی جو پڑھا لکھا ہو وہ بھی، اور جو ان پڑھ ہو وہ بھی؛ اس کو پڑھ لے گا۔

﴿مسلمان کی جان، مال اور عزت اُسی طرح محفوظ ہے......﴾

﴿اَلاَاِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ دِمَآءَ کُمۡ وَأَمۡوَالَکُمۡ کَحُرۡمَةِیَوۡمِکُمۡ ھٰذَا،فِیۡ بَلَدِکُمۡ ھٰذَا، فِـیۡ شَھۡـرِکُـمۡ ھٰـذَا﴾ اسی خطبے میں نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کو ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی جیسا کہ دوسری روایتوں میں اس کی تفصیل ہے، حضور اکرم ﷺ نے پہلے سوال یہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ نبی کریم ﷺ شاید مکہ مکرمہ کے لئے کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے؛ خاموشی اختیار کی، بلکہ یوں کہا ﴿أَللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ أَعۡلَم﴾ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿أَلَیۡسَتِ الۡبَلۡدَةُ؟﴾ جیسے "المدینة" مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ہے، اسی طرح "البلدة" مکہ مکرمہ کا نام ہے ﴿وَھٰذَاالۡبَلَدِالۡأَمِیۡن﴾ حضور نے پوچھا کہ کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید اور کوئی نام تجویز فرمائیں گے جواب میں یہ عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، تو اس پر حضور نے سوال کیا ﴿أَلَیۡـسَ ذُوالۡـحِجَّةِ؟﴾ کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ پھر حضور ﷺ نے پوچھا آج کون سا دن ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے جواب میں عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ تو حضور

نے فرمایا﴿أَلَيْسَ يَوْمُ النَّحْرِ؟﴾ کیا یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ نہیں ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں۔

یہ سوالات کیوں کیے تھے؟ دراصل زمانہ جاہلیت میں بھی جب کہ ابھی اسلام نہیں آیا تھا اور ایمان و اسلام کی وجہ سے لوگوں کی جان و مال کے محفوظ ہونے کا لوگوں کو حکم نہیں ہوا تھا، اور کسی کی جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ نہیں تھیں، اس زمانہ میں بھی ان علاقوں میں یعنی مکہ میں اور اس مہینے میں اور اس دن میں لوگوں کی جان مال، اور عزت و آبرو کا لحاظ کیا جاتا تھا مطلب ہے کہ کوئی آدمی اگر حرم میں آ گیا (ویسے تو یہ لوگ کسی کو بخشتے نہیں تھے اور کسی کی جان اور مال کو نہیں چھوڑتے تھے، مال لوٹ لینا، غلام بنالیا اور قتل کردینا اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈال دینا ان کی عام عادت تھی) تو حرم کی وجہ سے اس کا احترام کیا جاتا تھا، اس کی جان و مال پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا تھا، اسی طریقہ سے حرمت والے چاروں مہینوں میں بھی کسی کو چھیڑا نہیں جاتا تھا، اسی طرح یوم النحر کو بھی بڑا باعظمت سمجھا جاتا تھا۔ تو یہ خاص تین چیزیں ہیں ایک تو مقام یعنی مکہ مکرمہ، دوسرا مہینہ یعنی ذی الحجہ اور تیسرا دن، ان اوقات ان ایام اور ان جگہوں میں جیسے جان و مال کی حرمت ان لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور یہ سمجھتے تھے اس جگہ میں اور اس مہینے میں اور اس دن میں کسی کی جان اور مال پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا ہے، یہ چیز ان کے دل و دماغ میں جمی ہوئی تھی، تو گویا حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں کو تازہ کر کے پھر ان سے کہا کہ جیسے اگر کوئی آدمی دسویں ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں جمع ہو جائے تو کیا اس کی جان اور مال پر ہاتھ ڈالا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں ڈالا جائے گا، تو ایک مسلمان کے اسلام اور ایمان لانے کی وجہ سے اس کی جان، مال اور عزت و آبرو اسی طرح محفوظ ہوگئی جیسے کہ اس شہر میں

اس دن میں اور اس مہینے میں۔

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے ماتحت اس روایت کو لائے چونکہ بتلا رہے ہیں کہ کسی کی حق تلفی یا کسی کے ساتھ زیادتی اور ظلم کرنا حرام ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے جان، مال اور عزت وآبرو کے لئے حرمت کا حکم لگایا کہ ہم کسی کے جان ومال پر شرعی وجہ کے بغیر ہاتھ نہیں ڈال سکتے ہیں۔

﴿أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟﴾ یہ ارشاد فرما کر حضور ﷺ نے ان حضرات صحابہ سے جو اس وقت موجود تھے پوچھا کہ سنو! کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا حکم تم تک پہنچا دیا؟ ﴿قَالُوْا نَعَمْ﴾ اس پر صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں۔ اس پر حضور ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی کر فرمایا ﴿أَللّٰهُمَّ اشْهَدْ﴾ اے اللہ! تو گواہ رہیو کہ یہ لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں نے تیرے احکام ان تک پہنچا دیے۔

﴿میرے بعد تم بھی ایسے نہ بن جانا﴾

آگے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَيْلَكُمْ أَوْ وَيْحَكُمْ أُنْظُرُوْا، لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا﴾ تم پر افسوس ہے، دیکھو! میرے دنیا سے جانے کے بعد کافروں جیسے نہ بن جائیو کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ کافروں کے یہاں ایک دوسرے کی جان ومال اور عزت وآبرو کا کوئی احترام نہیں ہے، وہ ہر ایک پر ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں، تم بھی ایسے نہ بن جانا، بلکہ تمہارے یہاں تو ہر مومن کی جان ومال اور اس کی عزت وآبرو قابل احترام ہے، اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ اب جو آدمی کسی کی حق تلفی کرتا ہے، اور ظلم اور زیادتی کرتا ہے وہ گویا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

﴿جس نے ایک بالشت کے برابر کسی کی زمین ناحق دبالی﴾

٢٠٦. وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ ظَلَمَ قِيْدَ شِبْرٍ مِّنَ الْأَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِيْنَ. متفق عليه..

حضرت عائشہ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایک بالشت کے برابر کسی کی زمین ناحق لے لی، اپنے پڑوسی کی زمین میں سے ایک بالشت کے برابر چھین لی، ناپ میں گڑبڑ کرادی، کورپوریشن والے کو پیسے کھلا کر اپنی طرف کروادی، یا دادا گری کرکے اپنا حق نہیں تھا پھر بھی راستہ میں سے دبالی جیسا کہ عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سزا کے طور پر سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں پہنائیں گے۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ معمولی چیز کی خاطر زمین پر ناحق قبضہ کرلیتے ہیں اور دنیا سے ان کے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کا ناحق قبضہ باقی رہتا ہے، ان کے ورثاء اس کو باقی رکھتے ہیں اور یہ ہمیشہ کے لئے اپنی عاقبت برباد کرتا ہے۔

﴿جب اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے﴾

٢٠٧. وعن أبي موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اِنَّ اللهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ فَاِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ ثُمَّ قَرَأَ "وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ اِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ أَخْذَهُ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ"

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے کو مہلت دیتے ہیں۔ دنیا کے اندر بہت سی مرتبہ لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ظلم و زیادتی کر رہا ہے، تب بھی اس کا کچھ بگڑ نہیں رہا ہے۔ لیکن ایسا دیکھنے کی وجہ سے دھوکے

میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دی جا رہی ہے، اور اس ڈھیل سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے اس ظلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت ہونے والی نہیں ہے۔ سمجھدار لوگوں سے نادانستگی میں ہو جائے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز آجاتے ہیں اور لوگوں کا حق ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

کئی لوگ دوسروں کے حقوق کھا کر اور پیسے یا زمین دبا کر یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہونے والا نہیں ہے، ان کا ایسا سمجھنا غلط ہے، اس لئے کہ دنیا کا دستور یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈھیل دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے آخرت کو مقرر کیا ہے، نیک اعمال کا پورا بدلہ وہیں ملے گا اور برے اعمال کا بدلہ بھی وہیں ملے گا۔ اصل سزا وہیں ہوگی۔ کبھی کبھی دنیا کے اندر اس کے نمونے بتا دیے جاتے ہیں۔

﴿فَاِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْه﴾ جب اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے۔ پھر حضور ﷺ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ اِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ أَخْذَهٗ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے جب اللہ تعالیٰ کسی بستی والوں کو پکڑتا ہے ایسی حالت میں کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی، ظلم وزیادتی کی اور حدود سے تجاوز کیا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت بڑی دردناک اور سخت ہوا کرتی ہے، پھر کوئی چھڑا نہیں سکتا، ساری دنیا مل کر بھی اس کا مداوی نہیں کر سکتی ہے۔

﴿نبی کریم ﷺ کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نصیحتیں﴾

۲۰۸. وعن معاذ رضی اللہ عنہ قال بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فقَالَ: اِنَّكَ تَأْتِيْ قَوْمًا مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ أَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ،فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوالِذٰلِكَ، فَأَعْلِمْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً،تُؤْخَذُمِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّعَلٰى فُقَرَائِهِمْ،فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ،فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ.وَاتَّقِ دَعْوَةَالْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَاوَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ.

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک علاقہ کا حاکم اور امیر بنا کر بھیجا تھا، جس وقت ان کو روانہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ ہدایتیں اور نصیحتیں فرمائی تھیں۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ تم اہل کتاب کی قوم کی طرف جا رہے ہو، یعنی تم جس جگہ جا رہے ہو وہ لوگ اہل کتاب یعنی نصاریٰ اور یہودی ہیں مشرکین میں سے نہیں ہیں (اہل کتاب وہ لوگ ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں) اس لئے جب تم ان کے پاس پہنچو تو پہلے دعوت دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر تمہاری اس دعوت کو وہ لوگ قبول کرلیں تو پھر ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرائض سے بتدریج ان کو واقف کرنا۔ چنانچہ پہلے ان کو نماز کی طرف متوجہ کرنا۔

پھر جب تمہاری اطاعت کرلیں اور ان چیزوں کو بجالائیں تو پھر ان کو بتائیو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غریبوں کو دی جائے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ میں افضل یہی ہے کہ اسی علاقے کے فقیروں کو دی جائے، الّا یہ کہ وہاں ضرورت نہ ہو یا اس کے مقابلہ میں دوسری جگہ کے فقراء زیادہ محتاج ہوں تو پھر دوسری جگہ بھی اس کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔

پھر جب یہ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مال کی زکوۃ میں مویشی اور جانور بھی ہوا کرتے ہیں جو زکوۃ کے طور پر دئے جاتے ہیں۔ تو اس وقت ان کے عمدہ مال کو زکوۃ

کے طور پر لینے سے بچنا۔ مطلب یہ ہے کہ زکوۃ کے طور پر جو جانور وصول کیا جاتا ہے اس کے متعلق احادیث میں تصریح ہے کہ نہ بہت بڑھیا اور عمدہ ہو اور نہ بہت گھٹیا اور کمتر ہو بلکہ درمیانی قسم کا ہو۔ بہت بڑھیا اور عمدہ لیں گے تو صاحبِ مال کے معاملہ میں حق تلفی ہوگی، اور گھٹیا اور کمتر لیں گے تو فقراء کے معاملہ میں حق تلفی ہوگی اس لئے درمیانی قسم کا لیا جائے گا۔ اعلیٰ درجے کا لینا بھی ایک طرح کی زیادتی ہے۔

مظلوم کی بددعا سے بچنا

اور مظلوم کی بددعا سے بچنا اس لئے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوا کرتی ہے۔ گویا مظلوم کی بددعا سیدھی اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچتی ہے، بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن ❁ اجابت از درحق بحر استقبال می آید

مظلوموں کی بددعا سے بچنا کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو قبولیت اس کا استقبال اور سواگت کرنے کے لئے سامنے سے آتی ہے۔ یہاں اس روایت کو اسی لئے پیش کیا ہے۔

تَحْرِيْمُ الظُّلْمِ وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

﴿مجلس ۳﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَاوَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَامَن یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوۡلَانَامُحَمَّداًعَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡماًکَثِیۡراً۔ أمابعد:—

۲۰۹۔ وعن أبی حمیدعبدا لرحمن بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ قال:اِسۡتَعۡمَلَ النَّبِیُّ ﷺ رَجُلا مِنَ الۡأَزۡدِیُقَالُ لَہٗ اِبۡنُ الۡلُّتۡبِیَّۃِعَلیٰ الصَّدَقَۃِ،فَلَمَّاقَدِمَ قَالَ:ھٰذَالَکُمۡ وَھٰذَاأُھۡدِیَ اِلَیَّ،فَقَامَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ عَلیٰ الۡمِنۡبَرِفَحَمِدَاللّٰہَ وَأَثۡنیٰ عَلَیۡہِ ثُمَّ قَالَ:أَمَّابَعۡدُ!فَاِنِّیۡ اسۡتَعۡمِلُ الرَّجُلَ مِنۡکُمۡ عَلیٰ الۡعَمَلِ مِمَّاوَلَّانِیَ اللّٰہُ،فَیَأۡتِی فَیَقُوۡلُ:ھٰذَالَکُمۡ وَھٰذَاھَدِیَّۃٌ أُھۡدِیَتۡ اِلَیَّ،أَفَلاجَلَسَ فِیۡ بَیۡتِ أَبِیۡہِ أَوۡأُمِّہٖ حَتّٰی تَأۡتِیَہٗ ھَدِیَّتُہٗ اِنۡ کَانَ صَادِقاً۔وَاللّٰہِ لایَأۡخُذُأَحَدٌمِّنۡکُمۡ شَیۡئاًبِغَیۡرِحَقِّہٖ،اِلَّالَقِیَ اللّٰہ تَعَالیٰ یَحۡمِلُہٗ یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ،فَلاأَعۡرِفَنَّ أَحَداًمِّنۡکُمۡ لَقِیَ اللّٰہ یَحۡمِلُ بَعِیۡراًلَہٗ رُغَآءٌ،أَوۡبَقَرَۃًلَھَاخُوَارٌ،أَوۡشَاۃً تَیۡعَرُ،ثُمَّ رَفَعَ یَدَیۡہِ حَتّٰی رُوِیَ بِیَاضُ اِبِطَیۡہِ،وَقَالَ: ((أَللّٰھُمَّ ھَلۡ بَلَّغۡتُ)) ثلاثًا۔

لوگوں کے حقوق کوضائع کرنا،حق تلفی کرنااورکسی پرزیادتی کرنے کی حرمت کوبتلایا جارہاہے،اوراگرکسی کاحق ماراہےتواس کواداکرنے کااہتمام کرناچاہیے۔

حضرت ابوحمیدعبدالرحمٰن بن سعدساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نےقبیلہ ازد(یہ عرب کاایک قبیلہ ہے)کےایک آدمی کوصدقات کی وصول یابی کے لئے مقررکیاجس کانام ابن اللتبیہ تھا۔

﴿بیت المال کا اسلامی نظام﴾

اُس زمانہ میں جو لوگ صاحبِ اموال اور صاحبِ نصاب ہوا کرتے تھے، خاص کر جن کے پاس مویشی اور جانور ہوتے تھے اور وہ نصاب کو پہنچے ہوئے ہوتے تھے جن کی زکوۃ ان پر واجب ہوتی تھی، ان کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے اور اسی طرح مالِ تجارت کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے نبی کریم ﷺ کی طرف سے آدمی مقرر کئے جاتے تھے، اور ہر ہر علاقہ میں ان لوگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ وہ حضرات وہاں سے مالوں کی زکوۃ وصول کرکے لایا کرتے تھے۔ یہ ایک نظام تھا کہ زکوۃ حکومت کے بیت المال میں جمع ہو اور پھر وہیں سے مستحقین حضرات کے درمیان تقسیم کی جائے۔ جب اسلامی حکومت ختم ہوگئی اور بیت المال کا نظام مختل ہوگیا تو یہ ساری چیزیں بھی ختم ہوگئیں۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ زکوۃ کی وصولیابی کے لئے اپنی طرف سے مختلف حضرات کو مقرر فرماتے تھے۔ تو ایک صحابی تھے جن کا نام عبداللہ تھا، ابن اللُّتبیہ کے نام سے مشہور تھے۔ بنولتب یہ قبیلۂ ازد کے خاندان کی ایک شاخ ہے۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے کسی علاقہ کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے مقرر فرمایا۔ چنانچہ وہ گئے اور لوگوں سے ان کے مالوں کی زکوۃ وصول کی، اسی دوران کچھ لوگوں نے ان کو ہدیہ کے نام سے بھی کچھ دیا، حالانکہ جس علاقہ میں بھیجے گئے تھے اس علاقہ سے ان کا خاندانی، نسبی یا دوستانہ تعلق نہیں تھا کہ پہلے سے کوئی راہ و رسم، دوستی اور تعلق ہو، جس کی وجہ سے ان سے ہدیہ کے لین دین کا سلسلہ جاری ہو اور اسی بنیاد پر دیا گیا ہو، ایسا نہیں تھا، بلکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ خاص اسی کام کے واسطے ان کو وہاں بھیجا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے ان کو ہدیے دے تھے، ان لوگوں نے اس لئے نہیں دے تھے

کہ ان لوگوں سے کوئی تعلق اور دوستی ہے، بلکہ یہ اس کام کے لئے مقرر کئے گئے تھے، تو جس کام کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تھی اس معاملہ میں ذرا تساہل اور ڈھیل سے کام لیں اور ان کی رعایت کریں، اس لئے یہ ہدیے کا معاملہ ہوا تھا۔

﴿یہ تمہارا؛ اور یہ میرا﴾

جب وہ اس علاقہ سے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس لوٹے تو کچھ مال تو وہ تھا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ تو آپ کا ہے یعنی مجھے جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا اس سلسلے میں وصول کیا گیا مال آپ کے سامنے دیا جا رہا ہے، اور کچھ مال وہ بھی تھا جو انہوں نے الگ سے رکھا تھا جس کے متعلق یہ بتلایا کہ یہ مال لوگوں کی طرف سے مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔

جب حضور ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو نبی کریم ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ دیا جس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور اس کے بعد فرمایا کہ مَیں تم میں سے کسی آدمی کو اپنی طرف سے تجویز کرتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کام میرے حوالے کئے ہیں ان کو وہ انجام دے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ جہاں اللہ کے نبی تھے وہیں آپ حاکم بھی تھے، اور جیسے ایک حاکم کا دائرۂ اختیار ہوتا ہے کہ اس کو بہت سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اربابِ حکومت کی طرف سے کاموں کو انجام دینے کے لئے باقاعدہ اشخاص اور لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے، اسی طرح جو کام اور اختیار اللہ تعالیٰ نے مجھے دے ہیں ان کو انجام دینے کیلئے مَیں تمہیں میں سے بعض لوگوں کو مقرر کرتا ہوں کہ فلاں جگہ صدقات کی وصولیابی کیلئے جاؤ، فلاں جگہ جا کر یہ کام کرو اور فلاں جگہ وہ کام کرو۔ اب جس کو مقرر کیا ہے جب وہ اپنی ڈیوٹی

پوری کر کے واپس آتا ہے۔مثلاً صدقات کی وصولیابی کے لیے مقرر کیا ہے تو وہاں سے جب واپس لوٹتا ہے۔تو یوں کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہے یعنی تم نے جس کام کے لئے بھیجا تھا، اسی مد میں وصول ہوا ہے جو آپ کو دے رہا ہوں، اور کچھ الگ کر کے یوں کہتا ہے کہ یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔

ہدیہ کے نام سے رشوت

پھر حضور فرماتے ہیں کہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھا رہتا تو پتہ چلتا کہ کون ہدیہ دیتا ہے۔ یہ ہدیہ واقعۃً محبت، دوستی اور تعلق کی وجہ سے ملا ہے، تو وہ تو گھر رہتے ہوئے بھی ملتا، ذرا تجربہ کر کے دیکھ لو۔اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہدیہ نہیں ہے بلکہ ہدیہ کے نام سے رشوت دی گئی ہے کہ جو کام سونپا گیا ہے اور ان سے وصولیابی کا جو معاملہ کیا جانے والے ہے اس میں ذرا تساہل اور ڈھیل دی جائے۔

جیسے کوئی انکم ٹیکس آفیسر یا سیل ٹیکس آفیسر کو کوئی دکان والا ہدیہ دے، ساڑی دے، یا کپڑا دے؛ تو وہ ہدیہ کے نام سے ہی دیتا ہے لیکن ظاہر ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ تو اس لئے دے رہا ہے کہ اس سے جو وصولیابی کرنی ہے اس معاملہ میں ذرا رعایت برتی جائے۔

یہاں پر بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا کہ اس کا ہدیہ وہاں پہنچ جاتا اگر اپنی بات میں سچا ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ چیز جو ہدیہ کے نام سے ملی ہے، اگر واقعۃً ہدیہ ہی ہے تو پھر یہ تو میرے اس کام کے لئے مقرر کرنے پر موقوف نہیں تھا اپنے گھر رہتے ہوئے بھی یہ چیز ملتی ہے یا نہیں ہم دیکھتے۔

﴿ناحق چیز اپنے ہی کندھے پر﴾

پھر آئندہ کے لئے ایسے معاملات میں تنبیہ فرماتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی آدمی کوئی چیز ناحق نہ لے، اور اگر ناحق لے گا تو پھر کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایسی حالت میں آئے گا کہ جو چیز ناحق لی ہے وہ اس کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ میدانِ حشر میں وہ چیز اس پر لادی گئی ہوگی اور ساری دنیا دیکھے گی کہ ساڑی اور کپڑے کے تھان لدے ہوئے ہیں، یہ وہی ہوں گے جو ناحق لئے گئے تھے، گویا پورے میدانِ حشر میں اس کے لئے رسوائی کا سامان ہوگا۔

اب ان صحابی کو جن صدقات کی وصولیابی کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تو مویشی یعنی اونٹ گائے، بکری وغیرہ تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہی چیزیں ہدیہ میں بھی دی گئی تھیں، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو میں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل رہا ہے اور وہ اپنے اوپر اونٹ کو اٹھائے ہوئے ہو جو بول رہا ہو ﴿رُغَآءٌ﴾ اونٹ کی آواز کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ اونٹ جو اس پر لادا جائے گا وہ چپ ہوگا۔ اگر چپ رہے تو اس سے زیادہ رسوائی نہیں ہوتی، لیکن وہ اونٹ تو بولے گا اور چلائے گا، لوگ سوچیں گے کہ کہاں سے آواز آرہی ہے؟ جب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ارے دیکھو! اس کے کندھے پر تو اونٹ لدا ہوا ہے، اور وہ ایسی آواز کر رہا ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ کیوں لدا ہوا ہے؟ تو کہا جائے گا کہ اس نے خیانت کی تھی۔

یا وہ اپنے اوپر گائے کو اٹھائے ہوئے ہوگا جو آواز نکال رہی ہوگی۔ یا بکری کو اٹھائے ہوئے ہوگا جو بول رہی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں میدانِ حشر میں اس کے لئے

رسوائی کا سامان ہوں گی۔مطلب یہ ہوا کہ جو چیز کسی نے ناحق اور ظلم کے طور پر لی ہے وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ وہ چیز اس کے اوپر لدی ہوئی ہوگی اور سارے میدانِ حشر کے لوگ اس کو دیکھیں گے۔قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَمَن يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ جس آدمی نے کسی چیز میں خیانت کی، وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے روز لے کر آئے گا۔ ﴿غُلُولٌ﴾ مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں۔اس زمانہ میں جنگ اور لڑائیوں میں دشمن کی طرف سے جو مال حاصل ہوتا تھا، اور تقسیم ہونے سے پہلے کبھی کوئی ایسا کرتا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز لے لی، تو قرآنِ پاک میں کہا گیا کہ جس نے اس طرح خیانت کی ہے وہ اپنی خیانت کی ہوئی اور چرائی ہوئی چیز کو لے کر قیامت کے روز آئے گا، اور سارے لوگ اس کو دیکھیں گے، اور یہی چیز اس کے لئے رسوائی کا سامان ہوگی۔

پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ اتنے اونچے اٹھائے کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور آپ نے تین مرتبہ فرمایا ﴿اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ﴾ اے اللہ! مَیں نے تیرا حکم پہنچا دیا گویا کل کو کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ ہمیں تو یہ مسئلہ معلوم ہی نہیں تھا، ہم نے تو بے خبری میں واقعۃً ہدیہ سمجھ کر ہی قبول کیا تھا۔لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہدیہ کے نام سے جو چیز دی جا رہی ہے وہ درحقیقت ہدیہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح کی رشوت ہی ہے۔

﴿ظالموں کے لئے اپنے کئے کی تلافی کا موقعہ آج ہی ہے﴾

۲۱۰.عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قَالَ:مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ مَظْلِمَةٌ لِّأَخِيهِ،مِنْ عِرْضِهٖ أَوْمِنْ شَيْئٍ،فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَلا دِرْهَمٌ؛إِنْ كَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَمِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهٖ،وَإِن لَّمْ يَكُنْ لَهٗ حَسَنَاتٌ أُخِذَمِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهٖ فَحُمِلَ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اس کے بھائی کا کوئی حق ہے جو اس نے ناجائز طور پر دبا رکھا ہے، یا اپنے بھائی کے ساتھ اس کی عزت و آبرو پر کوئی زیادتی اور ظلم کر رکھا ہے، تو آج ہی اس سے معاف کروالیں، اس سے پہلے کہ نہ دینار ہوگا اور نہ درہم۔ اس دن اگر نیکیاں ہوں گی تو اس نے دوسرے پر جتنا ظلم کیا ہے اسی کے برابر اس کی نیکیاں لے کر اس کو دی جائیں گی، اور اگر نیکیاں نہیں ہیں تو جس کا حق ہے اس کے گناہ لے کر اس پر ڈالے جائیں گے۔

آج ہم دوسرے لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں، دوسروں کے متعلق تہمتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کے درمیان اس کو برا مشہور کرتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کیا۔ یہ درحقیقت اس کی عزت کے اوپر ایک حملہ ہے اور اس کی عزت کے معاملہ میں اس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ حق دلوائیں گے۔

یا مثلاً کسی کا مال لے لیا، کسی کی کوئی اور چیز لے لی، پیسہ دبا لیا، زمین دبالی، کسی کے ساتھ ناحق طریقہ سے معاملہ کیا اور زیادتی کی؛ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بندوں کے جو بھی حقوق ہیں اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کی گئی ہے، آج جب دنیا میں زندہ ہے، اس سے معاف کروالیں۔ ﴿فَلْيَتَحَلَّلْهُ﴾ حلال کروالے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس جا کر معافی مانگ کر اس سے اس حق کو ساقط کروالے۔

﴿قَبْلَ أَنْ لا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَلا دِرْهَمٌ﴾ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جس دن نہ تو دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں مال و دولت اور پیسہ نہیں ہوگا جس کے ذریعہ سے آپ دوسروں کے حقوق کو ادا کرسکیں گے۔ وہاں کا سرمایہ، کرنسی اور وہاں کا سکہ تو نیکیاں ہیں

ایک دانگ کے بدلہ ستر مقبول نمازیں

اگر کسی کو گالی دی تھی اور دنیا میں معاف نہیں کرایا اور معاملہ صاف نہیں کیا، یا کسی پر بہتان لگایا تھا، تہمت لگائی تھی اور دنیا میں اس سے معافی نہیں مانگی، یا کسی کا پیسہ کھالیا تھا، دنیا میں نہ پیسہ ادا کیا اور نہ معاف کرایا؛ یہ سب حقوق والے کل میدان حشر میں اللہ کے حضور فریاد کریں گے۔کوئی کہے گا کہ میرے اوپر تہمت لگائی تھی، کوئی کہے گا کہ مجھے گالی دی تھی، کوئی کہے گا کہ میرے پیسہ لے لئے تھے، کوئی کہے گا کہ میری زمین دبالی تھی، کوئی کہے گا کہ میرے ساتھ یہ زیادتی کا معاملہ کیا تھا۔اب اگر نیکیاں ہوں گی تو اس نے دوسرے کا جتنا حق دبایا ہے دوسرے کے ساتھ جتنا ظلم کیا ہے، جتنی حق تلفی کی ہے، اسی کے برابر اس کی نیکیاں لے کر اس کو دی جائیں گی۔جیسا جیسا حق ہوگا اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

حدیث میں کوئی صراحت اور تفصیل نہیں آئی ہے، لیکن بعض کتابوں میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ہمارے یہاں ایک کتاب ''الاشباہ والنظائر'' پڑھائی جاتی ہے، اس میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے ایک دانگ (درہم جو چاندی کا سکہ ہوتا تھا اس کا چھٹا حصہ) کسی کا حق دبایا ہے تو اس کے بدلہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی ستر مقبول نمازیں حق والے کو دیں گے۔

(الاشباہ والنظائر،۱/۱۶۰)

اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے پاس اتنی نیکیاں نہیں ہوں گی، یا نیکیاں تو تھیں لیکن بعض حق والوں کا حق ادا کرنے میں پوری ہوگئیں اور حق والے ابھی باقی ہیں اور نیکیاں نہیں رہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کا حق ہے اس کے گناہ لے کر اس پر ڈالے جائیں گے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا اہتمام

باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ کسی کا کوئی حق ہے تو اس کو موت سے پہلے پہلے ادا کرنے یا معاف کروانے کا اہتمام کیا جائے، خدا نہ کرے خدا نہ کرے اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو قیامت میں سارا معاملہ بھگتنا پڑے گا۔

غور کیجئے کہ خود نبی کریم ﷺ اس کا کتنا اہتمام فرماتے تھے، روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ کسی کا کوئی مالی حق میرے اوپر ہے، تو مَیں یہاں کھڑا ہوں، وہ بتلا دے، مَیں اس کا مالی حق ادا کر دوں گا۔ یا مَیں نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو وہ اپنا بدلہ لے لے۔ (المعجم الاوسط، ۲۶۲۹)

بہر حال! لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں آج کل بہت زیادہ کوتاہی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ کسی کا حق مارنا عیب کی چیز رہی ہی نہیں ہے، لوگ بڑی جرأت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ بلکہ بعضوں کو جب کہا جاتا ہے کہ قیامت میں حساب کتاب دینا ہے، تو کہہ دیتے ہیں کہ ہاں ہاں! ہم وہاں حساب دے دیں گے۔ ایسی جرأت کی باتیں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور توفیق دے کہ ہم ان حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔

تَحْرِيمُ الظُّلْمِ وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

﴿مجلس ۴﴾

۲۵/صفر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۰/ جون ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد:

۲۱۱. عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ. وَالْمُھَاجِرُمَنْ ھَجَرَمَانَھٰی اللّٰہُ عَنْہُ. (متفق علیہ)

﴿حدیثِ باب اوراس کی تشریح﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا تھا ﴿باب تحریم الظلم﴾ یعنی کسی کے حق مارنے کا حرام ہونا اور اگر کسی کا کوئی حق مارا ہے تو اس کا حق واپس کرنا ضروری ہے، یا صاحبِ حق سے اس حق کو معاف کرالینا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذارسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسلام لفظ کا مادّہ ﴿س،ل،م﴾ ہے جس کا ترجمہ سلامتی اور امن ہوتا ہے، گویا جس آدمی نے اسلام قبول کیا اور وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے تو اس کی زبان کا خاصہ اور اس کا عمل یہ ہونا چاہیے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

یہاں زبان اور ہاتھ کو خاص طور سے ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

دوسرے اعضاء کے ذریعہ سے تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے، بلکہ عام طور پر ایک انسان دوسرے کو جو ایذا پہنچاتا ہے اس میں انہیں دو اعضاء کو استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو خاص طور پر ذکر کیا، ورنہ مقصود یہ ہے کہ جس کی ایذا رسانیوں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں، ایسا آدمی حقیقی معنٰی میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

اور اس میں بھی زبان کو خاص طور پر مقدم کیا، اس لئے کہ زبان کا ایذا پہنچانے کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی زبان سے ایذا پہنچائی جاسکتی ہے، اور جو موجود نہیں ہیں ان کے متعلق بھی غیبت یا بہتان یا گالی گلوچ کی شکل میں یا دوسرے طریقوں سے ایذا رسانی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سے زندوں پر بھی کی جاسکتی ہے اور مردوں پر بھی کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ دنیا سے جاچکے ہیں اور قبر میں پہنچ چکے ہیں ان پر بھی بعض مرتبہ آدمی اپنی زبان سے کلام کر دیتا ہے مثلاً اس کا باپ ایسا تھا، فلاں ایسا تھا۔ اور جب ان پر کلام کرے گا تو اس کی وجہ سے زندوں کو بھی تکلیف پہنچے گی۔

عکرمہ بن ابی جہل بارگاہِ نبوت میں

اسلام تو اس معاملہ میں اتنا حساس ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر جب مکہ والوں کو عام معافی عطا فرمائی تھی، اس وقت مردوں میں سے گیارہ اور عورتوں میں سے چار اس طرح کل پندرہ اشخاص ایسے تھے جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا تھا ان کے لئے معافی نہیں ہے، انہیں میں سے ایک عکرمہ بن ابی جہل تھے۔ مکہ فتح ہونے پر وہ شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے، انہوں نے ارادہ کیا کہ جزیرۃ العرب ہی کو چھوڑ دوں، چنانچہ وہ یمن کے ساحل پر پہنچ کر کشتی پر سوار ہوئے، جب کشتی چلی تو بھنور میں پھنسی، اس وقت وہ لات وعزیٰ کو

پکارنے لگے۔کشتی والوں نے کہا کہ لات وعزی یہاں کام نہیں دیں گے،اللہ کو پکارو۔ یہ کہنے لگے کہ اگر سمندر کے اندر نجات دینے والا اللہ ہی ہے،تو خشکی میں بھی نجات دینے والا وہی ہے،لہٰذا پھر تو ہر وقت اسی کو پکارنا چاہیے۔اسی وقت انہوں اپنے جی میں یہ طے کرلیا کہ اگر مَیں اس مصیبت سے نجات پا گیا تو اللہ پر ایمان لے آؤں گا۔ چنانچہ اس سے نجات ملی کشتی والے کنارے پر آ گئے۔

ان کی بیوی اُم حکیم تھیں،ادھر وہ ایمان لے آئی تھیں اور نبی کریم ﷺ کے پاس اپنے شوہر کے لئے امان کی درخواست کی کہ ان کو امان دی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: ٹھیک ہے ان کو ہماری طرف سے امان ہے۔گویا ان کے متعلق جو اعلان ہوا تھا وہ حکم نبی کریم ﷺ نے واپس لے لیا۔جب امن دے دیا گیا تو ان کی بیوی ان کو تلاش کرنے کے لئے چلی۔معلوم تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور ان کا ارادہ یمن کی طرف جانے کا ہے۔وہاں ان سے ملاقات کی۔ بیوی نے کہا کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کے لئے امان حاصل کرلی ہے، لہٰذا آپ واپس چلئے اور ایمان لے آیئے۔چناچہ وہ واپس آنے لگے۔راستے میں انہوں نے چاہا کہ بیوی سے صحبت کریں،تو بیوی نے انکار کردیا اور کہا تم کافر ہو اور مَیں مسلمان ہوں۔ اس پر انہوں نے سوچا کہ کوئی بڑی بات ہے جو اس کو اس تنہائی میں بھی مجھے صحبت پر قدرت دینے سے روک رہی ہے۔اس سے اسلام کی اہمیت ان کے دل میں اور بڑھ گئی۔

خیر!وہ ان کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں۔میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس وقت وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچنے والے تھے،تو ان کے آپ کی مجلس میں پہنچنے سے پہلے حضور ﷺ نے حاضرین مجلس سے یوں کہا کہ عکرمہ آرہے ہیں،ان کے باپ کو

بُرا بھلامت کہنا، کیونکہ مردوں کو برا بھلا کہنے سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

حالانکہ ان کا باپ کون ہے یہ ساری دنیا جانتی ہے اور اس کا کفر پر مرنا بھی سب کو معلوم ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور جس کو حضور ﷺ نے اس امت کا فرعون کہا ہے اس کے متعلق حاضرین مجلس کو آپ ﷺ منع فرما رہے ہیں کہ اس کی برائی مت کرنا، اس لئے کہ اگر تم اس کی برائی کروگے تو وہ تو دنیا سے جا چکا ہے اور اپنے اعمال کا پھل بھگت رہا ہے، لیکن اس کی برائی کی وجہ سے زندوں کو تکلیف ہوگی، اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

(اسد الغابہ فی ترجمۃ عکرمہ بن ابی جہل)

زبان سے ایذا رسانی کا دائرہ وسیع ہے

تو کسی مسلمان کو زبان سے تکلیف پہنچانے کا دائرہ ہاتھ کے ایذا پہنچانے کے دائرہ سے وسیع ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہاتھ سے ایذا پہنچانے کے لئے تو آدمی کے اندر بھی کچھ ہمت وطاقت اور گٹز (Guts) ہونے چاہئیں، ہر کس وناکس پر تو آپ ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے، بلکہ سامنے والے کو ذرا دیکھنا پڑے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ سیر کا کوئی سوا سیر مل جائے، جبکہ زبان سے کچھ کہنے کے واسطے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے، کمزور آدمی بھی قوت والے کے سامنے زبان تو ہلا دیتا ہے، اور غائبانہ تو سب ہی بولتے ہیں۔ اس لئے زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا اور فرمایا کہ حقیقی معنٰی میں مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

یہاں دوسرے مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفار کو تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے، بلکہ وہ کفار جو جزیہ دے کر دار الاسلام میں شہری ہونے کے حیثیت سے رہتے ہیں ان کے متعلق قرآن وحدیث اور کتابوں میں صراحت موجود ہے کہ جان ومال،

عزت وآبرو کی حفاظت کے اعتبار سے ان کا بھی وہی رتبہ ہے جو ایک مسلمان کا ہے۔اس لئے جو حکم مسلمانوں کے لئے ہے؛ وہی حکم ان کفار کے لئے بھی ہے۔ہاں! جن کے ساتھ لڑائی ہے،ان کا معاملہ البتہ الگ ہے۔

بہر حال! یہاں یہ روایت اسی نسبت سے لائے ہیں کہ دیکھو! اس باب کا عنوان ظلم کے حرام ہونے کا قائم کیا تھا،اور کسی کو زبان سے تکلیف پہنچانا، یا ہاتھ سے تکلیف پہنچانا؛ یہ بھی ظلم کا ایک شعبہ ہی ہے،اور اسی کے متعلق نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

﴿حقیقی معنٰی میں مہاجر کون؟﴾

اس حدیث کا دوسرا جزو ہے ﴿وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللهُ عَنْهُ﴾ حقیقی معنٰی میں ہجرت کرنے والا وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما رکھا ہے۔

"مُهَاجِر" عربی زبان کا لفظ ہے جو ہجرت سے بنا ہے ﴿هَجَرَ،يَهْجُرُ﴾ کا اصل معنٰی ہے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ہجرت کہتے ہیں کہ آدمی اپنے وطن کو یا کسی ایسی جگہ کو جہاں رہ کر دین پر کما حقہٗ عمل نہیں کرسکتا ہو چھوڑ کر دوسری ایسی جگہ میں منتقل ہو جائے جہاں پر اطمینان کے ساتھ دین پر پورے طور پر عمل کر سکے۔مثلاً آپ جہاں آباد ہیں وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے،روزہ رکھنے کی اجازت نہیں،دین پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔آج کل تو ایسا بہت ہی کم ہو گیا ہے،جو لوگ اسلام کے کھلم کھلا دشمن ہیں ان کے علاقے میں اور وہاں کے اسٹیشن پر جا کر بھی اگر آپ نماز پڑھنا چاہیں تو کوئی منع نہیں کرتا۔

بہر حال! اگر کوئی علاقہ ایسا ہے جہاں اس طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور آدمی اسلامی احکام کو بجا نہیں لاسکتا اور فرائض کو ادا نہیں کرسکتا؛ تو ایسے مسلمان کو شریعت کی

طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسے علاقے کو چھوڑ کر دوسرے ایسے علاقے میں رہائش اختیار کرلے جہاں فرائض اسلامیہ پر امن اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکے۔

ابتدائے اسلام میں مکہ پر کفار کا قبضہ تھا اور ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا اور وہاں جو آدمی ایمان لاتا اس کیلئے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ جانا ضروری تھا بلکہ ایمان کا ایک جزو تھا، اس لئے کہ وہ مکہ میں رہتے ہوئے اسلامی احکام پر عمل نہیں کرسکتا تھا۔ بعد میں جب مکہ فتح ہوا اور مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اب یہ بات نہیں رہی، اس لئے اب تو یہاں رہ کر بھی پورے طور پر اسلامی فرائض پر عمل ہوسکتا تھا، لہٰذا ہجرت والا حکم جو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لئے تھا وہ ختم ہوگیا۔ اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے ﴿لاھِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ﴾ (بخاری ۲۷۸۳) فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ یعنی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جو ہجرت کی جاتی تھی وہ باقی نہیں رہی، لیکن دنیا میں کسی اور علاقے میں رہتے ہوئے آدمی کے لئے اسلامی احکام پر عمل کرنا دشوار ہو تو اس علاقے کو چھوڑ کر دوسرے ایسے علاقے کی طرف منتقل ہونا جہاں وہ آسانی کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل کر سکے؛ یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ اور یہ ہجرت قیامت تک باقی رہے گی۔ حدیثِ پاک میں ہے ﴿لاتَنْقَطِعُ الْھِجْرَۃُ حَتّٰی تَنْقَطِعَ التَّوْبَۃُ (ابوداؤد، ۲۴۸۱)﴾ ہجرت ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ توبہ ختم ہوجائے گی یعنی توبہ کا دروازہ جب بند ہوگا وہاں تک ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ دوسری ہجرت ہے۔

بہرحال! اس روایت کا دوسرا ٹکڑا یہی ہے ﴿وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَانَھٰی اللّٰہُ عَنْہُ﴾ یہ ہجرت اسی لئے کی جاتی ہے کہ ایک خطے میں رہ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر پورے طور پر عمل نہیں کرسکتا تھا اس لئے وہ دوسرے علاقے میں جاتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

اگر کوئی آدمی ظاہری طور پر زمین کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے کی طرف منتقل ہوا، لیکن باطنی طور پر اس نے اپنے آپ کو اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا عادی نہیں بنایا اور جن چیزوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے، ان کو نہیں چھوڑا، تو یہ ہجرت کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ ظاہری طور پر زمین کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف منتقل ہونا یہ اصل مقصود نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود تو شریعت پر عمل ہے۔

ایک چادر کی خیانت جہنم میں جانے کا سبب بنی

۲۱۲. وعنہ رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ عَلیٰ ثَقَلِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم رَجُلٌ یُقَالُ لَهٗ کِرْکِرَةُ، فَمَاتَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم هُوَفِی النَّارِ. فَذَهَبُوْا یَنْظُرُوْنَ اِلَیْهِ، فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ کسی سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نگرانی کے لئے ایک صاحب مقرر تھے، جن کو ''کرکرہ'' کہا جاتا تھا، جب ان کا انتقال ہو گیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے متعلق فرمائیں کہ یہ جہنمی ہے تو لوگ سوچنے لگے کہ کیوں جہنمی ہے؟ جب لوگوں نے اس کا سامان دیکھا اور اس کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے ایک چادر ملی جو اس نے مالِ غنیمت میں سے چرائی تھی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے۔ مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز اگر لی جائے تو چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو؛ حرام ہے۔ اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اس حرام فعل کے ارتکاب کی وجہ سے جہنم میں ہے۔

اب بات یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا اس لئے اپنے گناہ کی سزا بھگت کر ایک وقت آئے گا کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اس روایت کو پیش کر کے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ایک چادر جو

ناحق طریقہ سے اس نے لی تھی اس کے لئے جہنم میں جانے کا سبب بنی۔لہٰذا کسی بھی ایسے ناحق فعل کے بچنا نہایت ضروری ہے۔

۲۱۳۔اس کے بعد والی روایت حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث رضی اللہ عنہ کی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ والی ہے، پہلے بھی دو تین مرتبہ آ چکی ہے،اور اس کی پوری تفصیل وہاں بیان کی جا چکی ہے؛اس لئے اس روایت کو چھوڑ رہا ہوں۔

﴿جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا حق ہضم کرنے پر وعید﴾

۲۱۴.وعن أبی أمامۃ ایاس بن ثعلبۃ الحارثی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِہٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ.فَقَالَ رَجُلٌ:وَاِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟فَقَالَ:وَاِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِّنْ اَرَاکٍ.

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ ناحق طریقے سے دبالے،تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم واجب کردی اور اس پر جنت میں داخلہ حرام کردیا،کسی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول!چاہے معمولی چیز ہو؟تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چاہے پیلو کی لکڑی ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے ایک مسئلہ سمجھ لیجئے کہ شریعت کا حکم یہ ہے اگر کسی نے کسی دوسرے کی کوئی چیز چھین لی اور غصب کر کے رکھ لی،مثلاً آپ کی گھڑی کسی نے چھین لی،اور آپ حاکم کے پاس جا کر یہ دعوی دائر کریں کہ اس نے میرے گھڑی چھین لی ہے، مجھے دلوائی جائے۔تو حاکم اس کو بلائے گا جس کے خلاف آپ دعوی پیش کررہے ہیں اور آپ کے اس دعوے پر حاکم

اس مدعیٰ علیہ سے مطالبہ کرے گا کہ یہ آپ کے متعلق جو دعویٰ کر رہے ہیں وہ درست ہے؟ اگر مدعیٰ علیہ کہے کہ ٹھیک ہے تو قاضی اس سے کہہ دے گا کہ اس کو واپس دے دو۔اس نے اپنے جرم کا اور اس کے حق کا اقرار کر لیا لہٰذا قاضی اس کو دلوا دے گا۔اور اگر نہیں دے گا تو قاضی جبراً قوت کے زور سے اس کو دلوائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کہے کہ نہیں! یہ گھڑی اس کی نہیں ہے بلکہ یہ تو میری ہے، تو اس صورت میں قاضی مدعی سے مطالبہ کرے گا کہ آپ اس بات پر گواہ پیش کیجیے کہ یہ گھڑی آپ کی ہے اور اس نے آپ کے پاس سے چھین لی ہے۔اب مدعی کو شرعاً دو گواہ پیش کرنے ضروری ہیں جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ گھڑی آپ کی ہے۔اب جو لوگ واقف ہیں کہ یہ گھڑی آپ کی ہے، وہ آپ کے حق میں گواہی دے سکتے ہیں۔اگر آپ نے گواہ پیش کر دیئے اور گواہوں سے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا کہ یہ چیز میری ہے تو اس صورت میں قاضی فیصلہ کر دے گا اور وہ چیز آپ کو دلوا دے گا۔

اور اگر آپ یوں کہیں کہ میرے پاس اس بات کے گواہ تو نہیں ہیں لیکن یہ گھڑی میری ہی ہے، تو اب قاضی اس سے--یعنی جس کے خلاف آپ نے دعویٰ کیا ہے اور جس کے پاس ابھی گھڑی ہے--مطالبہ کرے گا اور اس سے کہے گا کہ قسم کھا کر کہو کہ یہ گھڑی اس کی نہیں ہے بلکہ تمہاری ہے۔اس سے قسم کھلوائے گا۔اگر اس نے قسم کھا لی تو قاضی اس گھڑی کا اسی کے حق میں فیصلہ کر دے گا۔اب گھڑی آپ کو نہیں دلوائے گا۔اس لئے کہ آپ تو اپنا دعویٰ ثابت نہیں کر سکے، اور دعویٰ ثابت کئے بغیر تو کوئی فیصلہ ہو نہیں سکتا۔اور ابھی اس وقت قبضہ اس کے ہاتھ میں تھا، اس لئے قبضہ ہونے کی وجہ سے اس کا پہلو مضبوط تھا اور قسم اس کو کھلائی

گئی اور اس نے قسم کھالی۔

تو بہر حال! یہاں گھڑی آپ کی ہونے کے باوجود اس نے قسم کھائی ہے۔اس لئے کہ اگر وہ قسم نہ کھاتا تو پھر یہ چیز مالک کو دلوادی جاتی،لیکن اس نے قسم کھا کر اس دعویٰ کو جو اصل مالک نے اس پر کیا تھا رد کر دیا۔گویا یہ جھوٹی قسم ہوئی۔تو یہ جھوٹی قسم ایک مسلمان کے مال کو ناحق طریقے سے غصب کرنے کا ذریعہ بنی۔اسی کی فرماتے ہیں ﴿مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِہٖ﴾ جو آدمی کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ سے دبالے۔

﴿فَقَدْ أَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ النَّارَ﴾ اب چاہے دنیا میں اس کی جھوٹی قسم کی وجہ سے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور یہ چیز اصل مالک کو نہیں دِلوائی،لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس نے جو جھوٹی قسم کھا کر کوئی چیز اپنے پاس دبالی ہے،تو اس نے اپنے لئے جہنم واجب کر لی ﴿وَحَرَّمَ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ﴾ اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کر دے گا۔

دیکھو! یہاں اس چیز کی کوئی تعیین نہیں کی ہے کہ کتنی قیمت کی ہو کہ ۶۰/روپے کی ہو یا ایک لاکھ کی ہو،یا دس لاکھ کی ہو،یا دو پیسے کی چیز ہو۔ایک عام بات بیان فرمائی ہے ﴿حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ﴾ کسی مسلمان کا حق اس نے اپنی جھوٹی قسم کی وجہ سے لے لیا۔اس میں اتنا عموم ہے کہ چاہے قیمتی ہو یا معمولی درجہ کی ہو۔لہٰذا جو لوگ اس طرح دوسروں کی معمولی معمولی چیزوں پر ناحق طریقہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور قسمیں کھا کر ان دعوؤں کو رد کر دیتے ہیں،ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ کتنا خطرناک سودا کر رہے ہیں۔دو پیسے کی چیز لے کر جہنم خرید رہے ہیں اور جنت کو اپنے اوپر حرام کر رہے ہیں۔

﴿فَقَالَ رَجُلٌ: وَاِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟﴾ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا اس

کا معنیٰ اور مفہوم تو عام تھا، پھر بھی ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے جو ارشاد فرمایا کہ کسی نے کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ سے دبا لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم واجب کر دیتا ہے اور جنت کو حرام کر دیتا ہے، تو چاہے وہ چیز معمولی سی دو پیسے کی ہو تب بھی؟ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَاِنْ كَانَ قَضِيْباً مِنْ أَرَاكٍ﴾ چاہے پیلو کی ایک لکڑی ہو، اگر وہ بھی قسم کھا کر ناحق دبالی ہے کہ تو اس پر اللہ تعالیٰ جہنم کو واجب کر دے گا اور جنت کو حرام کر دے گا۔ اس میں اتنا عموم ہے، اب اس کے بعد آگے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ معمولی معمولی چیزوں کے اندر تو زیادہ کچھ نہیں ہوتا، اوران کی نگاہ میں اس کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں ہوتی، حالانکہ یہ معمولی چیزیں ہی آدمی کو ہلاک کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کے حقوق کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ آدمی کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں اگر اپنا کچھ چھوڑنا پڑتا ہو تو چھوڑ دے، لیکن کسی کی کوئی چیز ناحق اپنے پاس نہیں آنی چاہیے۔ اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے﴾

۲۱۵. وعن عدی بن عمیرة رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلٍ، فَكَتَمَنَا مِخْيَطاً فَمَا فَوْقَهُ، كَانَ غُلُوْلاً يَأْتِيْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ أَسْوَدُ مِنَ الْأَنْصَارِ، كَأَنِّيْ أَنْظُرُ اِلَيْهِ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِقْبَلْ عَنِّيْ عَمَلَكَ، قَالَ: وَمَالَكَ؟ قَالَ: سَمِعْتُكَ تَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: وَأَنَا أَقُوْلُهُ الْآنَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَلْيَجِئْ بِقَلِيْلِهٖ وَكَثِيْرِهٖ، فَمَا أُوْتِيَ مِنْهُ أَخَذَ، وَمَا نُهِيَ عَنْهُ اِنْتَهٰى. (رواه مسلم)

حضرت عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے کسی کو کسی کام کے لئے مقرر کیا جائے (جیسا کہ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اُس زمانہ میں صدقات کی وصولیابی کے لئے عامل مقرر کئے جاتے تھے) تو اس کو جو ڈیوٹی اور ذمہ داری حوالے کی گئی تھی اس میں سے ایک سوئی چھپا دی، یا (چھوٹا ہونے میں) اس سے بڑھ کر، یعنی سوئی سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز چھپائی۔ شراح نے ﴿فَمَا فَوْقَهُ﴾ کا مطلب یہی لکھا ہے کہ سوئی یا اس سے بھی کم قیمت کی کوئی چیز ہو۔ تو یہ ایک طرح کی خیانت ہے، قیامت کے دن وہ اس کو لے کر آئے گا۔

اس روایت کو نقل کرنے والے صحابی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر ایک انصاری سیاہ فام، کالے رنگ کا آدمی کھڑا ہوا۔ راوی کہتے ہیں گویا اس وقت میں اس کو دیکھ رہا ہوں یعنی وہ منظر میری آنکھوں میں بالکل تازہ ہے، یوں سمجھئے کہ اب تک میرے دل و دماغ میں وہ آدمی ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے جو ڈیوٹی میرے حوالے کی تھی اس کو واپس قبول فرمالیں یعنی میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر ہوں، چاہتا ہوں کہ آپ اس کو واپس لے لیں۔ کیونکہ آپ نے بہت بڑی وعید سنائی کہ جو کام حوالے کیا گیا اور اس کی ادائیگی میں اور اس کا حساب دینے میں ہمارے پاس کوئی سوئی یا اس سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز رہ گئی تو وہ خیانت میں شمار ہوگئی اور اس کو بھی قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ اب کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی چیز ادھر ادھر گر گئی اور وہ نہیں پہنچی، اس لئے وہ آدمی کہتا ہے کہ آپ نے جو ذمہ داری دی ہے؛ مہربانی کر کے واپس لے لو۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ کیوں واپس کر رہا ہے؟ تو وہ آدمی کہتا ہے کہ اللہ کے رسول! مَیں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم کسی کو کوئی کام حوالے کریں اور پھر اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اور اس کا حساب وکتاب دینے میں وہ اگر ایک سوئی یا اس سے کم مقدار میں بھی خیانت کرے گا؛ تو قیامت کے دن اس کو لے کر آئے گا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! بالکل میں نے یہ کہا ہے اور تو ذمہ داری واپس کر رہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مَیں نے جو بات کہی ہے اس میں کچھ چھوٹ چھاٹ دوں گا، بلکہ اب بھی مَیں یہی کہتا ہوں کہ ہم اگر کسی کو کوئی ڈیوٹی حوالے کریں، تو جب وہ ہمارے پاس اس کام کو انجام دینے کے بعد واپس آئے، یا ذمہ داری واپس کرے تو اس کا حساب وکتاب، کم وبیش جتنا بھی ہو، قلیل ہو یا کثیر ہو، کم ہو یا زیادہ ہو؛ پورے پورا دینا ضروری ہے۔

ہاں! حساب وکتاب کے بعد اگر اس کو کوئی چیز دی دے جائے؛ تو لے لے، اور جو نہ دی جائے؛ نہ لے۔ لیکن حساب وکتاب تو پورا دینا پڑے گا۔

﴿تمام ذمہ داریاں امانت ہیں﴾

اس بات میں عموم ہے، نبی کریم ﷺ اپنے زمانہ میں کوئی کام حوالے کرتے تھے وہ بھی اس میں شامل ہے اور آج کل عوامی کام کی جتنی بھی ذمہ داریاں جس پر بھی عائد کی جاتی ہیں یا خصوصی طور پر جو ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں؛ وہ سب اس میں داخل ہیں۔ مثلاً مسجد کا کام کسی کے حوالے کیا، مدرسے کا کام کسی کے حوالے کیا، انجمن کا کام حوالے کیا، کسی سوسائٹی کا کام حوالے کیا، اس طرح کے جتنے بھی کام ہیں؛ سب میں یہ بات عائد ہوتی ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی فرم میں، کسی فیکٹری میں، کسی کمپنی میں ملازم ہے اور اس

کمپنی کی طرف سے اسی طرح کی کوئی ڈیوٹی اس کے حوالے کی گئی ہو کہ مثلاً ہماری وصولی (ઉઘરાણી) کر کے لاؤ، یا اور کوئی کام سپرد کیا ہو؛ تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

جو بھی کام کسی کے حوالے کیا جاتا ہے، وہ امانت کے قبیل سے ہے۔ اگر وہ اس کے اندر ایک سوئی یا اس سے کم درجہ کی چیز کو چھپائے گا تو وہ خیانت میں داخل ہے اور ﴿وَمَن يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ جو آدمی خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ پہلے بھی یہ بات آ چکی ہے۔ اس لئے جس کے پاس جس نوعیت کی ذمہ داری ہو، اس کی ادائیگی میں ذرّہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، اور اگر خدانخواستہ کوتاہی ہوئی ہے تو اس کی تلافی ضرور کر لے۔

﴿انفرادی معاملہ تو آسان ہے لیکن......﴾

اب اگر شخصی معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہو تو تلافی آسان ہے، لیکن اگر اجتماعی معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو پھر معاملہ گمبھیر ہے۔ جیسے آپ کسی فیکٹری میں کسی سیٹھ کے یہاں کام کرتے ہیں اور ملازم ہیں، اس نے آپ کو کوئی کام حوالے کیا تھا اور آپ سے کوتاہی ہوئی، تو ہاتھ جوڑ کر سیٹھ سے معافی مانگ لو کہ صاحب! معاف کر دو، دو چار پیسے کا معاملہ ذرا اِدھر اُدھر ہو گیا تھا، اگر اس نے معاف کر دیا تو معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ لیکن کسی مسجد یا مدرسہ کا حساب و کتاب آپ کے پاس ہے، یا کسی اجتماعی کام کی ذمہ داری ہے جس میں عوام کے پیسے آتے ہیں، امیر غریب، چھوٹے بڑے؛ سب شریک ہوں، کہ کوئی ایک روپیہ دیتا ہے، کوئی دو روپیہ دیتا ہے، کوئی لاکھ دیتا ہے اور کوئی دو لاکھ بھی دیتا ہے۔ ایسے معاملات میں ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ بڑے حضرت رائپوری شاہ عبد الرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا کرتے تھے کہ

''مدرسوں کے مال میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے''۔

مدرسہ کی تو ایک مثال دی ہے، لیکن ایسے جتنے بھی اجتماعی کام ہوتے ہیں، جس میں عام چندہ آتا ہے، اس میں بڑا ڈر لگتا ہے۔ اس لئے کہ کسی ایک آدمی کا پیسہ ہو اور وہ معاف کردے تو معاملہ صاف ہوجاتا ہے، لیکن اجتماعی کام میں کس سے معاف کرائیں گے۔ مدرسہ کا مہتمم، مدرسہ کی کمیٹی اور شوریٰ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوگا۔ وہ لوگ اگر مدرسہ کے مفاد کے پیشِ نظر اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چشم پوشی کرلیں؛ اور مدرسہ کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر انہوں نے کچھ کیا ہے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی معافی ہوجائے، لیکن جس نے گڑبڑ کی ہے اس کی تو معافی نہیں ہوگی، اس لئے کہ جن کا پیسہ ہے وہ تو نامعلوم افراد ہیں۔ لہٰذا عوامی جتنی ذمہ داریاں ہیں ان میں معاملہ اور زیادہ گمبھیر ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

معمولی خیانت شہادت جیسی قربانی کو ضائع کردیتی ہے

۲۱۶. وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ، وَفُلَانٌ شَهِيدٌ، حَتّٰى مَرُّوا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ كَلَّا إِنِّي رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ فِي بُرْدَةٍ غَلَّهَا - أَوْ عَبَاءَةٍ.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے دن صحابہ کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ فلاں فلاں شہید ہوگئے، یہاں تک کہ شمار کرواتے ہوئے ایک آدمی کے بارے میں عرض کیا کہ فلاں بھی شہید ہوگیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں! اس کو تو میں نے جہنم میں دیکھا ہے، اس لئے کہ اس نے

ایک ٹاٹ کی خیانت کی تھی۔ایک روایت میں چادر کا تذکرہ ہے۔

معلوم ہوا کہ اجتماعی اموال میں سے معمولی خیانت بھی شہادت جیسی قربانی کو ضائع کردیتی ہے،اس لئے اس بات کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔اوپر بھی اسی طرح کی ایک روایت گذر چکی ہے۔

تَحْرِيمُ الظُّلْمِ وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

مجلس ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد:—

۲۱۷. عن أبی قتادۃالحارث بن ربعی رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَامَ فِیْھِمْ،فَذَکَرَ لَھُمْ اَنَّ الْجِھَادَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰہِ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ.فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ:یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ،تُکَفَّرُعَنِّیْ خَطَایَایَ؟فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :نَعَمْ!اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَأَنْتَ صَابِرٌمُحْتَسِبٌ،مُقْبِلٌ غَیْرُمُدْبِرٍ،ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : کَیْفَ قُلْتَ؟ قَالَ:أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، أَتُکَفَّرُعَنِّیْ خَطَایَایَ؟فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :نَعَمْ!وَأَنْتَ صَابِرٌمُحْتَسِبٌ،مُقْبِلٌ غَیْرُمُدْبِرٍاِلَّاالدَّیْنَ،فَاِنَّ جِبْرَئِیْل قَالَ لِیْ ذٰلِکَ.

﴿شہادت کی فضیلت کے حصول میں دَین رکاوٹ ہے﴾

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے واسطے صحابہ کے درمیان کھڑے ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تقریر میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو بتلایا کہ اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے واسطے جہاد کرنا تمام اعمال میں سب سے افضل اور بڑے عمل ہیں۔جب آپ نے یہ بات ارشادفرمائی تو ایک آدمی سوال کرنے کے واسطے کھڑا ہوااوراس نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ نے یہ باتیں بتلائیں کہ اگر میں اللہ کے راستے میں نکلا اور شہید کردیا گیا تو کیا اس شہادت کی وجہ سے میرے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے؟اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشادفرمایا کہ جی ہاں!اگر تو اللہ کے راستہ

میں اس طرح شہید کیا جائے کہ تو جنگ کے دوران صبر سے کام لینے والا ہے اور اللہ سے اپنے اس عمل پر ثواب کی اُمید بھی رکھتا ہے، ﴿مُحتَسِبٌ﴾ یعنی اللہ کے واسطے یہ عمل کر رہا ہے، ریاء اور دکھلاوے کے واسطے نہیں کر رہا ہے، ﴿مُقبِلٌ غَیرُ مُدْبِرٍ﴾ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ لڑائی کے میدان میں تو آگے بڑھ رہا ہو، پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ رہا ہو۔ یعنی اگر کوئی آدمی لڑائی کے میدان سے بھاگ رہا ہے اور پیچھے سے دشمن کے وار نے اس کو ختم کیا ہے تو اس کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ آگے بڑھتے ہوئے، پیٹھ دکھائے بغیر اگر تجھے شہادت کا یہ مقام میسر ہوا اور اس میں بھی اللہ کے واسطے یہ عمل کیا تھا، جم کر صبر سے کام لیتے ہوئے لڑ رہا تھا؛ تو تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

حضرت ابوقتادہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب دے چکنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے اس آدمی سے پھر سے پوچھا کہ تم نے کیا کہا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر اس درمیان میں وحی اتری تھی اور وحی کے ذریعہ سے حضور ﷺ کو کوئی اور بات بتلائی گئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے ان صحابی کو جنہوں نے یہ سوال کیا تھا اور جس کا آپ جواب دے چکے تھے پھر سے پوچھا کہ تم نے کیا پوچھا تھا؟ انہوں نے اپنا سوال دہرایا کہ اللہ کے رسول! آپ بتلایئے کہ اگر مَیں اللہ کے راستہ میں شہید کر دیا جاؤں تو کیا میرے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! اللہ کے راستہ میں تمہارے شہید ہو جانے پر تمہارے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، بشرطیکہ تم جم کر صبر سے کام لیتے ہوئے، اللہ واسطے اور ثواب کی نیت رکھتے ہوئے اور میدان میں آگے بڑھتے ہوئے، بغیر پیٹھ دکھلائے ہوئے مارے گئے ہو؛ تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے ﴿اِلَّا الدَّیْن﴾ لیکن کسی سے قرضہ

لیا ہے، یا بندوں کا اور کوئی حق تم پر ہو؛ تو وہ معاف نہیں ہوگا۔

لفظ دَین صرف قرضہ کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ بندوں کے جتنے بھی حقوق ہیں چاہے وہ جانی ہوں یا مالی، یا عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والا ہوں؛ تمام کو لفظ دِین شامل ہے پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ابھی حضرت جبرئیل نے آکر یہ بات بتلائی کہ شہادت کی وجہ سے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے، لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے، حالانکہ حضور ﷺ پہلے ہی جواب دے چکے تھے کہ سب گناہ معاف ہوجائیں گے، اس وقت یہ قید نہیں لگائی تھی اور بندوں کے حق کو اندر سے الگ نہیں کیا تھا لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتلایا کہ شہادت سے بھی حقوق العباد معاف ہونے والے نہیں ہیں۔

تو باب کا عنوان ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو اس کو واپس کرو، یا اس سے معافی مانگو اور معاملہ صاف کرو۔ یہاں یہ روایت لاکر بتلایا گیا کہ اللہ کے راستہ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دے دینا کتنا اونچا اور کیسا بڑا عمل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی وجہ سے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔

مفلس کون ہے؟

۲۱۸. وعن أبی هریرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلَسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمٌ لَهٗ وَلَا مَتَاعٌ. فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِیْ مَنْ يَّأْتِی يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِيَامٍ وَزَكوٰةٍ وَيَأْتِی قَدْشَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَأَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَکَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطىٰ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ أَنْ يَقْضِیَ مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ، فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے درمیان تو مفلس وہ آدمی سمجھا جاتا ہے جس کے پاس پیسے اور مال وسامان کچھ بھی نہ ہو، جو کسی چیز کا مالک نہیں ہے ایسے آدمی کو ہم لوگ مفلس کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا، یعنی فرض اور نفل نمازیں بھی بہت پڑھی ہیں، فرض اور نفل روزے بھی بہت رکھے ہیں، زکوٰۃ اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا سلسلہ بھی برابر رہا ہے اور دوسرے تمام واجبات بھی ادا کر چکا ہے، لیکن کسی کو گالی دے دی ہے، کسی پر تہمت لگا رکھی ہے، کسی کا مال کھا رکھا ہے، کسی کا خون بہا رکھا ہے، کسی کی پٹائی کر رکھی ہے۔ مطلب یہ کہ لوگوں کے مالی یا جانی یا عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والے حقوق مار رکھے ہیں۔ اس لئے کہ گالی میں سامنے والے کی تنقیص ہوتی ہے، تو گالی دے کر یا عیب لگا کر اس کی عزت خراب کی ہے۔ اور تہمت میں تو کسی آدمی پر بٹہ لگانا ہے ہی۔ یہ دونوں حقوق وہ ہیں جو عزت و آبرو سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ کسی کا مال کھایا ہے یا کسی کا خون بہایا ہے یا کسی کی پٹائی کی ہے۔ یہ مالی اور جانی حق ہوئے۔ اس طرح کل تین قسم کے حق ہیں۔

پہلے بھی یہ روایت آچکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا تھا ﴿اِنَّ أَمْوَالَكُمْ وَدِمَآءَ كُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَافِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَافِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا﴾ تمہارے مال اور تمہاری جان اور عزت وآبرو اسی طرح باعزت وباکرامت ہے اور اس پر ہاتھ ڈالنا اسی طرح حرام ہے جیسا اس دن میں اور اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔ اس روایت میں تین چیزیں بتلائی ہیں جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔

ہمارے سماج میں یہ عام مزاج بنا ہوا ہے کہ کسی کا مال لے لیا ہو یا کسی کے اوپر ہاتھ اُٹھایا ہو اور پٹائی کی ہو؛ اس کو تو بندوں کا حق سمجھا جاتا ہے، لیکن کسی کو گالی دے دی یا کسی کی عزت وآبرو کے متعلق کوئی جملہ کہہ دیا ہو تو اس کی کچھ پرواہ ہی نہیں کی جاتی اور اس کو بہت ہلکا سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی بہت خطرناک چیز ہے۔ ہمارے کسی عمل سے یا ہمارے کسی قول سے کسی آدمی کی عزت وآبرو پر دھبّہ آتا ہو اور کسی کی عزت وآبرو گھٹتی ہو تو یہ اس کا عزت والا حق ہے، اور اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھ ہوگی، اور وہ اس وقت تک معاف ہونے والا نہیں ہے جب تک کہ بندہ خود معاف نہ کردے۔ غیبت بھی اسی قبیل سے ہے۔

﴿غیبت: زنا سے زیادہ سخت کیوں؟﴾

اور اسی لئے تو غیبت کو زنا سے زیادہ سخت قرار دیا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا﴾ غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ غیبت زنا سے زیادہ سخت کیسے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ کسی نے اگر زنا کیا ہو اور وہ تنہائی میں ندامت کے ساتھ اللہ کے سامنے توبہ کرلے اور آئندہ کے لئے پختہ عزم کرلے کہ اب کبھی بھی نہیں کروں گا تو وہ معاف ہوجائے گا، اس کا کسی اور سے تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کی غیبت کی ہے تو تنہائی میں اللہ کے سامنے رونے اور توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوگا جب تک کہ جس کی غیبت کی ہے وہ معاف نہ کردے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ اس کی عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والا حق ہے، اس کے متعلق آپ ﷺ نے اتنا سخت ارشاد فرمایا۔

تو یہاں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اعمالِ صالحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ لے کر آئے گا، بعض روایت میں یہ الفاظ ہیں ﴿کَأَمْثَالِ الْجِبَالِ﴾ پہاڑوں

کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس ذخیرے کے باوجود یہ سب گناہ کئے تھے اور بندوں کے حق مارے تھے؛ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جن کے حق ہیں وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دعوی دائر کریں گے، ایک کہے گا کہ مجھے گالی دی تھی، دوسرا کہے گا کہ مجھ پر تہمت لگائی تھی، تیسرا کہے گا کہ میرا مال لے لیا تھا، چوتھا کہے گا کہ مجھے قتل کیا تھا، پانچواں کہے گا کہ میری پٹائی کی تھی۔ لہٰذا ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔ جتنے بھی حق والے ہیں سب کو اس کی نیکیاں دی جارہی ہیں، اگر سب کے حق ادا کرنے میں اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور ابھی بھی لوگوں کے مطالبے باقی رہ گئے ہیں تو ان کے گناہ اس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے، اب نیکیاں تو اس کے پاس رہی نہیں اور گناہ ہی گناہ ہوگئے، تو ظاہر ہے کہ گناہوں کا پلڑا بھاری ہوجائے گا، لہٰذا ان گناہوں کی وجہ سے وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت کا اصل مفلس تو یہ ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر مفلس اور کون ہوسکتا ہے؟ وہ تو یوں سمجھتا ہے کہ مَیں بہت کچھ لے کر جارہا ہوں، لیکن وہاں جاکر پتہ چلا کہ کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ بھی تھا وہ سب ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے مفلس کہا ہے۔

﴿چرب زبانی سے کسی کا حق ہڑپ کرنے پر وعید﴾

۲۱۹. وعن امِّ سلمة رضی اللہ عنہا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَاِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَّكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِيَ لَهٗ بِنَحْوِ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ أَخِيْهِ، فَاِنَّمَا أَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ. أَلْحَنَ (اَیْ) أَعْلَمَ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس نزاع اور جھگڑے لے کر آتے ہو۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ تم میں

سے کوئی اپنی حجت بیان کرنے میں دوسرے کے مقابلہ میں چرب زبان واقع ہوا ہو، اور مَیں جو سنوں اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کردوں، سو مَیں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کروں تو سمجھ لو کہ درحقیقت مَیں اس کے لئے آگ کا ایک انگارہ کاٹ رہا ہوں

قصہ دراصل یہ ہوا تھا کہ دو فریق نبی کریم ﷺ کے پاس میراث کا بہت پرانا جھگڑا لے کر آئے، حالانکہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنے دعووں کے سلسلے میں کوئی گواہ نہیں تھا بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً پچاس ساٹھ سو سال پہلے کا دادا اور پردادا کے زمانہ کا وارثائی کا جھگڑا ہو، اور اب پوتوں میں لڑائی ہے؛ تو کون گواہ ہوگا؟ اس لئے کہ بڑے لوگ تو سب مر مرا گئے۔ اسی طرح یہ بھی ایسا ہی ایک جھگڑا تھا جو حضور ﷺ کے پاس آیا تھا۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ کسی کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا، سب نے آ کر اپنی اپنی باتیں پیش کیں (ابوداؤد، ۳۵۸۵) اور ایسے موقعہ پر عام طور پر جب کوئی شرعی گواہ موجود نہیں ہوتا اور دونوں فریق اپنے دعوے پیش کرتے ہیں تو دونوں کی باتیں سن کر سننے والا اپنی صوابدید سے جس کی بات حق اور درست معلوم ہوتی ہے اس کے مطابق فیصلہ کردیتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس کی بات ٹھیک معلوم ہو رہی ہے وہی حق پر بھی ہو، اس لئے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی حق پر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی بات عمدہ طریقہ سے پیش نہیں کرسکتا، اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی صحیح صحیح بات دوسرے کو بہتر طور پر بتلا سکے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا آدمی چرب زبان ہے، بولنے کی بڑی اچھی صلاحیت ہے، اپنا جھوٹا دعویٰ بھی سامنے والے کے سامنے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ بھی مرعوب ہو جائے، اور یہ سمجھے کہ یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ تو اب ظاہر ہے کہ فیصلہ تو بات سننے پر کیا گیا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات میں کون سی چیز وزن رکھتی ہے، یہ آدمی اپنی سوجھ بوجھ، تجربہ اور

مہارت کی وجہ سے، اپنی چالاکی اور ہوشیاری کی وجہ سے جانتا ہے کہ یہ بات مضبوط ہے، حالانکہ وہ حق پر نہیں ہے لیکن پھر بھی اس نے بات اچھی طریقے سے پیش کردی، اور دوسرا بیچارہ بھولا بھالا ہے اس کو پتہ ہی نہیں کہ کونسا پوائنٹ (POINT) کہنا چاہیے، حالانکہ یہ دوسرا ہی حق پر ہے لیکن وہ اپنے بھولے پن اور بات کے ادا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے مار کھا گیا۔

جیسا کہ میں نے بتلایا کہ بات پرانی ہونے کی وجہ سے گواہ کسی کے پاس بھی نہیں تھے، تو ان کی بات سن کر آپ ﷺ نے ایک کے حق میں فیصلہ کردیا۔ فیصلہ کے بعد باہر جا کر دونوں فریق پھر سے جھگڑنے لگے، ان کی آواز نبی کریم ﷺ کے گوش مبارک میں پڑی، تو حضور بھی باہر تشریف لے گئے اور اسی موقعہ پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مَیں ایک انسان ہوں اور تم لوگ میرے پاس اپنا جھگڑا لے کر آتے ہو، اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بات کو اچھے طریقے سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کیسے انداز میں بات کروں گا تو بات بنے گی اور دوسرا وہ پوائنٹ نہیں سمجھتا۔ اس کی زبان سے جو بات مَیں نے سنی اسی کے مطابق اس کی بات ٹھیک معلوم ہوئی تو مَیں نے فیصلہ کردیا، لیکن دونوں فریق تو جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے، سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ جس نے اپنی بات بناوٹ سے پیش کی وہ بھی جانتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں، لیکن بات اس نے اچھی پیش کردی اور دوسرا بیچارہ سچا تھا اور وہ اپنے آپ کو سچا جانتا ہے اور ہے بھی وہی سچا، لیکن بات نہیں پیش کرسکا۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقی حالات سے دونوں واقف ہیں اگرچہ فیصلہ کرنے والا واقف نہ ہو۔

غلط فیصلہ کروالینے سے دوسرے کی چیز حلال نہیں ہوجاتی

تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر چہ تمہاری بات سن کر تم میں سے جس نے اپنی بات عمدہ طریقہ سے پیش کی اس کے متعلق مَیں فیصلہ کردوں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ چیز اس کی نہیں ہے، اب وہ یوں سمجھے کہ جب حضور نے میرے حق میں فیصلہ کردیا، لہٰذا اب تک چاہے وہ چیز میرے لئے حلال نہیں تھی لیکن اب تو شاید حلال ہوجانی چاہیے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے اس فیصلے کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے اور یوں نہ سمجھے کہ میرے لئے حلال ہوگئی بلکہ مَیں اس کیلئے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ دے رہا ہوں یعنی اصل مدار تو حقیقت پر ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ غیب نہیں جانتے تھے، تبھی تو آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔

بہر حال! یہاں حضور ﷺ نے کتنی اہم بات ارشاد فرمائی کہ کسی مسلمان بھائی کی چیز کو اپنی چرب زبانی سے اپنی بتا کر اپنے حق میں غلط فیصلہ کروالینے سے دوسرے کی وہ چیز اپنی نہیں بن جاتی۔ اور حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر قیامت تک کے لئے ایک اصول جاری کردیا کہ حاکم کے پاس اگر کسی معاملہ کا فیصلہ گیا اور حاکم نے فیصلہ صادر کردیا اور واقعہ یہ ہے کہ جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا ہے وہ چیز اس کی نہیں ہے۔ تو حدیث بتلا رہی ہے کہ اس فیصلہ کی وجہ سے وہ چیز اس کی نہیں بن جاتی اور اس کے لئے اس کا لینا درست نہیں ہوجاتا، بلکہ وہ تو جہنم کا ایک ٹکڑا ہے۔

جیسا آپ کا سوال؛ ویسا ہی مفتی صاحب کا جواب

آج کل یہ چیز عام ہوچکی ہے کہ آپس کا کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو لوگ مفتیوں سے فتویٰ

پوچھتے ہیں اور سوال کو ترتیب دینے والے خود وہی ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک سوال کسی مفتی کو دیا تو جو حقیقت آپ نے پیش کی ہے، مفتی تو جانتا نہیں ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے، اس کے سامنے تو آپ کے سوال کا کاغذ رکھا ہوا ہے، لہٰذا آپ نے تحریر میں جو حقائق پیش کئے ہیں انہیں کو سامنے رکھ کر وہ جواب دے گا۔ اگر آپ نے صحیح بات پیش کی ہے تو جواب صحیح ملے گا، اور اگر غلط بات پیش کی ہے تو جواب تو اسی بات پر موقوف ہے۔ اب جو لوگ غلط حقائق پیش کر کے جواب حاصل کرتے ہیں اور پھر سامنے والے فریق کو یوں کہتے ہیں دیکھو! مفتی صاحب کا فتویٰ یہ ہے۔ تو مَیں کہتا ہوں کہ یہ مفتی صاحب کا فتویٰ نہیں ہے، بلکہ یہ تو آپ کا خود کا ہی فتویٰ ہے، اس لئے کہ جو جواب ہے وہ تو آپ کے سوال ہی کا ہے، جیسا آپ کا سوال تھا؛ ویسا ہی مفتی صاحب کا جواب ہے۔

جیسے زید یوں کہتا ہے کہ مَیں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے تو مفتی صاحب کہیں گے کہ بیوی حرام ہوگئی۔ اور اگر اس نے طلاق تو تین دی ہیں اور مفتی صاحب کو یوں کہتا ہے کہ مَیں نے ایک ہی طلاق دی ہے، تو جواب میں مفتی صاحب کہتے ہیں کہ ایک پڑ گئی، اگر آپ عدت میں رجوع کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، اگر عدت میں رجوع کر لو گے تو وہ تمہاری بیوی باقی رہے گی۔ اب وہ لوگوں کو یوں بتلائے کہ دیکھو! فتویٰ میں آیا ہے اس لئے مَیں رجوع کر سکتا ہوں اور یہ میری بیوی ہے۔ تو یہاں سب یہی کہیں گے کہ ارے بھائی! فتویٰ میں یہ جواب اس لئے آیا کہ تم نے یوں ہی لکھا تھا کہ ایک طلاق دی ہے۔

کسی مفتی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں

بعض مرتبہ لوگ آ کر یوں کہتے ہیں کہ آپ نے ایسا جواب دیا۔ تو مَیں مفتیوں کیلئے

ایک اصول بتلاتا ہوں کہ آپ ان سے کہو کہ بھائی دیکھو! کوئی بھی فتویٰ لے کر آپ کے سامنے آئے تو اس کا جواب بعد میں دیکھنا، پہلے سوال دیکھو۔ سوال کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ برابر دیکھو، جواب کی فکر میں مت رہو، پہلے سوال دیکھو۔ سوال ٹھیک ہے اور واقعہ کے مطابق ہے تو پھر اب آپ جواب کو دیکھو، کسی مفتی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال ہی آپ کو بتلا دے گا، آگے جواب میں جانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور آپ کو فتویٰ کے انکار کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ آپ کو تو سیدھے یوں ہی کہنا ہے کہ آپ نے سوال غلط کیا ہے، اس لئے جو جواب ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔

آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں یہی ہوتا ہے، لوگ اپنے معاملات میں اس طرح کرتے ہیں کہ اِدھر سے ایک نے فتوی منگوایا اور اُدھر سے دوسرا فتوی منگوایا۔ اب جس نے جیسا لکھا اس کے مطابق اس کو فتویٰ ملا۔ پھر لوگوں کو بتلایا کہ دیکھو یہ مفتی لوگ کیسے ہیں، اِدھر سے یہ فتوی دیا اور اُدھر سے یہ فتوی دیا۔ آخر میں گالی تو مفتی کے نام ہی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ سوال کیسا ہے۔ جیسا سوال ہے اسی کے مطابق جواب ہے۔

نزاعی معاملات میں قابلِ تقلید طرزِ عمل

ہمارے پاس اس طرح کا کوئی سوال آتا ہے تو اب ہم یہ کرتے ہیں کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جھگڑا کن کن لوگوں میں ہے، وہاں تک اس کا جواب ہی نہیں دیتے۔ جب دوسرے فریق کی طرف سے سوال آتا ہے تو پھر ہم یہ کہتے ہیں اس سلسلے میں پہلے فریق نے یہ سوال کیا تھا، ابھی تو نقل بھی نہیں کیا ہے، اب معلوم ہوا کہ آپ بھی پوچھ رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ جھگڑے کا مسئلہ ہے، لہٰذا اب آپ کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ دونوں فریق مل کر سوال تیار کر و اور پہلے سے طے کر لو کہ جو جواب آئے گا اس پر ہم دونوں عمل کریں گے؛

تب ہی ہم جواب دیں گے۔اس طرح جھگڑا ختم ہو جائے گا۔باقی آپ جواب منگوا رہے ہیں، اگر آپ کو جواب دے دیا گیا تو ہمارا یہ فتویٰ آپ کا جھگڑا ختم نہیں کرے گا۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جھگڑے میں ایک فریق نے فتویٰ منگوایا اب دوسرا فریق بھی فتویٰ منگوائے گا، تو اب یہ فتویٰ تیل چھڑکنے کا کام کرے گا۔ یعنی یہ فتویٰ جھگڑا ختم نہیں کرے گا بلکہ اور بڑھائے گا۔ پہلا کہے گا میرے پاس فتویٰ ہے، تو دوسرا کہے گا کہ میرے پاس بھی فتویٰ ہے۔ پہلا کہے گا کہ مَیں راندیر سے لایا ہوں تو دوسرا کہے گا کہ مَیں ڈابھیل سے لایا ہوں۔ایک کہے گا کہ مَیں بھروچ سے لایا ہوں تو دوسرا کہے گا کہ مَیں ترکیسر سے لایا ہوں۔اس طرح یہ جھگڑا چلتا ہی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہوگا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ فتوؤں کا حال بھی یہی ہے۔لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح غلط سلط باتیں بنا کر فتویٰ پوچھ لیا اور جواب حاصل کر لیا تو یہ چیز ہمارے لئے حلال ہوگئی۔تو ان کو سمجھ لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ وہ چیز ان کے لئے حلال نہیں ہوتی۔جیسے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں نے فیصلہ کر دیا تو میرے فیصلے کی وجہ سے یوں مت سمجھنا کہ وہ چیز اس کی ہوگئی، بلکہ مَیں تو اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔جب حضور ﷺ نے اپنے متعلق یہ ارشاد فرمایا تو پھر مفتیوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس پر مَیں تو کہتا ہوں کہ مفتی کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ صرف ایک ٹکڑا کاٹ کر نہیں دے رہا ہے بلکہ پوری جہنم ہی دے رہا ہے۔

...... جب تک کہ حرام خون کا مرتکب نہ ہو

۲۲۰.وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَنْ يَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِيْ فُسْحَةٍ مِّنْ دِيْنِهٖ مَالَمْ يُصِبْ دَماً حَرَاماً. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مومن اپنے دین

کے بارے میں بڑی کشادگی رکھتا ہے جب تک کہ حرام خون کا مرتکب نہ ہو جائے، یعنی جب تک کہ کسی کو قتل نہیں کیا وہاں تک اس کے دوسرے گناہ معاف ہونے کی پوری امید ہے، لیکن جہاں کسی کو قتل کیا تو اس کا معاملہ پھنس جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے جب کوئی آدمی کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے تو اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے کہ اب اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہے، اس کے لئے مہر لگ گئی (المعجم الکبیر،۱۲۳۱۴) یہ بہت سخت وعید ہے۔ کسی مسلمان کا قتل اتنا سخت گناہ ہے کہ کفر کے بعد کسی گناہ پر اتنی سخت وعید نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مال میں بے جا تصرفات پر وعید

۲۲۱. وعن خولة بنت عامر الانصارية وهي أمرأة حمزة رضي الله عنه قالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ رِجَالاً يَتَخَوَّضُوْنَ فِيْ مَالِ اللهِ بِغَيْرِ حَقٍّ؛ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

حضرت خولہ بنت عامر جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ ہیں وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے بعض مال میں ناحق طریقہ پر تصرف کرتے ہیں ان کے لئے قیامت کے دن جہنم ہے۔

جو چیزیں عام امانت کی سمجھی جاتی ہیں جیسے مسجد اور مدرسہ کا کاروبار اور عوام المسلمین کے جتنے بھی بیت المال ہیں؛ یہ سب اللہ کے مال میں شمار ہوتا ہے۔ تو جو لوگ ایسے اموال میں ناحق تصرف کرتے ہیں یعنی جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں نہیں کرتے، یا جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے وہاں کرتے ہیں، یہ سب ناحق تصرف ہے؛ تو ان کے لئے قیامت کے دن جہنم ہے۔ یہ بھی چونکہ اجتماعی مال ہے، اس لئے اس میں اتنی سخت وعید آئی ہے۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کے حقوق سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس باب میں جتنی بھی روایتیں آئی ہیں ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ بندے کا کوئی بھی حق ہو، چاہے اس کا تعلق اس کی جان سے ہو یعنی اس کو مارا پیٹا اور اس کا کوئی عضو کاٹ دیا یا اس کا تعلق مال سے ہو جیسے کسی کی کوئی چیز دبالی۔ یا اس کی عزت وآبرو سے ہو جیسے کسی کو گالی دی، کسی کی غیبت کی، کسی پر تہمت لگائی؛ یہ سب حق ایسے ہیں کہ جب تک صاحب حق سے معافی نہ مانگ لے، یا اس سے معاملہ صاف نہ کرلے؛ وہاں تک معافی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر آیا کہ شہادت جیسا بڑا عمل بھی ان گناہوں کو معاف نہیں کراسکتا ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں ان چیزوں کا اہتمام نصیب فرمائے

﴿دعاء﴾

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، اے اللہ! جو اس طوفان سے متاثر ہوئے ہیں ان مرحومین کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! جو بیمار ہیں انہیں صحت عطا فرما۔ اے اللہ! جتنے بھی تیرے بندے مصیبت زدہ ہیں اپنے فضل وکرم سے ان کی مصیبتوں کو دور فرما۔ اے اللہ! جن کے نقصانات ہوئے ہیں اپنے خزانہ غیب سے پورے فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحتِ عاجلہ کاملہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتوں کو پورا فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی ہے وہ ہم سب کو عطا فرما اور جن چیزوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما

تَعْظِيْمُ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ
وَبَيَانِ حُقُوْقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام
اور ان کے حقوق کا بیان
اور ان کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنا

مجلس ﴿۱﴾

۲/ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۷/ جون ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُباللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم.

قال اللہتعالیٰ:وَمَن یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِ فَھُوَخَیْرٌلَّہٗ عِنْدَرَبِّہٖ (الحج ۳۰)

وقال تعالیٰ:وَمَن یُّعَظِّمْ شَعَائِرَاللّٰہِفَاِنَّھَامِنْ تَقْوَیٰ الْقُلُوْبِ (الحج ۳۲)

وقال تعالیٰ:وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (الحجر ۸۸)

وقال تعالیٰ:وَمَنْ قَتَلَ نَفْساًبِغَیْرِنَفْسٍ أَوْفَسَادٍفِی الْأَرْضِ فَکَأَنَّمَاقَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا،وَمَنْ أَحْیَاھَافَکَأَنَّمَاأَحْیَاالنَّاسَ جَمِیْعًا (المائدۃ ۳۲)

﴿عنوان کا خلاصہ﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے ﴿تَعْظِیْمِ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ وَبَیَانِ حُقُوْقِھِمْ وَالشَّفْقَۃِعَلَیْھِمْ وَرَحْمَتِھِمْ﴾ "حُرُمَات" "حُرُمَۃٌ" کی جمع ہے۔حرمۃ کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جن چیزوں کے احترام کوملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا لحاظ کرنا اوران کے حقوق کوادا کرنا اورمسلمانوں کے ساتھ شفقت ومہربانی سے پیش آنے کی کیا اہمیت ہے؛ وہ اس باب میں بتلاتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلے آیت لائے ہیں﴿وَمَن یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِفَھُوَخَیْرٌلَّہٗ عِنْدَرَبِّہٖ﴾

لفظ حرمات اپنے اندر بڑا عام مفہوم رکھتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے،اور اللہ تبارک تعالیٰ نے جن چیزوں کی حرمت اور احترام کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی جو آدمی تعظیم کرتا ہے،ان کا لحاظ رکھتا ہے،ان کا ادب کرتا ہے اور ان کے حدود کی رعایت کرتا ہے؛تو اس کا یہ طریقۂ عمل اور روش اللہ تعالیٰ کے یہاں بھلائی اور خیر کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا۔

﴿شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ کی علامت ہے﴾

دوسری آیت پیش کی ہے﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ ''شعائر''،'' شعیرۃ'' کی جمع ہے،''شعیرۃ''اصل تو علامت کو کہتے ہیں،لیکن ہر علامت کے لئے یہ نہیں بولا جاتا بلکہ کوئی مخصوص علامت جو کسی قوم یا مذہب کے لئے امتیازی حیثیت رکھتی ہو کہ اس علامت کے ذریعہ وہ قوم پہچانی جاتی ہو؛تو ایسی علامت کے لئے لفظِ''شعیرۃ'' بولا جاتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو دین کی علامت کی حیثیت قرار دی ہے جیسے بیت اللہ،کتاب اللہ ہے،اور کچھ احکام بھی ایسے ہیں جیسے اذان ہے اور اسی طرح کچھ چیزیں ہیں جو اسلام کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتی ہیں اور جو دین کا شعار اور دین کی خصوصی علامت سمجھی جاتی ہے،جسے گجراتی میں (ઓળખ ચિન્હ) کہتے ہیں یعنی جس کے ذریعہ وہ قوم پہچانی جاتی ہے اور وہ مذہب پہچانا جاتا ہے،اب چاہے اس کا تعلق دین پر عمل کی جانی والی چیزوں سے ہو یا اور دوسری چیزوں سے ہو،مثلاً ختنہ بھی دین کا شعار ہے کہ اس کے ذریعہ بھی مسلمان کی پہچان قائم ہے۔اذان کو بھی شعار قرار دیا ہے۔ایسے ہی بیت اللہ کو بھی دین کا

شعار قرار دیا ہے، اور ایسی تمام چیزیں اس میں آجاتی ہیں جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی شریعت پر عمل کے لئے علامت قرار دیا ہے۔ تو جو آدمی اس کی تعظیم کرتا ہے، اس کے ادب کا لحاظ کرتا ہے، اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتا ہے؛ تو یہ اس کے دل کے تقویٰ کی علامت ہے۔ یعنی جس کے دل میں صفتِ تقویٰ موجود ہے اس کی یہ علامت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے شعائر کے احترام کو وہ بجالاتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہاں نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا کہ آپ اپنا پہلو مومنین کے واسطے جھکائے رکھئے یعنی ایمان والوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کیجیے اور ان کے ساتھ تواضع اور نرمی سے پیش آیئے گویا نبی کریم ﷺ کو خصوصیت کے ساتھ تاکیدی حکم دیا جارہا ہے۔

﴿...... یہ پوری انسانیت کا قتل ہے﴾

﴿وَمَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْفَسَادٍ فِى الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ اگر کوئی آدمی کسی جان کو بغیر کسی جان کے بدلہ میں قتل کرے، یعنی شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی نے کسی کو ناحق قتل کیا ہے تو اس جرم کی پاداش میں قصاص کے طور تو قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا، اس طرح اگر قتل کیا جارہا ہے تب تو ٹھیک ہے۔

﴿أَوْفَسَادٍ فِى الْأَرْضِ﴾ یا زمین میں کسی قسم کا فساد اور نقصان پھیلائے بغیر کسی کی جان لیتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی قتل وغارت گری کا ارتکاب کرتا ہے، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کرتا ہے تو یہ بھی ایک طرح کا فساد ہی ہے اور ڈاکہ زنی کے بدلہ میں اسلام کے

اندر قتل کی سزا ہے۔

یا کوئی آدمی ارتداد اختیار کرتا ہے یعنی دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کو چھوڑ دیتا ہے؛ تو اس کو بھی فساد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر ایسی بات نہیں ہے یعنی کسی نے کسی کی جان بھی نہیں لی اور کسی طرح کا فساد بھی نہیں پھیلایا؛ پھر بھی کوئی آدمی کسی کی جان ناحق طریقہ سے لیتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔ اور یہ اس لئے کہ گناہ اور سزا کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح کسی ایک آدمی کے قتل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو سزا مقرر ہے؛ تمام لوگوں کے قتل پر بھی وہی سزا ہے۔ اور جس طرح تمام انسانوں کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں جرم ہے ؛ ویسے ہی ایک انسان کا قتل کرنا بھی جرم ہی ہے۔ اور جب آدمی ایک جان کو ناحق قتل کرنے کی جرأت کرتا ہے تو وہ اپنے اس طرزِ عمل سے دوسرے لوگوں کو ایسی حرکت کرنے کے لئے آمادہ کر رہا ہے، یعنی اس نے ایک جان کو ناحق قتل کر کے ایک غلط طریقہ لوگوں کے اندر جاری کر دیا، اب اور لوگوں کو بھی جرأت ہوگی اور ان کی ہمت بھی کھلے گی۔

﴿کسی ایک کی بیجا جرأت دوسروں کو حوصلہ بخشتی ہے﴾

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کے دلوں میں بھی تقاضے ضرور ہوتے ہیں لیکن اس طرح کا ماحول بنا ہوا ہے یا معاشرہ کے اندر اس طرح کا ضابطہ ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کی جرأت نہیں ہوتی، لیکن جب ایک آدمی بیجا جراءت کا ارتکاب کرتے ہوئے اس غلط کام کو انجام دے

دیتا ہے تو پھر دوسروں کے لئے بھی راستہ کھل جاتا ہے۔تو یہاں بھی ایک جان کے قتل کرنے کو کئی جانوں اور تمام انسانوں کے قتل کے برابر اسی لئے قرار دیا کہ اس نے ناحق قتل کر کے ایسے لوگوں کو جرأت وہمت بخشی اور حوصلہ دیا، دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کی راہ ہموار کر دی، اس لئے اس کو ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا﴾ جو آدمی کوئی غلط طریقہ جاری کرے گا تو اس پر اس کا وبال ہے اور آئندہ اس غلط طریقہ کو جتنے بھی لوگ اختیار کریں گے ان تمام لوگوں کا گناہ اس کو بھی ہوگا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب دنیا کے اندر کوئی ناحق قتل کا کیس وجود میں آتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اسی نے ناحق قتل کا طریقہ دنیا میں جاری کیا۔(بخاری شریف، ۶۸۶۷) اس لئے اس کو ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ سے تعبیر کیا۔

ویسے اس آیت سے پہلے کی آیتوں میں حضرت آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اسی قصہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ آیت آتی ہے۔

﴿......اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی﴾

﴿وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ اور جس نے کسی جان کو زندہ کیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی بخشی۔اس کا مطلب یہ ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بخاری میں اس کی تفسیر میں منقول ہے ﴿مَنْ أَحْيَاهَا ای مَنْ حَرَّمَ قَتْلَهَا (بخاری شریف، ۶۸۶۷)﴾ یعنی جو آدمی ناحق قتل کو حرام سمجھے۔ظاہر ہے کہ جو حرام سمجھے گا وہ اسی حرمت کا لحاظ کرتے

ہوئے ناحق قتل کا ارتکاب بھی نہیں کرے گا۔گویا اس نے حرام سمجھ کر اس سے اپنے آپ کو بچایا، تو اپنے اس طرزِعمل اور اپنی اس روش سے اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

یا دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح سے اپنے آپ کو غلط طریقہ سے روک کر ناحق قتل کا جو راستہ کھل رہا تھا اس کو کھلنے کا موقعہ نہیں دیا، اگر خدانخواستہ یہ غلط حرکت کر ڈالتا اور ناحق قتل کا مرتکب بنتا تو اس کی یہ حرکت دوسروں کے لئے بھی راہ کھولتی، اور دوسروں کی جان جانے کا ذریعہ بنتی، لیکن اس نے ناحق قتل کو حرام سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے روک کر تمام لوگوں کی جان بچائی، اسی کو ﴿مَنْ أَحْيَـاهَـا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ زندہ کرنا کسی انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔

اسی حدیث کا دوسرا جزو ہے ﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا﴾ کوئی آدمی اچھا طریقہ دنیا کے اندر جاری کرے تو اس پر اس کو ثواب ملے گا اور آئندہ اس طریقہ پر جتنے لوگ بھی عمل پیرا ہوں گے، ان کے ثواب میں بھی اس کا برابر حصہ رہے گا۔

(صحیح مسلم، ۲۳۹۸)

﴿مؤمنین باہم ایک عمارت کے مانند ہیں﴾

۲۲۲. وعن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهَا بَعْضًا. وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے دیوار جیسا ہے، جیسے دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لئے تقویت کا باعث ہوتی ہے، اگر آپ ایک اینٹ کو بیچ سے نکال لیں تو اس کی وجہ سے اس کے قریب والی اینٹ ڈھیلی پڑ جائے گی اور اس کا اثر دھیرے دھیرے دوسری اینٹوں کو پہنچے گا،

تو ایک اینٹ کا نکلنا باقی تمام اینٹوں کی کمزوری کا باعث ہے، یہ ایک اینٹ دوسری تمام اینٹوں کو تھامے ہوئے ہے اور ایک دوسرے کی تقویت کا ذریعہ ہے، اسی طریقہ سے مومنین کا حال ہوا کرتا ہے کہ ہر مؤمن دینی اعتبار سے بھی اور دنیوی اعتبار سے بھی اپنے دوسرے تمام مؤمن بھائیوں کے لئے تقویت، تائید اور مدد کا ذریعہ ہوتا ہے۔

﴿وَشَبَّکَ بَیۡنَ أَصَابِعِهٖ﴾ یہ ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک دی یعنی انگلیوں کو انگلیوں میں داخل کیا۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے ایک ظاہری مثال دی کہ اس طرح اینٹیں ایک دوسرے میں داخل کر کے دیوار تعمیر کی جاتی ہے۔

﴿نادانستہ طور پر پہنچنے والی تکلیف سے بچانے کا اہتمام﴾

۲۲۳. وعنه قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنۡ مَرَّ فِیۡ شَیۡءٍ مِنۡ مَسَاجِدِنَا أَوۡ أَسۡوَاقِنَا وَمَعَهٗ نَبۡلٌ. فَلۡیُمۡسِکۡ، أَوۡ لِیَقۡبِضۡ عَلیٰ نِصَالِهَا بِکَفِّهٖ أَنۡ یُّصِیۡبَ أَحَداً مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡهَا بِشَیۡءٍ.

اس روایت کو پیش کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی جان کی تو اپنی جگہ پر بڑی قیمت ہے ہی، لیکن کسی مسلمان کو نادانستہ طور پر معمولی تکلیف بھی پہنچنے نہ پائے، اس کا بھی نبی کریم ﷺ نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی ہماری مسجد یا بازار سے۔ یعنی کسی ایسی جگہ سے جہاں لوگوں کا مجمع ہو۔ تیروں کو لے کر گذرے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ تیر میں نیچے لکڑی ہوتی ہے اور اوپر لوہے کا نوک دار حصہ ہوتا ہے جس کو گجراتی میں (ભાલો) کہتے ہیں۔ جس طرح چاقو میں لکڑی کا ایک دستہ ہوتا ہے اور آگے لوہے کا دھاردار حصہ ہوتا ہے، اس کو چاقو کا پھل کہا جاتا ہے۔ اور تیر میں بھی نیچے لکڑی

ہوتی ہے اور اس کے اوپر لوہے کا نوکیلا حصہ لگا ہوا ہوتا ہے، اس کو پھل کہا جاتا ہے۔

تو اُس زمانہ میں لوگ تیر اور کمان اپنے پاس رکھتے ہی تھے، اور جب بازار کھلا ہوا ہو اور کوئی آدمی مجمع میں سے اس طرح کھلے ہوئے تیر لے کر گذرے تو وہاں احتمال موجود ہے کہ بے خبری میں اس کے تیر کسی کو لگ جائے۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی مساجد یا بازاروں میں سے گذرے اور اس کے پاس تیر ہوں، تو وہ تیروں کے پھلوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لے، کھلے ہوئے نہ رکھے۔ یعنی پھل والا حصہ ہاتھ میں رکھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان کو نادانستہ طور پر لگ جائے اور اس سے اس کے جسم کو خراش ہو جائے اور وہ زخمی ہو جائے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ چاہے اس کو نہ لگے، لیکن اس کو کھلا ہوا دیکھ کر سامنے والا ڈر اور خوف سا محسوس کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا ہم ان کے قریب سے کھلے تیر لے کر گذریں گے تو یہ نادانستہ طور پر خوف دلانے کا ذریعہ بنے گا، اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع کیا ہے۔ گویا ایک مسلمان کا اتنا زیادہ حق ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو لوگ دانستہ اور جان بوجھ کر اور ان کو اس بات سے منع کرنے کے باوجود کہ تمہاری اس حرکت سے لوگوں کو ایذا اور تکلیف پہنچ رہی ہے؛ پھر بھی تکلیف پہنچاتے ہیں، تو یہ تو اور زیادہ قبیح اور بری حرکت سمجھی جائے گی۔ اس لئے اس سے تو بہت ہی زیادہ بچنا ضروری ہے۔

﴿مسلمان ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں﴾

۲۲۴. وعن النعمان بن بشير رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، اِذَااشْتَكىٰ مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعىٰ لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى. (متفق عليه)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال آپس میں محبت اور آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کے اندر ایک جسم کی سی ہے کہ جسم کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو تمام جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے پورے جسم میں کان الگ عضو ہے، ناک الگ عضو ہے، آنکھ الگ عضو ہے، دانت الگ عضو ہے، اسی طرح تمام اعضاء اپنی اپنی جگہ پر ہیں، مختلف اعضاء کے مجموعہ سے ہمارا یہ جسم تیار ہوا ہے، لیکن ان اعضاء کے مختلف ہونے کے باوجود ایک جسم میں پائے جانے والے ان اعضاء میں آپس کا جوڑ اور تعلق ایسا ہے کہ اگر آپ کی انگلی کے اندر زخم لگا اور پک کر اس میں پیپ ہو گیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رات کو پورا جسم تکلیف محسوس کرے گا، پورا جسم بخار میں مبتلا رہے گا، پورا جسم بیدار رہے گا اور نیند نہیں آئے گی۔ کبھی آنکھ ایسی بات نہیں کرے گی کہ تکلیف تو انگلی میں ہے، اور وہ تو مجھ سے بہت دور ہے، مجھے اس سے کیا تعلق؟ مَیں تو آرام سے سوتی ہوں۔ اسی طرح آدمی کا پیر کبھی یہ نہیں سوچتا کہ انگلی کے کونے میں تکلیف ہے تو مجھے کیا؟ بلکہ اس کی وجہ سے پورے جسم میں بخار آجاتا ہے اور اسی زخم کی وجہ سے پورا جسم بیدار رہتا ہے اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔

تو دیکھو! ایک جسم میں پائے جانے والے مختلف اعضاء میں سے ہر ایک کا کام اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ ہے، اس کے باوجود ایک جسم میں ہونے کی وجہ سے ان میں آپس میں ایسا جوڑ اور تعلق ہے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے عضو کو اگر تکلیف ہو جائے تو بڑے سے بڑا عضو بھی اس کیلئے بے چین ہو جاتا ہے، پورا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا رہتا ہے، پورے جسم کو نیند نہیں آتی، اور بخار کا اثر پورے جسم پر ہوتا ہے، بے چینی پورے جسم پر طاری ہوتی ہے

اسی طرح سے اہلِ ایمان جتنے بھی ہیں یوں سمجھئے کہ ایمان اور اسلام کی نسبت نے ان سب کو ایک جسم جیسا بنادیا ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں آپس میں اسی طرح تعلق ومحبت اور ایک دوسرے پر شفقت ومودّت کا اتنا غلبہ ہونا چاہیے کہ جیسے ایک جسم کے کسی چھوٹے سے عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس کے لئے بیدار رہتا ہے۔ اسی طرح کوئی مؤمن چاہے کتنا ہی دور رہتا ہو، اس کے باوجود اس کو اگر تکلیف پہنچے تو ایمانی تعلق، ایمانی نسبت اور ایمانی رشتہ کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے مؤمن کو دل میں وہی کسک محسوس کرنی چاہیے، یعنی اس کو دکھ پہنچا تو گویا ہمیں ہی دکھ پہنچا، اور اس کے اس دکھ کو دور کرنے کے لئے جو سعی ہوسکتی ہو اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں رکھنی چاہیے۔ تمام مؤمنین کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہونا چاہیے۔

جذبۂ رحم کا تقاضہ

۲۲۵. وعن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قَبَّلَ النَّبِیُّ ﷺ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہما، وَعِنْدَهُ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ الْأَقْرَعُ: اِنَّ لِیْ عَشَرَةً مِنَ الْوَلَدِ، مَاقَبَّلْتُ مِنْهُمْ أَحداً. فَنظَرَ اِلَیْهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: مَنْ لا یَرْحَمْ لا یُرْحَمْ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے نواسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا۔ حضرت حسن چھوٹے تھے اور حضور ﷺ کو بڑے محبوب تھے۔ جیسا کہ روایت آرہی ہے جس میں حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ تو حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ان کو بوسہ دیا۔ بچوں کو بوسہ دیا ہی جاتا ہے۔ اس وقت حضور ﷺ کے پاس دیہات کے رہنے والے ایک صحابی اقرع بن حابس موجود تھے، قبیلہ بنو تمیم سے ان کا تعلق ہے۔ جب حضور ﷺ نے حضرت حسن کو بوسہ دیا تو یہ دیکھ کر انھوں نے کہا کہ میرے

دس بچے ہیں لیکن آج تک میں نے کسی ایک کو بھی بوسہ نہیں دیا اور آپ بوسہ دے رہے ہیں؟ گویا ان کو نبی کریم ﷺ کے اس طرز پر تعجب ہو رہا تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مَن لَّا یَرحَمُ لَا یُرحَمُ﴾ میں بچے کو جو بوسہ دے رہا ہوں یہ میرے دل میں رکھے ہوئے جذبۂ رحم کا تقاضہ ہے، اور جو آدمی کسی کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اور لوگوں کی طرف سے بھی اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ بھی محبت وشفقت، ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے تو آپ بھی لوگوں کے ساتھ شفقت ومحبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ کیجیے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ چاہیں کہ لوگ آپ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں اور آپ کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ کریں۔

﴿تطفیف ہر چیز میں ہوا کرتی ہے﴾

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے قرانِ پاک میں وعید سنائی گئی ہے ﴿وَیلٌ لِّلمُطَفِّفِینَ. اَلَّذِینَ اِذَا اکتَالُوا عَلَی النَّاسِ یَستَوفُونَ وَاِذَا کَالُوهُم اَو وَّزَنُوهُم یُخسِرُونَ﴾ ان کی طبیعت اور مزاج یہ ہے کہ لوگوں سے جب وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورے پورا وصول کرتے ہیں، اور جب دینے کا وقت آتا ہے تو گھٹا کر اور کم کرکے دیتے ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں ﴿لِکُلِّ شَیءٍ وَفَاءٌ وَتَطفِیفٌ (مؤطا امام مالک، ۲۲)﴾ تطفیف صرف ناپ تول میں نہیں ہوا کرتی کہ جو دکان لے کر بیٹھا ہے وہی کرتا ہے بلکہ تطفیف ہر چیز میں ہوا کرتی ہے۔ اس لئے آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کیا جائے، آپ مصیبت میں گرفتار ہوں تو لوگ ہمدردی کریں، تو آپ کو بھی چاہیے کہ کوئی دوسرا جب مصیبت میں گرفتار ہو تو آپ بھی اس کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا معاملہ کیجئے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ

آپ تو مصیبت آنے پر یہ چاہتے ہوں کہ لوگ ہماری مدد کریں، ہمارے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں اور لوگوں پر جب مصیبت آرہی ہے تو آپ ان پر نہ دھیان دے رہے ہیں، اور نہ ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کرتے ہیں ﴿مَنْ لا يَرْحَمُ لا يُرْحَمُ﴾ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے امت کو یہ تعلیم دی کہ یہ جذبۂ رحمت آپ کے دل میں ہر مؤمن کے لئے ہونا چاہیے اور اس جذبۂ رحمت کا ظہور موقع بموقع ہوتے رہنا چاہیے۔

چھوٹی اولاد جب بھی سامنے آئے گی تو وہ چھوٹی ہے اس وجہ سے جذبۂ رحمت جوش مارتا ہے اور آدمی اس کو گود میں اٹھالیتا ہے، اس کو بوسہ دیتا ہے اور چومتا ہے، تو نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن کے ساتھ یہ معاملہ کیا، گویا آپ فرمارہے ہیں کہ یہ اسی جذبۂ رحمت کا تقاضہ تھا اور یہ ہر مؤمن میں ہونا چاہیے اور جس میں نہیں ہے اس کو اپنی خیر منانا چاہیے، اس کو چاہیے کہ اس جذبہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

﴿جذبۂ رحمت اگر تمہارے دل میں نہیں، تو مَیں کیا کروں؟﴾

۲۲۶. وعن عائشة رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَدِمَ نَاسٌ مِنَ الْأَعْرَابِ عَلىٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالُوْا: أَتُقَبِّلُوْنَ صِبْيَانَكُمْ؟ فَقَالَ: نَعَمْ. قَالُوْا: لٰكِنَّا وَاللهِ مَا نُقَبِّلُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: أَوَأَمْلِكُ اِنْ كَانَ اللهُ نَزَعَ مِنْ قُلُوْبِكُمُ الرَّحْمَةَ؟ (متفق علیه)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دیہات کے رہنے والے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ تم اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم تو کبھی اپنے بچوں کو بوسہ نہیں دیتے۔ کیونکہ عام طور پر دیہات کے رہنے والوں کے اندر اکھڑ پنا ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿مَنْ

سَکَنَ الْبَادِیَۃَ جَفَا﴾ جو دیہات میں رہتا ہے اس کی طبیعت میں اکھڑ پن، درشتگی اور سختی ہوتی ہے۔ اس کا یہ اثر ہے کہ وہ کہتے ہیں اللہ کی قسم! ہم تو بوسہ نہیں دیتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿أَوَأَمْلِکُ اِنْ کَانَ اللّٰہُ نَزَعَ مِنْ قُلُوْبِکُمُ الرَّحْمَۃَ؟﴾ اللہ تعالیٰ نے جب تمہارے اندر سے جذبۂ رحمت نکال دیا ہے تو پھر میرے بس کی چیز نہیں ہے، مَیں کہاں سے لاکر دے سکتا ہوں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا جذبۂ رحمت کا تقاضہ ہے، اگر وہ تمہارے دل میں نہیں؛ تو مَیں کیا کروں؟ میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بہر حال! نبی کریم ﷺ کی طرف سے خاص طور پر یہ چیز قابلِ تنبیہ ہے۔

﴿جذبۂ رحمت کا ظہور موقعہ بموقعہ ہوتا رہنا چاہیے﴾

باب کا عنوان قائم کیا تھا ﴿وَبَیَانِ حُقُوْقِھِمْ وَالشَّفُقَۃِ عَلَیْھِمْ وَرَحْمَتِھِمْ﴾ جس کے اندر بھی یہ جذبۂ رحمت ہوگا اس کا ظہور ہر اہلِ ایمان کے ساتھ موقعہ بموقعہ ہوتا رہے گا۔ لہٰذا اگر یہ صفت موجود ہے تو پھر ضروری نہیں کہ صرف اپنی اولاد کے ساتھ ہی محبت ہوگی، اس کا ظہور اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہوگا، رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہوگا، اجنبیوں کے ساتھ بھی ہوگا، انسانوں کے ساتھ بھی ہوگا اور جانوروں کے ساتھ بھی ہوگا۔

اسی لئے حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بدکار عورت جا رہی تھی، اس کو پیاس محسوس ہوئی، ایک کنوئیں سے پانی نکال کر پیا، باہر نکل کر دیکھا کہ ایک کتا مٹی چاٹ رہا ہے، اس نے محسوس کیا کہ پیاس کی جو کلفت مجھے محسوس ہو رہی تھی اسی میں یہ بھی مبتلا ہے، اس نے اپنے موزے سے پانی نکال کر اس کو پلایا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول!

کیا ان جانوروں اور چوپایوں کے ساتھ ہم اچھا سلوک کریں تو اس پر بھی ہم کو اجر وثواب ملے گا؟حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہر تر جگر والے کے ساتھ آپ اچھا سلوک کریں تو اس پر اجر وثواب ملے گا (مسلم شریف،۵۹۹۷/ بخاری شریف،۵۶۶۳) تر جگر والا بول کر جاندار مراد لیا ہے،اس لئے کہ جب تک جگر میں تری رہتی ہے؛وہ زندہ رہتا ہے اور جب جگر خشک ہو جاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں جاندار بول کر حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ انسان کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر جاندار شامل ہے ،اور مثال میں بھی ایسا جانور پیش کیا جو دھتکارا جاتا ہے اس کو لوگ اپنے دروازے سے بھگاتے ہیں یعنی کتا۔اسی پر تو صحابہ نے سوال کیا تھا،تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر جاندار کے ساتھ آپ اچھا برتاؤ کریں گے،اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کریں گے؛تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔

تَعْظِیمِ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ

وَبَیَانِ حُقُوْقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَیْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام

اور ان کے حقوق کا بیان

اور ان کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنا

مجلس ﴿۲﴾

۱۸/ربیع الاول ۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۴/جولائی ۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

جو دوسروں کے ساتھ رحم نہیں کرتا

۲۲۷. وعن جریربن عبداللہؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَن لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ لا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ

حضرت جریربن عبداللہ بجلیؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی لوگوں کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی پھراس کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں فرماتے۔اوپربھی اسی طرح کی روایت گذرچکی ہے وہاں تفصیل بتلا چکا ہوں۔

امام کو مقتدیوں کی رعایت کا حکم

۲۲۸. وعن أبی ھریرۃؓ أن رسول اللہ ﷺ قال: اِذَاصَلّٰی أَحَدُکُمْ لِلنَّاسِ فَلْیُخَفِّفْ، فَاِنَّ فِیْھِمُ الضَّعِیْفَ وَالسَّقِیْمَ وَالْکَبِیْرَ، وَاِذَاصَلّٰی أَحَدُکُمْ لِنَفْسِہٖ فَلْیُطَوِّلْ مَاشَآءَ. (متفق علیہ) وَفِیْ رِوَایَۃٍ : وَذَا الْحَاجَۃِ.

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی لوگوں کونماز پڑھائے یعنی وہ امام بنے تو اس کوچاہیے کہ لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے ہلکی نماز پڑھائے یعنی سنت قراءت کا اہتمام کرے۔کیونکہ ان میں کمزور، بیماراور بڑی عمروالے بھی ہوتے ہیں، ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے۔

اس حدیث کے پیش نظر فقہاء نے فجر اور ظہر میں طوالِ مفصل یعنی سورۂ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک۔اور عشاء اور عصر کی نماز میں اوساطِ مفصل یعنی سورۂ بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک اور مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل یعنی لم یکن سے والناس تک کی سورتوں میں سے قراءت کرنے کو مسنون قرار دیا ہے۔ویسے آیتوں کی مقدار کی بھی فقہاء نے تعیین کر کے بتلائی ہے۔تو جب آدمی سنت قراءت کا اہتمام کرے گا تو اس کو یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس نے تطویل کی یعنی قراءت کو لمبا کیا، بلکہ وہ ایک معتدل مقدار ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ہاں! امامت کی حالت میں اس سے زیادہ طویل قراءت نہیں کرنی چاہیے،اس لئے نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی امام بنے تو وہ ہلکی نماز پڑھائے یعنی زیادہ لمبی قراءت نہ کرے،بس! سنت قراءت پر اکتفاء کرے۔

کیوں؟ ﴿فَاِنَّ فِیْهِمُ الضَّعِیْفَ وَالسَّقِیْمَ وَالْكَبِیْرَ﴾ اس لئے کہ جو لوگ جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آئے ہوئے ہیں اس میں بعض لوگ پیدائشی طور پر ایسے کمزور ہیں کہ زیادہ لمبی قراءت کا تحمل نہیں رکھ سکتے،اور ان میں کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے جو اپنی بیماری کی وجہ سے اس بات کا تحمل نہیں رکھتے کہ لمبی قراءت کی جائے،اور کچھ بڑی عمر کے بوڑھے ہوتے ہیں کہ بوڑھاپے کی وجہ سے ان کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں،وہ بھی طویل قراءت کا تحمل نہیں رکھ سکتے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَذَالْحَاجَةِ﴾ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حاجتمند یعنی کام والے ہیں۔جیسے کسی کو بس یا گاڑی پکڑنی ہے اور وہ اپنا ایک نظام لے کر آیا ہے کہ فلاں جگہ اتنے وقت پر جماعت کھڑی ہوتی ہے،اب اگر امام صاحب سنت قراءت کے

مطابق نماز پڑھائیں گے تو دس منٹ میں نماز ہو جائے گی اور مَیں اطمینان سے اپنی بس یا گاڑی پکڑلوں گا اور یہاں پر امام صاحب نے سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا جی اُدھر اٹکا ہوا ہے، یہاں قراءت ہو رہی ہے اور وہ بیچارہ پریشان ہو رہا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جماعت میں شریک ہونے والے مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کی رعایت بہت ہی ضروری ہے۔

اس سے زیادہ شفقت اور کیا ہوسکتی ہے؟

اس روایت کو لانے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مختلف قسم کے ضرورت مند، کمزور یا بیمار لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے نماز کے اندر بھی امام کو حکم دیا کہ ہلکی قراءت کرے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ شفقت اور کیا ہوسکتی ہے کہ نماز میں بھی امام کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ زیادہ لمبی قراءت نہ کرے۔ مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں، اگر آپ لمبی قراءت کریں گے تو ان کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی، شفقت اور مہربانی کا تقاضا یہی تھا جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور اسی تقاضہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے امام کو اس بات کا پابند کیا کہ زیادہ لمبی قراءت نہ کرے۔

بخاری شریف میں قصہ موجود ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دن رات حاضر رہتے تھے، رات کو اپنی مسجد میں آجاتے تھے، اور اپنے محلے کی مسجد میں عشاء کی نماز وہی پڑھایا کرتے تھے، ایک روز ذرا دیر سے پہنچے، لوگ انتظار میں تھے جب نماز پڑھائی اور قراءت ذرا طویل کر دی تو ایک آدمی نے نماز توڑ کر اپنی الگ پڑھ لی۔ بعد میں لوگوں نے حضرت معاذ سے کہا کہ جب آپ نے لمبی قراءت کی تو فلاں صاحب نماز

توڑکراپنی علیحدہ نماز پڑھ کر چلے گئے۔حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ منافق معلوم ہوتا ہے،اس آدمی کو بھی معلوم ہوا کہ ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے،تو اس نے کہا کہ میں کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کروں گا۔دوسرے روز ان صحابی نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم کام کاج والے آدمی ہیں،دن بھر اپنی کھیتی اور باغات کے اندر پانی پلاتے ہیں اور دوسرے کام کرتے ہیں،دن بھر کے تھکے ہوئے جب رات کو دیر سے آئے تو امام صاحب نے قراءت لمبی شروع کردی،اس لئے میں نے اپنی نماز توڑ دی اور الگ پڑھ لی،اس پر وہ مجھے کہہ رہے ہیں کہ منافق ہوگیا۔یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ پر بہت زیادہ ناراض ہوئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اتنے زیادہ ناراض ہوئے کہ اس سے زیادہ ناراض پہلے نہیں دیکھا گیا اور مارے غصہ کے چہرہ سرخ ہوگیا اور آپ نے فرمایا﴿أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَامُعَاذُ؟﴾ اے معاذ! کیا آپ لوگوں کو فتنہ اور آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ ان کے اس طریقہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو بہت سخت تنبیہ فرمائی۔ (بخاری شریف،۷۰۵)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا اس روایت کو پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ باب کا عنوان ’’مسلمانوں کے ساتھ شفقت و رحمت‘‘ کا قائم کیا ہے۔اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام کو مقتدیوں کے ساتھ شفقت کی تعلیم دے رہے ہیں اس لئے کہ جب امام لمبی قراءت کرے گا تو بیچارے لوگ پریشانی اور دقت میں پڑ جائیں گے،ان لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے امام تک کو یہ تاکید کی گئی کہ قراءت مختصر کرے۔

﴿وَاِذَاصَلّٰى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَآءَ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہاں! اکیلے اپنی نماز پڑھو تو جتنی چاہو قراءت لمبی کرو،اپنی نفلوں میں سورۂ بقرہ پڑھو،اس میں کوئی

حرج کی بات نہیں ہے، کسی دوسرے پر اس کا بار پڑنے والا نہیں ہے، اس کی وجہ سے کوئی دوسرا پریشانی میں مبتلا ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن آج کل معاملہ برعکس ہو گیا ہے، ہم اپنی پڑھتے ہیں تو جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں اور جب کسی کو پڑھانے کی نوبت آتی ہے تو قراءت طویل کرتے ہیں حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگوں کو نماز پڑھاوے تو ہلکی پڑھاوے۔

ایک لطیفہ

ہلکی کے اوپر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہلکی یعنی سنت قراءت کی رعایت کرتے ہوئے مختصر قراءت کرنا۔ کسی جگہ پر امام صاحب بہت ہل ہل کر نماز پڑھا رہے تھے۔ جب سلام پھیرا تو کسی نے پوچھا کہ آپ بہت ہل رہے تھے، کیا بات ہے؟ تو امام صاحب نے کہا کہ کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کو نماز پڑھائے تو ہلکے پڑھائے۔ اس میں یاء مجہول لکھی تھی، اور پرانے زمانہ کی کتابوں میں یاء لمبی لکھتے تھے۔ یعنی لکھا ہوا تھا ''ہلکی'' لیکن امام صاحب اس کو ''ہلکے'' پڑھ رہے تھے۔ اس لئے کہا کہ کتاب میں ہے کہ ہلکے نماز پڑھاؤ، اس لئے مَیں نے ہلکے نماز پڑھائی۔

ذمہ دارانِ مسجد کے لئے ایک زرّین مشورہ

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے نماز کو مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے مختصر پڑھانے کی تعلیم دی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب نماز میں اتنا اہتمام کیا گیا تو دوسری چیزوں میں کیوں نہ کیا جائے؟ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض جگہوں پر اس معاملہ میں خاص طور پر جمعہ کی نماز میں بہت زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے۔

مثلاً جمعہ کی نماز کے لئے آپ نے اپنے بورڈ پر وقت مقررہ لکھا ہوا ہے کہ جمعہ ڈیڑھ

بجے ہوگا۔اب مقرر صاحب کی تقریر ہو رہی ہے،اور تقریر کرتے کرتے پونے دو ہوگئے اور خطبہ شروع نہیں ہوا۔اب ایک آدمی جب مسجد میں آیا تھا تو اس نے بورڈ پر لکھا ہوا دیکھ لیا تھا کہ یہاں خطبہ ڈیڑھ بجے ہوتا ہے،اور اس کی گاڑی کا وقت سوا دو بجے ہے، چنانچہ اس نے سوچا کہ یہاں نماز پڑھ کر رکشہ پکڑ لیں گے اور ان شاء اللہ گاڑی مل جائے گی،لیکن یہاں تقریر لمبی ہو رہی ہے،اور درمیان سے اٹھ کر جانا بھی مشکل ہے،اس لئے کہ اگر درمیان سے اُٹھ کر جائے تو کوئی کہے گا کہ منافق ہے،نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پریشانی میں مبتلا ہوگا۔

آج کل اس کی رعایت نہیں کی جاتی ہے، یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔اگر ایسا ہی ہے تو مَیں کہا کرتا ہوں اور فتویٰ میں بھی لکھا کرتا ہوں کہ آپ بورڈ پر لکھ دیں کہ جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر رکھی ہے،مقرر صاحب جب تقریر ختم کریں گے؛اس وقت خطبہ شروع ہوگا،اس لئے وقت کی کوئی تعیین نہیں ہے۔اور اگر آپ نے وقت متعین کیا ہے تو مقرر صاحب کو پابند کیجیے کہ آپ کو تقریر اس سے پہلے ختم کرنی ہے،اس سے زیادہ آپ تقریر نہیں کریں گے۔ایسا ہونا چاہیے، ورنہ بڑی پریشانی ہوتی ہے، جب نبی کریم ﷺ فرض نماز کو مختصر کرنے کا حکم دے رہے ہیں اور اس میں اتنی تاکید فرما رہے ہیں تو پھر تقریر کی کیا بات ہے۔

نبی کریم ﷺ کی امت پر شفقت کا ایک نمونہ

۲۲۹۔ وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: اِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَيَدَعُ الْعَمَلَ، وَهُوَ يُحِبُّ أَن يَّعْمَلَ بِهٖ، خَشْيَةَ أَن يَّعْمَلَ بِهِ النَّاسُ، فَيُفْرَضَ عَلَيْهِمْ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کبھی کبھی کوئی نفل کام اپنے لئے شروع کرتے تھے اور آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام بھی اس نفل کام کو کرنے لگ جاتے تھے،اب

آپ خود دل سے تو یہ چاہتے تھے کہ اس کام کو کریں، لیکن پھر آپ دیکھتے کہ مجھے دیکھ کر صحابہ نے بھی شروع کیا ہے، تو اس وقت آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کام فرض نہ کر دیا جائے۔ کیونکہ لوگ کرنے لگیں گے اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم کر دیا گیا تو پھر اس کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے کرنے پر کیسے فرض ہوگا؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی موجودگی میں نبی جب کوئی عمل شروع کرتے ہیں اور امتی بھی نبی کے اس عمل کو دیکھ کر شروع کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو وہ عمل ایسا پسند آجاتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عمل کو لازم کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے نبی جب تک موجود ہیں تب تک تو اس کا احتمال ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو واجب اور فرض قرار دیا جائے لیکن نبی کی دنیا سے تشریف بری کے بعد اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال! یہاں پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی آپ جو عمل کرتے تھے اور آپ کا بھی جی چاہتا تھا کہ مَیں یہ عمل کروں، لیکن آپ کو دیکھا دیکھی صحابہ نے یہ عمل شروع کر دیا تو آپ چھوڑ دیتے تھے، اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ہو جائے اور پھر عمل نہ ہو پائے۔ چنانچہ اس کا نمونہ موجود ہے۔

تراویح کا واقعہ

رمضان المبارک کے مہینہ میں نبی کریم ﷺ اعتکاف میں تھے، اعتکاف کے لئے آپ نے چٹائی کا حجرہ بنایا تھا یعنی چٹائی کو کھڑا کر دیا تھا اور اس میں آپ نے رات کے وقت نفلیں شروع کیں، کسی نے حجرہ میں دیکھا کہ آپ نفلیں پڑھ رہے ہیں، پہلے روز کچھ لوگ

موجود تھے، انہوں نے دیکھا تو وہ بھی آپ کے ساتھ جماعت میں شریک ہوگئے۔لوگوں میں تو نئی بات کا چرچا ہوتا ہی ہے۔ پہلے روز گنے چنے لوگ تھے، ان کی وجہ سے دوسروں کو بھی پتہ چلا، دوسرے روز کچھ اور لوگ بھی آ گئے اور وہ بھی شریک ہوگئے اور تیسرے روز تو اور زیادہ شہرت ہوگئی، مزید کچھ لوگ آ گئے اور مجمع بڑھ گیا۔اور چوتھے روز تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی کو پتہ چلا ہوگا تو سب ہی آ گئے، لیکن اس روز آپ ﷺ باہر نکلے ہی نہیں، تین روز پر معاملہ ختم ہوگیا۔اب چوتھے روز سب لوگ آئے تھے لیکن جب آپ ﷺ باہر تشریف نہیں لائے تو لوگوں نے کھنکھارنا شروع کیا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں دروازے پر مار رہے تھے تا کہ آپ کو اطلاع ہو جائے کہ ہم آ گئے ہیں، لیکن حضور ﷺ نکلے ہی نہیں۔دوسرے روز آپ نے فرمایا کہ مَیں تم لوگوں کی سب حرکتیں دیکھ رہا تھا لیکن مَیں اس لئے نہیں نکلا کہ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں صلوٰۃ اللیل تم پر فرض کر دی جائے اور پھر تم اس کو نباہ نہ سکو، اور اگر تم اس پر عمل نہ کر سکو گے تو پھر بڑی پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (بخاری شریف، ۷۲۹۰)

بعد میں تکلیف ہو، مَیں یہ نہیں چاہتا

یہاں بتلانا یہ ہے کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ شفقت، رحمت اور ہمدردی کا معاملہ کرنا چاہیے، تو دیکھو! حضور ﷺ کو امت کے ساتھ کتنی ہمدردی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت فرض کی جائے گی تو کوئی مفت میں تو نہیں کرائی جائے گی، اس کا اجر و ثواب بہت زیادہ ملنے والا ہے اور بندوں کے لئے تو اللہ کی عبادت کرنا سعادت مندی کی بات ہے، لیکن پھر بھی اگر وہ فرض کر دی جاتی ہے اور کوئی ایک بندہ بھی نہیں کرتا تو اس پر تو مصیبت آ جائے گی۔ گویا اس عبادت کے نہ کرنے پر جو سزا اور

عتاب ہونے والا ہے اس سے بچانے کے لئے نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ بعد میں تکلیف ہو، مَیں یہ نہیں چاہتا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کو امت کے ساتھ کتنی شفقت تھی، آپ ﷺ کی ذات ہمارے لئے نمونہ واسوہ ہے اور آپ کا عمل ہمارے سامنے موجود ہے، تو ہمیں بھی ہر مسلمان کے ساتھ اسی طرح شفقت ورحمت اور محبت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

صومِ وصال سے ممانعت بوجہ شفقت علیٰ الامۃ

۲۳۰. وعنها قالت: نَهَاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ رَحْمَةً لَهُمْ، فَقَالُوا: اِنَّکَ تُوَاصِلُ؟ قَالَ: اِنِّیْ لَسْتُ کَهَيْئَتِکُمْ، اِنِّیْ أَبِيْتُ يُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَيَسْقِيْنِیْ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو صومِ وصال سے منع فرمایا۔

صومِ وصال روزہ کی ایک قسم ہے۔یعنی اس طرح روزہ رکھنا کہ درمیان میں افطار نہ کرے۔مثلاً آپ نے پہلی تاریخ سے روزہ رکھنا شروع کیا تو پانچ تاریخ تک مسلسل اس طرح روزے رکھے کہ درمیان میں افطار کیا ہی نہیں۔ہم لوگ جو روزے رکھتے ہیں تو مغرب کے بعد افطار کا انتظام کرتے ہیں اور اگر دوسرے دن بھی روزہ رکھنا ہے تو دوسرے دن سحری کھا کر صبح صادق کے بعد سے کھانا پینا بند کرتے ہیں اور غروب تک اس طرح سے رہتے ہیں گویا صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ ہوتا ہے، تو اتنے ہی وقت میں کھانے پینے سے رکنا ہے اور غروبِ آفتاب کے بعد صبح صادق تک کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔لیکن صومِ وصال کا مطلب یہ ہے کہ غروب تا صبح صادق جتنا وقفہ ہوتا ہے اس میں بھی کچھ کھاوے پیوے نہیں پہلے روز آپ نے سحری کی تو مسلسل روزہ ہی رکھا، درمیان میں نہ کچھ کھایا، نہ کچھ پیا۔اس

طرح مسلسل روزے رکھتے چلے جانے کو صومِ وصال کہتے ہیں۔ حضور ﷺ اس طرح روزے رکھتے تھے، آپ کو دیکھا دیکھی صحابہ بھی رکھتے تھے، جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ صحابہ بھی ایسا کررہے ہیں تو آپ نے منع فرمادیا کہ تم صومِ وصال مت رکھو۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ تو صومِ وصال رکھتے ہیں؟ ان کا یہ کہنا بطورِ اعتراض نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ آپ تو معصوم ہیں آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو قرب حاصل ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں، آپ اتنے اونچے مقام پر فائز ہونے کے باوجود اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اور ثواب حاصل کرنے کے لئے اس طرح روزے رکھ رہے ہیں، تو ہم تو بہت دور ہیں، اور گناہوں میں ملوث رہتے ہیں اور ہم کو وہ مقامِ قرب بھی حاصل نہیں؛ اس لئے ہم کو تو آپ سے بھی زیادہ محنت کرنی چاہیے؛ لہٰذا جب آپ رکھ رہے ہیں تو ہم کو کیوں منع فرماتے ہیں؟ یہ سوال اعتراض کے طور پر نہیں تھا۔

﴿ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے ﴾

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿اِنِّیْ لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ﴾ یعنی مَیں جو صوم وصال رکھتا ہوں تو میرا معاملہ تمہارے جیسا نہیں ہے، تم اگر اس طرح مسلسل روزے رکھتے چلے جاؤ گے، تو اس کو برداشت نہیں کرسکو گے، تمہاری قوت پر اثر پڑے گا اور تم کمزور ہوجاؤ گے، لیکن میرا معاملہ ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ مَیں تو ایسی حالت میں رات گذارتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

کھلانے پلانے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی کو کھانا کھانے اور پانی پینے سے قوت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ مجھے وہ قوت بغیر کھائے پیئے ہی عطا فرمادیتے ہیں

اس لئے اگر میں کھاتا پیتا نہیں ہوں اور میری دیکھا دیکھی تم بھی ایسا کرنے جاؤ گے تو تم کمزور پڑ جاؤ گے، اور اس طرح مجاہدہ کرنے اور مسلسل روزے رکھنے کی وجہ سے جو تکلیف و مشقت پیش آئے گی؛ تم اس کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ پھر آگے چل کر کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا یہ مجاہدہ دوسری ضروری عبادتوں سے رکنے کا ذریعہ بن جائے۔

''میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے'' اس کا مطلب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں ﴿یَجۡعَلُ فِیَّ قُوَّۃَمَنۡ أَکَلَ وَشَرِبَ﴾ جیسے کوئی آدمی کھاتا پیتا ہے، اس سے اس کو جو قوت حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے وہ قوت بغیر کھائے پیئے بھی عطا فرما دیتے ہیں، اس لئے میں تو ایسا کرتا ہوں، لیکن تم ایسا مت کرو۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو صومِ وصال سے کیوں منع فرمایا؟ اسی حدیث کے اندر اس کی وجہ بھی موجود ہے ﴿رَحۡمَۃً لَّھُمۡ﴾ ان کے ساتھ شفقت و مہربانی کرتے ہوئے اور ان کا خیال کرتے ہوئے۔ جیسے ہمارا بچہ کوئی ایسا کام شروع کر دے جو اس کے تحمل سے اونچا ہو تو ماں باپ منع کر دیتے ہیں کہ بیٹا ایسا مت کرو۔ جیسے بچہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا ہے تو ماں باپ زبردستی سلا دیتے ہیں، ویسے اس کا پڑھائی کے اندر محنت کرنا ماں باپ کو بھی پسند ہے لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ آرام کرو۔ اسی طرح یہاں پر بھی نبی کریم ﷺ نے شفقت اور رحمت کے طور پر امت کو منع فرمایا۔

﴿کہیں بچہ کی ماں رنجیدہ نہ ہو﴾

۱۲۳۱۔ وعن أبی قتادۃ الحارث بن ربعی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اِنِّیۡ لَأَقُوۡمُ اِلَی الصَّلٰوۃِ، وَأُرِیۡدُ أَنۡ أُطَوِّلَ فِیۡھَا، فَأَسۡمَعُ بُکَآءَ الصَّبِیِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِیۡ صَلٰوتِیۡ کَرَاھِیَۃَ أَنۡ أَشُقَّ عَلٰی أُمِّہٖ.

نماز کے سلسلہ میں مَیں نے اوپر جس روایت کا حوالہ دیا تھا وہ روایت یہی ہے۔
حضرت قتادہ حارث بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبھی میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو میرے جی میں ایسا ارادہ ہوتا ہے کہ نماز ذرا لمبی پڑھاؤں گا یعنی طویل قراءت کروں گا، لیکن نماز شروع کرنے کے بعد جب بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں (چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں بھی نماز کے لئے مسجد میں حاضری دیتی تھیں) مطلب یہ ہے کہ میں نے جس چیز کا یعنی طویل قراءت کا ارادہ کیا ہوتا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہوں اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کہیں لمبی قراءت کر کے میں اس کی ماں کو مشقت میں ڈال دوں؛ اس لئے نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ اوپر کی روایت میں نمازیوں کی اور ان کے مصالح کی رعایت کی تھی کہ جو نمازی آئے ہیں وہ ضعیف ہیں، یا بیمار ہیں یا بوڑھے ہیں۔ تو ان کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام کو کہا گیا تھا کہ نماز کو لمبی مت کرنا۔ اور یہاں تو ایک ایسی شخصیت کی رعایت کی جارہی ہے جو نماز میں بھی نہیں بلکہ نماز کے باہر ہے یعنی جو بچہ رو رہا ہے وہ نماز کے باہر ہے، اس کی آواز سن کر محض اس کی وجہ سے کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ پہنچے اور اس کے لئے یہ نماز مشقت کا باعث نہ بن جائے کہ وہ سوچے گی کہ کب نماز پوری ہو کہ میں اپنے بچے کے پاس جاؤں؛ اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کہ کہیں میں نماز کو طویل کر کے اس کی ماں کو رنجیدہ کروں۔

اسی طرح روایات کے اندر آتا ہے کہ کبھی آپ پہلی رکعت کے اندر طویل سورت تلاوت کرتے تھے اور دوسری رکعت کے اندر بچہ کے رونے کی آواز آتی تو تین آیات پڑھ کر

رکوع کردیتے یعنی بہت مختصر قراءت فرماتے (صحیح مسلم، ۱۰۸۳) آپ ﷺ نے اپنے عمل سے امت کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شفقت و رحمت کی تعلیم دی ہے۔

بہر حال! بچہ تو نماز کے باہر ہے، اس کی بھی اتنی رعایت فرمائی کہ اس کی آواز پر نماز مختصر کردی، اگرچہ پانچ سو نمازیوں میں سے وہ بچہ کسی ایک ہی کا ہے، لیکن پھر بھی اس ایک کی بھی اتنی رعایت فرمائی۔ اس سے یہی تعلیم دینی مقصود ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور رحمت یعنی رحم و کرم کا معاملہ کرو۔

کہیں اللہ تعالیٰ آپ سے مطالبہ نہ کر بیٹھیں

۲۳۲. وعن جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ صَلّٰی صَلاةَ الصُّبحِ فَهُوَ فِیْ ذِمَّةِ اللهِ، فَلا يَطْلُبَنَّكُمُ اللهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَیْءٍ، فَاِنَّهٗ مَن يَّطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَیْءٍ يُدْرِكُهُ، ثُمَّ يَكُبُّهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّم.

حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی فجر کی نماز پڑھے گا یعنی فجر کی نماز اپنے وقت میں باجماعت ادا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی امان میں آجاتا ہے۔ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عہد و پیمان میں آگیا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ امان اور حفاظت میں رہے گا۔ حضور ﷺ دوسروں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ اپنے وقت پر پڑھی اور وہ آدمی اللہ کی حفاظت اور امان میں ہے، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے ذمہ کے توڑنے کے معاملہ میں کسی چیز کا مطالبہ کرے۔ یعنی حضور ﷺ دوسرے مسلمانوں کو خطاب کر رہے ہیں کہ دیکھو!

جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو وہ اللہ کے امان میں ہے،اب اگر تم اس کو کچھ گزند اور تکلیف پہنچاؤ گے تو گویا جس آدمی کو اللہ نے امان دے رکھی ہے اس کو تم تکلیف پہنچا رہے ہو، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے مطالبہ ہوگا کہ میں نے جس کو امان دی تھی تم نے اس کو کیوں تکلیف پہنچائی؟ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے ذمہ کے معاملہ میں مطالبہ کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ کے بارے میں جب کسی سے مطالبہ کرے گا تو پھر وہ آدمی اللہ کی پکڑ سے وہ چھوٹ نہیں سکتا، پھر اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا، گویا مسلمانوں کو تاکید کی جارہی ہے کہ جس آدمی نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی ہو، ایسے آدمی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کریں کہ جس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے دی گئی امان کو توڑنے والے شمار ہوجائیں۔

﴿ آپسی رشتہ کی بنیاد ایمان ہے ﴾

۲۳۳. وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لایَظْلِمُهُ وَلایُسْلِمُهُ، مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً؛ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔یعنی ایمان لانے کی وجہ سے اس ایمان کے دائرے میں آکر سب بھائی بھائی ہوگئے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات)﴾ قرآن پاک میں بھی کہا گیا کہ اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔جیسے ایک ماں کے پیٹ میں سے جو دو شخصیتیں وجود میں آئیں تو وہ دونوں بھائی کہلاتے ہیں؛ یہ نسبی رشتہ ہے، اسی طرح سے ایمان لانے کے نتیجے میں بھی

دونوں آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے، گویا یہ رشتہ ایمان کی نسبت پر قائم ہوا۔ اس لئے کہ ایک ایمان والے نے ایمان لاکر اپنا رشتہ اللہ سے جوڑا، اور دوسرا بھی ایمان لایا تو اس نے بھی اپنا رشتہ اللہ سے جوڑا، اور اس رشتہ کے جڑنے کے نتیجہ میں دونوں ایمان کے اعتبار سے بھائی بھائی ہوئے، اور یہ قرب بھی ایمان کی وجہ سے ہے۔

مَیں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے آپ کے یہاں فون لگا ہوا ہے جس کا کنکشن (Connection) ایکسچینج (Exchange) کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی آپ کے پڑوس ہی میں رہتا ہے، اس کا بھی فون ہے جس کا کنکشن ایکسچینج کے ساتھ ہے۔ اب آپ اس کے یہاں جب فون جوڑیں گے تو وہ سیدھا اس کے وہاں نہیں جائے گا، بلکہ پہلے ایکسچینج میں جائے گا اور وہاں سے اس کے یہاں جڑے گا، گویا جب آپ نے اپنا تعلق ایکسچینج کے ساتھ جوڑ لیا اور اس نے بھی جوڑ دیا تو دونوں کا تعلق آپس میں جڑ گیا۔

تو جو آدمی ایمان لاتا ہے وہ اپنا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ جوڑتا ہے اب دوسرا آدمی بھی جب ایمان لایا اور اپنا تعلق اللہ کے ساتھ قائم کرلیا؛ تو نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کا آپس میں ربط قائم ہوگیا اور ایک تعلق پیدا ہوگیا۔ تو جیسے بندہ ایمان لاکر اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے، اسی تعلق کے بناء پر وہ ساری مخلوقات سے تعلق رکھتا ہے، اور اسی تعلق کی بناء پر وہ سارے حقوق بھی ادا کیا کرتا ہے۔ ماں باپ کا حق بھی وہ اسی نسبت سے ادا کرتا ہے۔ بھائی بہنوں کا حق بھی اسی نسبت سے ادا کرتا ہے۔ بیوی کا بھی ادا کرتا ہے۔ بیوی بھی اس کا حق اسی نسبت سے ادا کرتی ہے۔ اسی طرح پڑوسی کا حق، اور دوسرے تمام مسلمانوں کا حق بھی اسی تعلق کی وجہ سے ادا کرتا ہے۔ سارے حقوق ادا کرتا ہے اس وجہ سے کہ وہ ایمان لایا ہے اور

اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا تو یہ سارے حقوق ایمان کے نتیجے میں اس پر لاگو پڑ جاتے ہیں۔

اسی طرح جتنے بھی حقوق ہیں سب کا ادا کرنا ضروری ہے۔تمہارے اوپر ماں باپ کی بات ماننا واجب ہے،لیکن وہاں بھی یہ قاعدہ آ جائے گا کہ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم کریں کہ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ﴿لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ﴾ مخلوق کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی بات مانو،اس لئے یہ مان رہا ہے،جب اللہ تعالیٰ کے کہنے سے اس کی بات مان رہے تھے اب اگر وہی ہم کو ایسی بات کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آ رہی ہے؛ تو پھر ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔

جیسے کسی کے ساتھ آپ کا تعلق کسی کی وجہ سے ہو،اور وہ کہے کہ اس سے تعلق مت رکھو،تو ہم کہیں گے کہ تیرے ساتھ تعلق تو اس کی خاطر ہی رکھا ہے،اب تو ہی اس سے تعلق رکھنے کو منع کر رہا ہے؛ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تجھ سے ٹوٹ سکتا ہے لیکن اس سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

﴿مظلوم مسلمان کا حق﴾

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے،تو ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں جتنے بھی مؤمن ہیں سب کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا۔اب اس تعلق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا،کسی کا کوئی حق نہیں مارے گا،کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہیں کرے گا اور کسی کو کسی دشمن کے حوالے نہیں کرے گا۔یعنی کوئی دشمن اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو اور ایک مسلمان بھائی دیکھ رہا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو بچا سکتا ہے پھر بھی نہ بچائے۔ایک مسلمان

بھائی کا فرض ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے، وہ اس کو دشمن کے حوالہ کبھی نہیں کرسکتا، بلکہ اس کے ظلم سے بچائے گا اور اس کی طرف سے ہونے والی زیادتی سے مسلمان کو بچانا ضروری ہے۔

اسی لئے دنیا کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں کے ساتھ اگر زیادتی ہو رہی ہو تو پہلے نمبر پر تو یہ حکم ہے کہ وہ مسلمان جن کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، وہ خود طاقت رکھتے ہوں تو خود اس زیادتی کو دور کرنے کی کوشش کریں، یعنی ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو خود دور کر سکتے ہیں تو پھر دوسروں پر لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کو دور کریں تو آس پاس رہنے والے لوگوں پر ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ ان پر ہونے والے ظلم کو ختم کریں۔ اگر آس پاس کے لوگ ان کو بچانے پر قادر نہیں ہیں، یا قادر تو ہیں لیکن توجہ نہیں کر رہے ہیں اور مدد بھی نہیں کرتے؛ تو اب یہ ذمہ داری ان کے قریب والوں پر یعنی اس کے بعد والوں پر آئے گی، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے دنیا کے دوسرے کونے تک کے رہنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور اگر کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرتا تو سب کے سب گنہگار رہوں گے۔ کتابوں میں صراحتاً یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں ﴿لَا یَظْلِمُهُ وَلَا یُسْلِمُهُ﴾ یعنی نہ خود اس پر ظلم کرے گا، نہ اس کو کسی دشمن کے حوالے کرے گا کہ وہ اس پر ظلم کرے۔

﴿نفس و شیطان کا مظلوم﴾

اسی طرح لکھا ہے کہ اپنے نفس کی طرف سے ہونے والی زیادتیاں اور شیطان کے طرف سے ہونے والی زیادتیوں سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ نفس بھی

ہمارا دشمن ہے ﴿اِنَّ أَعْدیٰ عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ﴾ تمہارا بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے پہلو کے اندر ہے۔اور شیطان بھی تمہارا دشمن ہے ﴿اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔تو جب شیطان بھی دشمن ہے اور نفس بھی دشمن ہے،تو اپنی ذات کو ان کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

﴿جزاء من جنس العمل﴾

﴿مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَۃِ أَخِیْہِ کَانَ اللہُ فِیْ حَاجَتِہٖ﴾ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی بھی اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی میں اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہوتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس حاجت پورا کرنے والے کی حاجت پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں،یعنی اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔

﴿وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَۃً؛ فَرَّجَ اللہُ عَنْہُ بِھَا کُرْبَۃً مِّنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ﴾ اور جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیف کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔

شراح نے لکھا ہے ﴿مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَۃً﴾ میں جو تنوین ہے وہ تحقیر کے لئے ہے اور ﴿فَرَّجَ اللہُ عَنْہُ بِھَا کُرْبَۃً﴾ کے اندر جو تنوین ہے وہ تعظیم کے لئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی دنیا کی معمولی سی تکلیف کو آپ دور کریں گے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے ﴿اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عَیَالُ اللہِ﴾ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے ﴿فَأَحَبُّ الْخَلْقِ اِلیٰ اللہِ أَنْفَعُھُمْ لِعَیَالِہٖ﴾ مخلوق میں سب سے زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو وہ آدمی

ہے جو مخلوق کو فائدہ پہنچائے۔ (المعجم الکبیر، ۱۰۰۳۳)

جیسے آپ کسی کے بیٹے کی تکلیف کو دور کریں تو جب اس کو معلوم ہوگا تو وہ بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرے گا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ اس سے زیادہ محبت ہے جتنی باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔تو جب آپ اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف و پریشانی کو دور کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کی تکلیف کو دور کرے گا۔

﴿وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا یعنی اس کے عیب کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کریں گے، یعنی آپ کو اپنے کسی مسلمان بھائی کا کوئی عیب معلوم ہوا، کوئی کمزوری اور کوئی فالٹ (fault) آپ کے علم میں آیا تو آپ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کریں، اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور مؤمن ہے، اللہ کے ساتھ اس کا ایک تعلق ہے، اگر اس تعلق کا خیال کرتے ہوئے آپ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آپ کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔اور اگر اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا اور رسوا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو رسوا کرے گا اور جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کر دے تو پھر وہ بچ نہیں سکتا، لہٰذا یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اور عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں، اور لوگوں کے فالٹ تلاش کرتے رہتے ہیں، کمزوریوں کی جستجو میں لگے رہتے ہیں کہ اس میں کیا کمزوری ہے، اور جہاں ان کے علم میں کوئی بات آئی کہ بس پھر دنیا میں اس کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں، ایسے آدمیوں کے لئے خطرناک وعید ہے۔اس سے اپنے آپ کو بچانا بہت ہی ضروری ہے۔

سارا دار و مدار نیت ہی پر ہے

البتہ کسی آدمی کے اندر ایسا عیب ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ برابر اس برائی میں مبتلا ہے اور آئندہ بھی اس سے نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے تو اس کے نقصان سے دوسروں کو بچانا بھی ضروری ہے۔ جیسے ایک آدمی میں چوری کی عادت ہے اور کئی لوگوں کو نقصان پہنچ چکا ہے، اور وہ کسی کے یہاں جا کر مہمان بنا ہوا ہے، تو ایسے آدمی کے بارے میں آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! اس سے ذرا چوکنّا رہنا۔

یا کسی آدمی کو قرض لینے کی عادت ہے اور پھر وہ ادا نہیں کرتا، آپ بھی اس کی اس عادت کا شکار ہو چکے ہیں، اور آپ نے دیکھا کہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ محبت بڑھا رہا ہے تو آپ نے کہا کہ فلاں سے قرض کے معاملہ میں بچ کر رہنا؛ تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن نیت اس کے عیب کو کھولنے کی نہ ہو، بلکہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو اس کی طرف سے پہنچنے والے نقصان سے بچانے کی نیت ہو۔ نیت کے اوپر ہی سارا دار و مدار ہے۔ اس نیت سے کہو گے تب ہی اجازت ہے۔ اور اگر اس کی تنقیص کی نیت سے کہو گے اور اس کا عیب کھولنے کی نیت سے کہو گے تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

نیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک ہی کام میں نیت بدل جانے کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے۔ جیسے آپ کہیں جا رہے تھے اور راستہ میں گھڑی پڑی ہوئی دیکھی، تو اگر اس گھڑی کو آپ اس نیت سے اٹھاتے ہیں کہ اس کے مالک تک پہنچائیں گے تب تو اٹھانا جائز ہے۔ بلکہ کسی ایسی جگہ پڑی ہوئی ہو کہ اس جگہ کے بارے میں آپ کو خیال ہو کہ مَیں تو اتفاقی طور پر

یہاں آ گیا، ورنہ تو یہ ایسی جگہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا یہاں آئے گا اور اگر مَیں نہیں اٹھاؤں گا تو یہ گھڑی یہیں پڑی پڑی ضائع ہو جائے گی؛ تو ایسی صورت میں مسلمان کی چیز کو ضائع اور برباد ہونے سے بچانے کے لئے اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

بہرحال! اس نیت سے گھڑی اٹھانا کہ مالک تک پہنچا دوں گا تو یہ جائز ہے، اور اگر آپ اس نیت سے اٹھائیں کہ مَیں استعمال کروں گا تو حرام اور ناجائز ہے۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کی کمزوری اور بری عادت سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس کے نقصان سے بچانے کے لئے کسی سے کہیں تو یہ جائز ہے، لیکن صرف اسی شخص کو کہنے کی اجازت ہے۔ ایسا نہیں کہ پوری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں۔ لیکن اگر اس کی عادت اور عیب کو پھیلانے کی نیت سے لوگوں کے سامنے کہو گے تو پھر اس وعید کے اندر داخل ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ تمام بری عادتوں سے ہماری حفاظت فرمائے

۔اٰمین۔

تَعْظِیْمُ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ

وَبَیَانِ حُقُوْقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَیْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام
اوران کے حقوق کا بیان
اوران کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آنا

مجلس ﴿۳﴾

۱۵/ربیع الاول ۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۱/جولائی ۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

اخوتِ اسلامی کے تقاضے

۲۳۴. وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اَلْمُسْلِمُ أَخُوالْمُسْلِمِ لایَخُونُہُ، وَلایَکْذِبُہُ، وَلایَخْذُلُہُ، کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ حَرَامٌ؛ عِرْضُہُ وَمَالُہُ وَدَمُہُ، اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا، بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِّنَ الشَّرِّأَن یَّحْقِرَأَخَاہُ الْمُسْلِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اسی اخوت اور بھائی ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ خیانت سے پیش نہ آئے، اگر اس نے امانت کے طور پر اس کو کوئی چیز دی ہے تو جس معاملہ میں اس پر اعتماد کیا ہے تو اس امانت میں خیانت نہ کرے، یا جو اعتماد اس نے کیا ہے اس کو مجروح نہ کرے۔ امانت اور خیانت کا مفہوم مَیں پہلے تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

دوسری چیز یہ ہے ﴿ولایَکْذِبُہُ﴾ کہ اس کے ساتھ دروغ گوئی نہ کرے یعنی اس سے جو کچھ بھی کہے سچ سچ کہے، جھوٹی بات نہ کہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے لئے بہت بڑی خیانت ہے کہ وہ کسی کو کوئی بات کہہ رہا ہو تو سننے والا تو اس کو اس کی بات میں سچا سمجھ رہا ہو اور حقیقت یہ ہو کہ وہ اس کو جھوٹ بول رہا ہو۔ یہ بہت بری چیز ہے۔

﴿وَلَا يَخْذُلُهُ﴾ اور اپنے اس مسلمان بھائی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔ یعنی اگر کوئی موقعہ ایسا آوے جہاں اس کو مدد کی ضرورت ہو، ظالم اور دشمن اس کے ساتھ زیادتی کررہا ہے، یا اور کوئی زیادتی کررہا ہے، تو اس صورت میں مسلمان بھائی ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی مدد کرے، اپنی طاقت کے مطابق اس کی مدد کرسکتا ہو تو کرے، اس میں کوتاہی نہ کرے۔

﴿كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مسلمان پورا کا پورا دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ ''پورا کا پورا'' اس کا مطلب یہ ہے ﴿عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُهُ﴾ تین چیزیں ہوتی ہیں ایک تو جان ہے، دوسری چیز اس کی عزت وآبرو ہے اور تیسری چیز اس کا مال ہے۔ گویا مسلمان کی ہر چیز دوسرے پر حرام ہے، نہ تو اس کی جان میں اس کو کوئی تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ اس کی عزت وآبرو میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اس کے مال میں۔ پہلے بھی یہ چیزیں تفصیل سے آچکی ہیں۔

﴿تقویٰ کا سرچشمہ دل ہے﴾

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا﴾ تقویٰ یہاں پر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے سینہ میں قلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ اصل تو کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ آدمی کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ اگر دل میں اللہ کا خوف وخشیت موجود ہے تو وہ ان تمام چیزوں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے؛ اپنے آپ کو بچائے گا۔ تو تقویٰ کا منبع اور تقویٰ جس چیز کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے وہ اللہ کا خوف ہے۔

اس لئے کہ تقویٰ اصل میں تو خارج میں اپنے اعضاء وجوارح کو اور اپنے تمام جسم کو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اور اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا نام ہے، اور آدمی اللہ کی نافرمانی سے اسی وقت بچتا ہے جبکہ اس کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف ہو ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ جو آدمی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا یعنی اس نے سوچا کہ کل کو حشر کے میدان میں اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اعمال کا جواب دینا ہے، اگر مَیں آج اللہ کی منع کی ہوئی چیزیں کروں گا تو کل کیا جواب دوں گا ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ اور نفس کو خواہشات سے روکا؛ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

تو نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ تو حضور فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہاں ہے یعنی دل میں ہے۔ اگر اللہ کا خوف ہوگا تو یقیناً اس کا اثر اس کے جسم اور اس کے اعضاء پر ظاہر ہوگا، اپنی آنکھ کو، کان کو، ہاتھ کو، پاؤں کو، شرم گاہ کو، زبان کو، اور تمام اعضاء کو اللہ کی نافرمانیوں سے بچائے گا۔

انسان کی برائی کے لئے یہی کافی ہے

﴿بِحَسْبِ امْرِىءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَن يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمُ﴾ کسی آدمی کی برائی کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور خاص کر مسلمان کو باعزت بنایا ہے ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ اور ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام ایمان والوں کو مکرم اور باعزت بنایا ہے۔ تو جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے گا گویا اس

نے ایک ایسی ذات اور شخصیت کو حقیر سمجھا جس کو اللہ تعالیٰ نے باعزت بنایا ہے۔اور کسی کو حقیر سمجھنا کبر کی علامت ہے۔

نبی کریم ﷺ سے کبر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا﴿بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ (مسلم شریف، ۲۷۵)﴾حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔کسی کی طرف سے کوئی حق بات پیش کی جائے اور اس کو قبول کرنے سے جب آدمی انکار کرتا ہے تو یہ اس کے تکبر کی علامت ہے،اور لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی کبر کی علامت ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جس کے دل میں ذرّہ برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

بہرحال! کسی بھی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنا بہت بری چیز ہے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مَیں فی الحال ہر مسلمان کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں،اور فی المآل ہر انسان کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں،مطلب یہ کہ کافر کو بھی آئندہ کے اعتبار سے اپنے سے اچھا سمجھتا ہوں۔اس لئے کہ کافر کے متعلق امکان ہے کہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایمان کی توفیق دے دیں،اور اپنے متعلق کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ ہم اپنے ایمان کے ساتھ ہی دنیا سے جائیں گے۔اس لئے جب تک اپنے متعلق اطمینان نہ ہو جائے،آدمی دوسرے کو حقیر کیسے سمجھ سکتا ہے۔لہٰذا کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔کسی کو حقیر سمجھنا؛بڑی خطرناک چیز ہے۔

﴿ایک دوسرے پر حسد نہ کرو﴾

۲۳۵. وعنه قال قال رسول الله ﷺ: لا تَحَاسَدُوْا وَلا تَنَاجَشُوْا ولا تَبَاغَضُوْا وَلا تَدَابَرُوْا،وَلايَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ. وَكُوْنُوْا عِبَادَاللهِ اِخْوَاناً. اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لايَظْلِمُهُ وَلايَحْقِرُهُ وَلايَخْذُلُهُ،اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا— وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلاثَ مَرَّاتٍ —بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّأَن يَّحْقِرَأَخَاهُ الْمُسْلِمِ. كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ؛عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُه.

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے پر حسد مت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا فرما رکھی ہے اس کے متعلق یہ تمنا کرنا کہ اس سے وہ نعمت چھین جائے، اس کے پاس وہ نعمت نہ رہے؛ اس کا نام حسد ہے۔ باقی اگر کسی صاحبِ نعمت کو دیکھ کر یوں خواہش اور تمنا کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایسی نعمت عطا کرے؛ اس کو حسد نہیں کہتے، بلکہ اس کو غبطہ یعنی رشک کرنا کہتے ہیں۔ اور غبطہ جائز ہے۔

حسد میں آدمی یوں تمنا کرتا ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے، چاہے اپنے پاس آئے یا نہ آئے، لیکن اس کے پاس یہ چیز نہیں رہنی چاہیے۔ حقیقت میں حسد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے، گویا اپنے دل میں نعوذ باللہ وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ نعمت کیوں دی۔ اس کو یہ نعمت نہیں ملنی چاہیے۔

یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو اپنی کوئی چیز بلا استحقاق دیں، آپ نے اپنی طرف سے احسان کرتے ہوئے اس کو ایک چیز دی ہے، اور دوسرا شخص بھی آپ ہی کے ماتحت ہے جو یوں سوچے کہ آپ نے یہ چیز اس کو کیوں دی؟ اب اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ فلاں ایسا سوچتا ہے تو کیا آپ اس کے اس خیال کو برداشت کریں گے؟ آپ کہیں گے کہ میری چیز تھی، مَیں جو چاہے کروں۔ اور پھر وہ دوسرا میرا ماتحت ہو کر میرے فیصلے پر اعتراض کرتا ہے۔

اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ جو چیز اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنے فضل اور مہربانی سے عطا فرمائی تو ﴿ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے، جس کو چاہے؛ دے۔ جتنی بھی نعمتیں ہیں، وہ

سب اللہ کی ملک ہیں، اس لئے اس کی مرضی کی بات ہے جس کو چاہے دے۔اب اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا فرمائی تو اس کے متعلق یوں سوچنا کہ اس کے پاس نہ رہے گویا اس نے اللہ کے اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔اس لئے یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

حسد کہاں تک پہنچا دیتا ہے؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس حسد والے جذبے کے نتیجہ میں آدمی نہ جانے کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی اسی حسد کی وجہ سے کفر تک پہنچ جاتا ہے آدمی دوسروں کو جب نقصان پہنچانے پر آتا ہے تو بعض مرتبہ ایسی ایسی تدبیریں اور ایسے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو اس کو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔اسی جذبہ کی وجہ سے وہ سحر کرتا ہے اور سحر کی بہت ساری صورتوں میں کفر لازم آتا ہے۔اسی لئے حسد سے خاص طور پر پناہ مانگی گئی ہے۔یہ سب سے خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

حسد کا علاج

اور اگر کسی کے دل میں حسد کا خیال پیدا ہو تو اس کو دور کرنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جس کے متعلق یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے اس کے لئے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ دے۔جب اپنے نفس کے خلاف ایسا کرے گا تو انشاء اللہ دھیرے دھیرے یہ چیز ختم ہو جائے گی۔اور دوسرا کام یہ کرے کہ جب وہ ملے تو اس کے ساتھ احسان کرے، سلام کرے، اس کو ہدیہ دے تاکہ اس کے متعلق ہمارے دل میں جو جذبہ ہے وہ خود بخود ہی دور ہو جائے۔بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد مت کرو

نجش کی ممانعت

﴿وَلَا تَنَاجَشُوْا﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے خود آگے اس کی تشریح کی ہے کہ جس چیز کے خریدنے کا ارادہ نہ ہو، اس کی قیمت بڑھاتا رہے؛ تاکہ دوسرے لوگ دھوکہ میں پڑ جائیں

یہاں پر ایک چیز ہے کہ کوئی آدمی کوئی چیز بیچ رہا ہے، تو بیچنے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو بیع من یزید یعنی نیلام ہوتا ہے۔ نیلام کے اندر تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی زیادہ قیمت دے کر لے سکتا ہے۔ جیسے آپ نے کہا کہ قیمت بولو، تو ایک آدمی نے کہا کہ مَیں دس روپے میں لینے کے لئے تیار ہوں۔ دوسرا کہتا ہے کہ گیارہ، اور تیسرا کہتا ہے کہ بارہ۔ تو اگر اس کا ارادہ لینے کا ہے، یعنی زیادہ قیمت بتلا کر واقعۃً وہ خریدنے والا ہے؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، یہ جائز ہے۔ اور اس طرح بیچنے کی تمام علماء نے اجازت دی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے خود ایک مرتبہ اس طرح سے بیع فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی آئے اور نبی کریم ﷺ سے کچھ سوال کیا تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک پیالہ اور ایک ٹاٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لے آؤ۔ چنانچہ وہ لے آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو کون خریدے گا؟ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ! مَیں ایک درہم میں خریدتا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اور زیادہ دینے والا کوئی ہے؟ دوسرے صحابی نے کہا کہ مَیں دو درہم دوں گا۔ تو آپ نے ان کو دو درہم میں وہ چیز بیچ دی، اور ایک درہم ان کو دے کر یوں کہا کہ تو اس سے اپنے گھر والوں کے کھانے کی ضرورت پوری کر، اور دوسرے درہم سے کلہاڑی کا پھل- جو لوہے کا ہوتا ہے- خرید کر ایک لکڑی منگوا کر اس میں لگائی اور ان کو دی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ! جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹو اور اس کو لا کر

بازار میں فروخت کرو۔ چنانچہ وہ جنگل میں گیا اور لکڑیاں کاٹ کر لایا، بازار میں فروخت کی، اس سے دھیرے دھیرے کچھ جمع ہو گیا۔ پھر آ کر حضور ﷺ سے عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب تو ہی بتلا کہ یہ تیرے لئے بہتر ہے؟ یا وہ بہتر ہے کہ تو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور پھر ان کی مرضی کی بات ہے کہ تجھے دیں یا نہ دیں۔ (سنن أبی داؤد، ۱۶۴۱)

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور ﷺ نے خود بھی اس طرح سے بیع فرمائی ہے۔ تو نیلام کے طریقے سے جو بیچا جاتا ہے اس میں اگر خریدنے کا ارادہ ہے تو اس کی قیمت بڑھائی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک آدمی مجمع میں ایسا موجود ہے کہ جس کا ارادہ خریدنے کا نہیں ہے، بلکہ وہ محض اس لئے زیادہ بولتا ہے کہ دوسرا آدمی دھوکے میں آ کر اس سے زیادہ قیمت بتلا کر لے لے؛ تو اس کو نجش کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے، یہ حرام ہے۔

کسی کے سودے پر سودا مت کرو

﴿وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلىٰ بَيْعِ بَعْضٍ﴾ تم میں سے کوئی آدمی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ سودے پر سودا نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً میں اپنی کتاب بیچنا چاہتا ہوں تو ایک آدمی میرے پاس آیا اور میرے ساتھ قیمت کی گفتگو کر رہا ہے، لیکن ابھی قیمت طے نہیں ہوئی اور ہم دونوں کسی بات پر آئے نہیں تھے۔ مثلاً دوسرے نے کہا کہ سات روپے میں مجھے دے دو۔ ابھی یہ بات پوری نہیں ہوئی تھی اور ہم دونوں متفق بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس سے پہلے تیسرے نے کہا کہ میں دس میں خریدتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ اچھا! تم لے لو۔ تو تیسرے کے لئے اس طرح قیمت زیادہ بتلانا جب تک کہ پہلے والا ابھی کسی بات پر جما نہیں تھا، اور دونوں متفق نہیں ہوئے تھے؛ یہ جائز ہے۔

لیکن اگر پہلے کے ساتھ میری گفتگو ہورہی تھی اور بات طے ہوگئی تھی کہ دس روپے میں طے ہے، اب آگے صرف سودا پکا کرنے کی دیر ہے کہ مَیں کہوں کہ خریدا اور آپ کہیں کہ مَیں نے بیچا۔ قیمت دونوں نے طے کرلی اور دونوں اس پر راضی ہو چکے۔ اب دوسرے کی دخل اندازی جائز نہیں کہ مَیں اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ اس سے پہلے بڑھانے کی اجازت تھی لیکن بڑھانے کی اجازت اس وقت ہے جب کہ خریدنے کا ارادہ ہو، اور اگر خریدنے کا ارادہ نہیں ہے، تو اس طرح سے بڑھا کر بتلانا حرام اور ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر دوسرے مسلمان بھائی کو دھوکے میں ڈالنا ہے، اس کی بدخواہی ہے۔

اب یہ تیسرا آدمی جو بڑھا کر بتلا رہا ہے، اس میں دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ بیچنے والے نے اس کو پہلے سے ایسا کہنے کے لئے تیار نہیں کیا ہے، بلکہ یہ تیسرا اپنے طور پر ایسا کررہا ہے؛ تو یہ اکیلا گنہگار ہوگا۔

اور اگر بیچنے والے نے بھی پہلے سے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا ہے جیسا کہ بازاروں میں فٹ پاتھ پر ہوتا ہے، کہ وہاں بیچنے والے پہلے سے مجمع کے اندر اپنے آدمی چھوڑتے ہیں۔ اب بیچارہ کوئی سیدھا سادہ وہاں پر پہنچ گیا اور خریدنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ پندرہ میں دے دو، تو دوسرا آیا اور کہنے لگا کہ مجھے بیس میں دو، پھر تیسرا آیا اس نے پچیس کہا۔ یہ سب اسی کے چھوڑے ہوئے آدمی ہیں؛ تو اس صورت میں یہ دونوں – بیچنے والا اور قیمت بڑھانے والا – گنہگار ہوں گے۔ اس لئے کہ اسی کے کہنے پر یہ سب کچھ ہورہا ہے؛ اسی کو نجش کہتے ہیں۔ خریدنے کا ارادہ نہ ہو اور قیمت بڑھانا یہ جائز نہیں ہے۔

﴿مَیں اپنے دل میں کسی کے متعلق کینہ نہیں رکھتا﴾

﴿وَلَاتَبَاغَضُوْا﴾ اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض مت رکھو۔ بغض کا معنٰی عداوت اور دشمناوٹ۔ کسی کے متعلق دل میں دشمنی رکھنا، کسی کے متعلق دل میں بغض اور کینہ رکھنا؛ اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں دل صاف ہونا چاہیے۔

مشہور قصہ ہے حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابھی ایک جنتی آدمی آئے گا، صحابہ منتظر تھے، اتنے میں ایک صحابی آئے جنہوں نے تازہ وضو کیا تھا جس کا پانی ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، انہوں نے سلام کیا اور آکر بیٹھ گئے۔ سب نے ان کو دیکھ لیا۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ حضور ﷺ نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ دوسرے روز اسی طرح سے حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرماتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، اس روز بھی آپ نے پھر فرمایا کہ ایک جنتی آدمی ابھی آنے والا ہے، دوسرے روز بھی وہی صحابی اسی ہیئت میں آئے، تازہ وضو کئے ہوئے جس کا پانی ٹپک رہا تھا، اور بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، آئے اور بیٹھ گئے، ان کو معلوم نہیں کہ میرے متعلق یہ فرمایا ہے۔ تیسرے روز بھی نبی کریم ﷺ نے اسی طرح فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تین روز تک مسلسل یہ بات پیش آئی، تو میرے جی میں آیا کہ آخر کس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے، مَیں معلوم تو کروں۔ جب مجلس ختم ہوئی، سب باہر نکلے تو مَیں ان کے پاس گیا اور

یوں کہا کہ میرے گھر والوں کے ساتھ میری تھوڑی ناگواری پیش آ گئی ہے اور مَیں نے تین دن تک گھر نہ جانے کا ارادہ کیا ہے، اگر آپ اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیں تو آپ کے ساتھ رہوں۔ انہوں نے کہا: ضرور آیئے۔

خیر! ان کے ساتھ تین دن رہے، اور چوبیس گھنٹے برابر ان کا پروگرام دیکھتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دن اور رات غور سے دیکھا لیکن کوئی خاص بات دکھائی نہیں دی، بلکہ تہجد کے لئے بھی اٹھتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا، فرائض وغیرہ کا اہتمام برابر ہو رہا تھا۔ ہاں اتنا دیکھا کہ جب رات کو سونے کے لئے آتے تھے تو تھوڑی دیر استغفار کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے، لیکن کوئی نئی ایسی بات دکھائی نہیں دی کہ جس کی وجہ سے دل میں یہ آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر جنت کی بشارت دی ہوگی۔

جب تین دن پورے ہوئے تو میرے دل میں آیا کہ پوچھوں۔ تو مَیں نے کہا کہ دیکھو! گھر والوں کے ساتھ میری کوئی ایسی ناگواری کی بات پیش نہیں آئی تھی بلکہ میں تو صرف اس لئے آیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک مسلسل آپ کے بارے میں یہ فرمایا، تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کا ایسا کون سا عمل ہے۔ میں تین دن سے آپ کے ساتھ ہوں لیکن میں نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی کہ جس کی وجہ سے میرے دل میں آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ بشارت دی ہوگی، اب آپ ہی بتایئے کہ آپ کا کون سا خصوصی عمل ایسا ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں جو کچھ عمل کرتا ہوں وہ آپ نے دیکھ ہی لئے، اور تین دن سے دیکھ رہے ہو، میرے اعمال آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں؛ اس کے سوا میرے پاس کوئی عمل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں جانے لگا تو پھر انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ ایک بات ہے، میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے متعلق کینہ اور بغض نہیں رکھتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بس! یہی بات ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق یہ بشارت سنائی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، ۶۶۰۵)

حقیقت تو یہی ہے کہ آدمی کو اپنا دل ایسی چیزوں سے پاک اور صاف رکھنا چاہیے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے دل اس لئے بنایا ہے کہ اس میں کسی کے متعلق دل میں کینہ و بغض رکھے؟ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے دل تو اپنی یاد کے لئے بنایا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت اس میں رہے۔ ایسی بے کار چیزیں اس میں نہیں رکھنی چاہئیں۔

﴿پیٹھ مت دکھاؤ﴾

﴿وَلَاتَدَابَرُوْا﴾ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ۔ مطلب یہ کہ آپسی تعلقات کے کشیدہ ہونے کی وجہ سے ایک ادھر کو منہ پھیرتا ہے دوسرا اُدھر کو منھ کر لیتا ہے، ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاتے ہیں؛ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا اسی وقت ہوگا جب کہ آپس کے تعلقات درست نہ ہوں۔ ﴿وَلَایَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ﴾ ایک آدمی کے سودے پر دوسرا آدمی سودا نہ کرے۔

﴿وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا﴾ اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو، یعنی تمہارا تعلق آپس میں ایسا ہونا چاہیے جیسے دو سگے بھائیوں کا ہوتا ہے۔ لیکن آج تو سگے بھائی بھی اس طرح لڑ رہے ہیں کہ یہ مثال دینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ویسے آج بھی لوگ بولنے کو تو بولتے ہیں لیکن آپس کے تعلقات کی خرابی اتنی عام ہوتی جا رہی ہے اور بھائیوں کی لڑائیاں بھی اتنی

کثرت سے ہوگئیں کہ بس اللہ کی پناہ۔ بلکہ اب تو میں سمجھتا ہوں کہ ’’بھائی بھائی بن کر رہو‘‘ یہ مثال اگر دیں تو شاید کوئی یوں سمجھے کہ مولوی صاحب آپس میں لڑائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

معاشرت کا ایک زرّین اُصول

۲۳۶. وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرے۔

ایک مسلمان بھائی کے لئے دوسرے مسلمان کا وہی جذبہ ہونا چاہیے جو اپنے لئے ہوتا ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے ایک جسم کی طرح ہے، دوسرا مسلمان بھائی کوئی اجنبی نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ اور میں ایک ہی ہیں۔ یک جان دو قالب کہ ایک جان ہے لیکن دو جسم الگ الگ ہیں۔ ہم ایک جسم کے مانند ہیں۔ جو میں ہوں وہ آپ، جو آپ ہیں وہ میں ہوں۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ یہی تعلق ہونا چاہیے۔ جب جسدِ واحد یعنی ایک جسم کے مانند ہوئے تو جو چیز اپنے لئے سوچے دوسرے کے لئے بھی سوچے اور جو اپنے لئے بری سمجھے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی بری سمجھے۔ آپس کے معاشرت اور معاملات کی درستگی کے لئے یہ ایسا زرّین اصول ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کو اپنا لے؛ تو ساری معاشرت درست ہو جائے۔

﴿یہ حدیث دین کا چوتھائی حصہ ہے﴾

اسی لئے امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث کی بہت بڑے امام ہیں، بڑے محدث ہیں اور حدیث کی چھ مشہور کتابیں جن کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں ایک کتاب سنن ابو داؤد ہے جو انہوں نے ہی جمع کی ہے۔ایک بہت بڑے محدث غالباً امام شعبہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ امام ابو داؤد کے لئے علمِ حدیث کو ایسا نرم کر دیا تھا جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم کیا تھا۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی اور ان پانچ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) حدیثیں اپنی اس کتاب ''سنن ابوداؤد'' میں لیں ہیں اور چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) حدیثوں کا خلاصہ صرف چار حدیثیں ہیں (۱) اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (۲) اَلْحَلالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ (۳) لايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (۴) مِنْ حُسْنِ اِسْلامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالا يَعْنِيهِ. (تاریخ بغداد۔۹/۵۷)

بہت سے حضرات کہتے ہیں بقول امام داؤد کہ یہ حدیث ﴿لايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ دین کا چوتھائی حصہ ہے۔تم میں کوئی آدمی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔جو سلوک ہم اپنے لئے پسند کریں وہی اپنے مسلمان بھائی کے لئے پسند کریں۔اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو پوری معاشرت درست ہو جائے گی۔

﴿اسی کو ''عصبیت'' کہتے ہیں﴾

۲۳۷. وعنه قال قال رسول الله ﷺ: أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوْمًا. فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟ قَالَ: تَحْجُزُهُ -أَوْ تَمْنَعُهُ- مِنَ الظُّلْمِ، فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ. (رواه البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، یعنی اس پر ظلم کیا جارہا ہو یا وہ کسی پر ظلم کررہا ہو۔

اب اگر مسلمان بھائی مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن اگر وہ ظالم ہے پھر بھی اس کی مدد کرنا ایسی چیز تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس لئے ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ﴿يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟﴾ اگر میرا مسلمان بھائی مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو اس کی مدد کیسے کی جائے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو، یہی اس کی مدد اور خیر خواہی ہے۔

زمانۂ جاہیت میں عرب کا ایک مشہور شخص تھا جس کا یہ جملہ ہے ﴿أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوْمًا﴾ تم اپنے بھائی کی مدد کرو؛ چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اس نے تو اس جملہ کو اسی معنٰی میں لیا تھا جو ہم سمجھ رہے ہیں کہ بھائی کی مدد کرنی چاہیے، چاہے بھائی حق پر ہو یا باطل پر ہو، سچا ہو یا جھوٹا ہو۔ اس لئے کہ ہمارا عمل بھی یہی ہے اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں؛ اسی کو ''عصبیت'' کہتے ہیں۔

تعصب کا مطلب گروہ بندی اور طرف داری۔ یعنی آپ کسی کی مدد اس بنیاد پر

کررہے ہیں کہ یہ میرا بھائی ہے، میرے خاندان والا ہے، میری برادری والا ہے، میرے محلے والا ہے، میری بستی والا ہے، میری پارٹی والا ہے، میری جماعت والا ہے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ حق پر ہے یا باطل پر۔ تو اپنے والا ہونے کی بنیاد پر اگر مدد کی جائے گی؛ اسی کو ''عصبیت'' کہا جاتا ہے، اور اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اسلام ''عصبیت'' کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

ظالم کو ظلم سے روک دو

بہرحال! زمانۂ جاہلیت کے عرب نے تو یہ جملہ اسی عصبیت کے اصول پر کہا تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو خوب سمجھتے تھے ان کو اشکال ہوا کہ بھلا نبی کریم ﷺ ایسی تعلیم کیوں دیتے کہ بھائی اگر ظالم ہو پھر بھی اس کی مدد کرو۔ اس لئے انہوں نے پوچھ لیا کہ مظلوم ہو تو مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے، ظالم ہو تو کیسے مدد کروں؟ حضور ﷺ نے اس کو کیسا اچھا موڑ دیا، آپ نے فرمایا کہ ﴿تَحْجُزُهُ أَوْقَالَ تَمْنَعُهُ﴾ اس کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔ اس لئے کہ دوسروں پر ظلم کرکے وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے اور اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے جیسا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:-

بہ پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد ❁ از ما گذشت و بر وے بماند

مفہوم یہ ہے کہ ظالم یوں سمجھتا ہے کہ اس نے ہمارے اوپر زیادتی کی، ہم پر تو جو گذرنی تھی؛ وہ گذر گئی، لیکن اس پر باقی رہ گئی ہے، یعنی اس کو تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے ظلم کا حساب دینا ہے جو بڑی خطرناک چیز ہے۔

اور ظلم کا نتیجہ ظالم کو دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے اور آخرت میں تو بھگتنا ہی ہے، اس لئے جو آدمی ظلم کر رہا ہے درحقیقت وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کر رہا ہے۔ جیسے آپ کے بچے کے ہاتھ میں پستول ہو اور وہ اپنے ہی سینے کی طرف تا کے، تو آپ کیا کریں گے؟ فوراً اس کو روکیں گے کہ یہ کیا کر رہا ہے، اپنے اوپر زیادتی کر رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ ظلم کرنے والا بھی دوسرے پر ظلم کر کے اپنے اوپر ہی زیادتی کر رہا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اس کو ظلم سے روک دیجیے، اس کا ہاتھ پکڑ لیجیے، اس کو آگے بڑھنے مت دیجیے۔ بس! یہی اس کی مدد ہے کہ آپ نے اس کو ظلم کرنے نہیں دیا۔ وہ بھی آگے چل کر آپ کا شکریہ ادا کرے گا کہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ بروقت مجھے روک دیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ مدد کا یہ طریقہ اگر مسلمان اختیار کر لیں؛ تو کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے

دعا

اے اللہ! ایک مسلمان بھائی کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے اور اس کے حقوق کیسے ادا کرنے چاہئیں اس کی توفیق عطا فرما۔ اور اس میں ہم سے جو بھی کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ اے اللہ! ان کو دور فرما کر آئندہ اس کی تلافی کی ہمیں توفیق عطا فرما۔

تَعْظِیْمِ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ
وَبَیَانِ حُقُوْقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَیْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام
اور ان کے حقوق کا بیان
اور ان کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنا

مجلس ﴿۴﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

﴿مسلمان کے حقوق﴾

۲۳۸. وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ خَمْسٌ، رَدُّ السَّلامِ، وَعِیَادَۃُالْمَرِیْضِ، وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِوَاِجَابَۃُ الدَّعْوَۃِ، وَتَشْمِیْتُ الْعَاطِسِ.

وفی روایۃلمسلم: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ سِتٌّ: اِذَالَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ، وَاِذَا دَعَاکَ فَأَجِبْہُ، وَاِذَااسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَہٗ، وَاِذَاعَطَسَ فَحَمِدَاللّٰہَ فَشَمِّتْہُ، وَاِذَامَرِضَ فَعُدْہُ، وَاِذَامَاتَ فَاتْبَعْہُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ گویا اسلامی رشتے اور اسلامی اخوت اور بھائی چارگی کی وجہ سے اس کو چاہیے کہ ان پانچ چیزوں کا اہتمام کرے ﴿رَدُّ السَّلامِ﴾ سلام کا جواب دینا۔ مسلم شریف کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے اس میں چھ حقوق بتلائے ہیں اور اس میں یہ ہے ﴿اِذَالَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ﴾ جب تم ملاقات کرو تو تم اس کو سلام کرو۔ اُس روایت میں سلام کے جواب کو بتایا گیا ہے، اور اِس میں خود سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿اسلام میں سلام کی اہمیت﴾

سلام یہ ملاقات کے آداب میں سے ہے۔اسلام نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تعلیم دی ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے بڑے اہتمام سے جن چیزوں کی طرف امت کو متوجہ کیا ان میں افشاء السلام بھی ہے، سلام کو عام کرنا اور پھیلانا۔ گویا اس کا رواج عام کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، یہودیوں کے بڑے عالم تھے، جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کو آپ ﷺ کی آمد کا پتہ چلا تو لوگ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے چل پڑے، مَیں بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جیسے ہی میری نگاہ آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی ﴿فَلَمَّا رَأَیْتُهٗ عَرَفْتُ اَنَّهٗ لَیْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ﴾ میرے دل نے اس بات کا یقین کرلیا اور گواہی دی کہ یہ جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہے۔ ﴿وَسَمِعْتُهٗ یَقُوْلُ﴾ پھر اسی مجلس میں حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ﴿أَیُّهَا النَّاسُ! أَطْعِمُوْا الطَّعَامَ، وَأَفْشُوا السَّلَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَام، تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ بِالسَّلَامِ﴾ اے لوگو! لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کرو اور پھیلاؤ، اور رشتہ داری کے حقوق ادا کرو اور راتوں کو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اس وقت نماز پڑھو، سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہوجاؤ۔ (سنن ترمذی، ۲۴۸۵)

﴿سلام کے فضائل﴾

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا ﴿مِنَ الْكَفَّارَاتُ وَالدَّرَجَاتُ﴾ کونسی چیزیں اور کونسے اعمال ایسے ہیں جو لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں

اور کونسے اعمال وہ ہیں جس کی وجہ سے درجات بلند ہوتے ہیں؟ وہاں بھی یہی اعمال بتائے گئے ہیں ﴿اِطْعَامُ الطَّعَامِ، وَاِفْشَآءُ السَّلامِ، وَلِيْنُ الْكَلامِ وَالصَّلاةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ﴾ کھانا کھلانا، سلام کا پھیلانا، نرم بات کرنا اور لوگ سوئے ہوئے ہوں ایسی حالت میں رات کے وقت نماز پڑھنا۔ (سنن ترمذی، ۳۲۳۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جس کے ذریعہ سے مَیں جنت میں داخل ہو جاؤں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ﴿أَفْشِ السَّلَامَ، وَأَطْعِمِ الطَّعَامَ، وَصِلِ الْأَرْحَامَ، وَقُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ﴾ مطلب یہ ہے کہ سلام کے پھیلانے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بڑا اہتمام تھا۔ (مستدرک حاکم، ۴؍۱۷۷)

چنانچہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام کو ان حقوق میں سے بتلا رہے ہیں جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر اسلامی اخوت و بھائی چارگی اور اسلامی نسبت پر ہیں۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تم ملو تو سلام کرو، اور اگر اس نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دو۔ ویسے اپنی طرف سے سلام میں ابتداء کرنا سنت ہے، اور جواب دینا واجب ہے۔ اور سلام میں ابتداء کرنا افضل ہے۔

فقہاء نے فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ ایسی سنت ہے کہ ابتداء کرنا جواب دینے کے مقابلہ میں افضل ہے، یعنی یہ عمل سنت ہے لیکن اس کا جواب دینا واجب ہے، اور واجب عمل کے مقابلہ میں اس سنت والے عمل کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

تین تین دعائیں

بہرحال! جب وہ سلام کرے تو تم اس کے سلام کا جواب دو۔ آپس میں جب ایک

آدمی دوسرے آدمی سے ملاقات کرتا ہے تو تمام مذاہب میں اس کے ساتھ اظہارِ محبت کا کوئی نہ کوئی طریقہ بتلایا گیا ہے۔اب اگر ''ہیلو'' کردیا، یا ''گڈ ایوننگ'' اور ''گوڈ مورننگ'' کہا؛ تو اس کا دنیا یا آخرت میں کیا فائدہ ہوا؟ جبکہ اسلام نے جو طریقہ بتلایا وہ بہترین طریقہ ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملاقات کرتا ہے تو وہ اس کو دعا دے رہا ہے ''السلام علیکم'' تم پر سلامتی ہو ''ورحمۃاللہ'' اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں ''وبرکاتہ'' اور اللہ کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔ایک آدمی تین تین دعائیں دے رہا ہے۔اس میں اس کا دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔اور پھر یہ بھی بات ہے کہ وہاں گوڈ مورننگ اور گوڈ ایوننگ کو اگر دعا پر محمول کیا جائے تو وہ مخصوص اور محدود وقت کی دعا ہے۔صبح بخیر، شام بخیر، آپ کی صبح سلامتی کے ساتھ ہو۔اور آپ کی شام سلامتی کے ساتھ ہو۔لیکن یہاں تو سلامتی مکمل اور ہر حال میں ہو، ایسی عمومی انداز میں دعا دی جارہی ہے کہ آپ پر سلامتی ہو، گویا ہر حال میں ہر لمحہ ہر گھڑی آپ سلامت رہیں۔صرف صبح اور شام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن سے ملاقات کررہا ہے تو وہ اس کو تین تین دعاؤں سے مالا مال کررہا ہے، دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کی اس کے لئے دعا کرتا ہے۔

اور سلام کرنے والے کے لئے حدیث میں کتنا بڑا ثواب آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے، ایک آدمی نے آکر ''السلام علیکم'' کہا، تو حضور نے فرمایا: دس۔دوسرا آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو حضور نے فرمایا: بیس۔اس کے بعد تیسرا آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' تو حضور نے فرمایا: تیس۔(الادب المفرد، ۹۸۶) گویا جس نے صرف ''السلام علیکم'' کہا اس کو دس نیکی ملی۔اور جس نے ''ورحمۃ اللہ'' ساتھ میں ملایا

تو اس کو بیس نیکیاں ملیں۔اور اگر ’’وبرکاتہ‘‘ کا ساتھ میں اضافہ کردیا تو تیس نیکیاں ملیں۔اگر آپ دن میں سو آدمیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور سب کو ’’السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘‘ کہتے ہیں تو آپ کے نامہ اعمال میں تین ہزار نیکیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔آپ اندازہ لگائیے کہ سلام کا یہ کتنا بڑا فائدہ ہے، اور سلام کا اہتمام نہ کر کے ہم کتنے بڑے اخروی اجر وثواب سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے سلام تو باقاعدہ نبی آدم کے لئے بطور تحیّہ کے مقرر کیا ہے، بخاری شریف میں کتاب الاستیذان کے شروع میں باب ہے ﴿باب کیف بدء السلام﴾ سلام کی ابتداء کیسے ہوئی؟ یہ باب قائم کر کے روایت بیان کی ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا فرمایا تو حضرت آدم سے فرمایا کہ فرشتوں کے مجمع میں جاؤ اور ان کو سلام کرو، وہ تم کو کیا جواب دیتے ہیں وہ سنو۔جب حضرت آدم نے فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ باری تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہاری امت کا تحیہ ہے۔(بخاری شریف، جلد۲/ ۵۹۸۶، ۳۲۱۶/صفحہ ۹۱۹) قرآنِ پاک میں ہے ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا﴾ جب تم کو سلام کیا جائے تو اس سے بہتر لفظ کہو۔کسی نے ’’السلام علیکم‘‘ کہا تو آپ جواب میں ’’وعلیکم السلام‘‘ پر اکتفاء نہ کریں بلکہ اس سے بڑھ کر ’’وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ‘‘ کہیے۔اور اگر اس نے ’’السلام علیکم ورحمۃ اللہ‘‘ کہا تو آپ جواب میں اضافہ کے ساتھ ’’وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘‘ کہیے۔اور کم سے کم اس سے بہتر نہیں تو پھر جو اس نے کہا ہے اسی کو اس پر لوٹانا چاہیے؛ یہ اس کا حق ہے۔

﴿پتہ نہیں کس کی دعا قبول ہوجائے﴾

تو سلام کے متعلق حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ ویسے سلام کرنے کو سنت قرار دیا گیا ہے اور سلام کا جواب دینے کو واجب قرار دیا ہے، اس لئے اگر کسی نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ اور یہ دعا ہے، آپ اسی نیت سے سلام کر لیجئے کہ میں اس کو سلام کروں گا تو وہ اس کے جواب مجھے ''وعلیکم السلام'' کہے گا، اور پتہ نہیں کس کی دعا میرے حق میں قبول ہوجائے۔

حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جو سید الطائفہ ہیں اور ہماری جماعت کے شیخ المشائخ ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کو ترکی کے بادشاہ نے بلایا تھا، جب وہ مکہ مکرمہ واپس پہنچے تو حضرت حاجی صاحب سے انہوں نے اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سلطان ترکی امیر المؤمنین کے سامنے آپ کے کچھ مناقب بیان کروں۔ حضرت حاجی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اگر آپ میرے مناقب ان کے سامنے بیان کریں گے تو بہت سے بہت تو وہ مجھے بھی اپنے یہاں بلائیں گے جیسے آپ کو بلایا تھا، اور میں مکہ مکرمہ چھوڑنا نہیں چاہتا، اور یہ بھی نہیں کہوں گا کہ ان سے دعا کی درخواست کریں، البتہ حدیثِ پاک میں ہے کہ سلطانِ عادل کی دعا قبول ہوتی ہے، اور وہ سلطانِ عادل ہیں، اس لئے آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ میرا سلام ان کو پہنچا دیں، وہ اس کے جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہیں گے تو وہ دعا اللہ تعالیٰ میرے حق میں قبول کرے گا۔ معلوم ہوا کہ اسی امید پر سلام کرنا کہ پتہ نہیں کون اللہ کا بندہ ایسا ہو اور کس کی دعا ہمارے حق میں قبول ہوجائے۔

اللہ اس بندہ پر رحم کرے......

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ الشیخ اور دادا پیر ہیں، اس لئے کہ حضرت معروف کرخی کے مرید اور خلیفہ حضرت سری سقطی تھے، اور ان کے خلیفہ حضرت جنید بغدادی تھے۔ حضرت سری سقطی حضرت جنید بغدادی کے ماموں بھی ہوتے ہیں۔ خیر! حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ جا رہے تھے، ایک سقہ (پانی بیچنے والا) آواز لگا رہا تھا کہ اللہ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پیے۔ انہوں نے پیسے دے کر اس سے پانی لے کر پیا۔ ان کے ساتھ ان کا مرید تھا اس نے کہا کہ حضرت آپ کا تو روزہ تھا، آپ نے پانی پی لیا؟ انہوں جواب میں کہا کہ وہ ایک آواز لگا رہا تھا کہ اللہ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پیے، لہٰذا میں نے اسی امید پر پانی پی لیا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے حق میں اس کی دعا قبول فرمالیں اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمادیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے اور ان حضرات کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا

دعائیں لینے کا اہتمام

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث تھے۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے ایک مرتبہ کشتی میں جا رہے تھے، کسی نے کنارے پر چھینک آنے پر ''الحمدللہ'' کہا۔ چھینک کھانے والا جب ''الحمدللہ'' کہے تو جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہنا چاہیے، جب ''یرحمک اللہ'' کہیں گے، تو وہ جواب میں کہے گا ''یھدیکم اللہ و عافاکم'' اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تم کو عافیت نصیب فرمائے۔ تو حضرت امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کشتی میں جا رہے تھے اور یہ سنا (وہ بڑی کشتی میں تھے جو آگے نکل گئی، اور بحری کشتیوں میں چھوٹی کشتیاں بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے ہوا کرتی ہیں)

تو ایک درہم دے کر چھوٹی کشتی لی اور اس میں بیٹھ کر کنارے پر آئے اور اس آدمی کو کہا ''یرحمک اللہ''۔ کسی نے کہا کہ آپ نے اتنی زحمت کیوں برداشت کی؟ تو حضرت نے کہا کہ اس امید میں کہ وہ جواب میں مجھے کہے گا ''یھدیکم اللہ وعافاکم'' اور ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا میرے حق میں قبول کرلیں۔ اسی واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بعد میں کس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ امام ابوداؤد نے ایک درہم میں جنت خرید لی۔
(فتح الباری، ۱۰/۶۱۰)

اتنا بڑا محدث؛ جس کے بڑے بڑے اعمال ہیں وہ بھی دعائیں لینے کا اِس قدر اہتمام کررہا ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نیکیاں کرکر کے سیر ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور حفاظت فرمائے۔

سلام کے آداب

حاصل یہ ہے کہ سلام ویسے بھی اسلام کا تحیہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کی ملاقات کے وقت یہی ادب بتلایا ہے اور ایک مسلمان کا حق ہے کہ اس کو سلام کیا جائے، اور اس کے آداب بڑے تفصیل سے بتائے گئے ہیں کہ اگر کوئی آدمی سوار ہے تو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، اسی طرح اکیلا جماعت کو سلام کرے، جو چل رہا ہے وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اگر سامنے والے نے سلام نہیں کیا تو ہم بھی نہ کریں، بلکہ یہ تو ایک طریقہ اور ادب ہے کہ ابتداء اس کو کرنی چاہیے تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے ابتداء نہیں کی تو ہم بھی سلام نہ کریں، ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کی طرف سے ابتداء نہ ہو تو ہم ابتداء کریں۔

شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں جو شیخ الادب کے نام سے مشہور ہیں، علماء ان کو جانتے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے اور ان کے بہت سے شاگردوں سے براہ راست بھی سنا کہ سلام میں کوئی بھی ان سے ابتداء نہیں کرسکتا تھا، کوئی چھوٹے سے چھوٹا بچہ ہو یا شاگرد ہو؛ وہی پہلے سلام کرتے تھے، لوگ بہت چاہتے تھے کہ ہم پہلے سلام کرلیں لیکن کبھی اس کی نوبت نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمارے ایک استاذ نے بتایا کہ مَیں ایک مرتبہ چھپا رہا اور اچانک نکل کر ان کو سلام کیا تو اس طرح مَیں ابتداء بالسلام کرسکا۔

مقصد یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے حضرات ان چیزوں کا اہتمام کرتے تھے، لیکن ہماری نگاہوں میں حضور ﷺ کی تعلیمات اور اسلام کی ہدایتوں کی جو قدر و قیمت ہونی چاہیے وہ نہیں رہی، اس لئے ان پر عمل کا وہ اہتمام بھی باقی نہیں رہا جو اللہ کے ان مخصوص بندوں کے یہاں تھا، ورنہ اگر ہمارے دلوں میں بھی وہ قدر و قیمت ہوتی اور ہم بھی وہ سمجھتے جو وہ حضرات سمجھ رہے تھے؛ تو ان باتوں پر عمل کے معاملے میں ہم آخر کیوں کوتاہی کرتے۔

سلام کا جواب کیسے دیں؟

بہرحال! یہ بتلا رہا تھا کہ اُس حدیث میں ''اِذَا لَقِیْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ'' ہے اور اِس حدیث میں ''رَدُّ السَّلَامِ'' ہے، یعنی سلام میں ابتداء کرے یا اگر اس نے سلام کیا ہے تو پھر سلام کا جواب دے۔

اور اگر کسی نے زبانی سلام کہلوایا، تو جب آدمی آکر کہے تو اس کے جواب میں یوں کہنا

چاہیے ''علیھم وعلیکم السلام'' جس نے کہلوایا ہے اس پر اور آپ لے کر آئے ہیں تو آپ پر بھی سلامتی ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر ان سے آپ کہیں کہ فلاں کو سلام کہنا تو وہ فوراً کہتے ہیں ''وعلیکم السلام''۔ اس طرح کہہ کر یہیں سے جواب نمٹا دیتے ہیں، پھر وہاں جا کر کیا کہیں گے۔ لہٰذا اگر کسی نے سلام کہلوایا ہو تو صرف ''وعلیکم السلام'' نہ کہو۔ اس لئے کہ اس صورت میں تو جو سلام لایا ہے صرف اسی پر آپ سلام بھیج رہے ہیں، اور جس نے بھجوایا ہے اس پر تو سلام ہوا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا طریقہ یہی ہے کہ ''وعلیھم وعلیکم السلام'' کہنا چاہیے، یعنی لانے والے کو بھی شریک کر لیا جائے؛ تب جواب مکمل ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی نے خط کے اندر تحریری سلام لکھا تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ خط کے جواب دینے میں پیسے خرچ کرنے پڑیں گے اور ہر کوئی پیسے خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے، اس لئے جب خط کا جواب دینا واجب نہیں ہوا تو تحریری سلام کا جواب بھی تحریر میں ضروری نہیں ہوا، ہاں! خط پڑھتے وقت زبانی دے دینا چاہیے۔ آج ہم بہت سے خطوط پڑھتے ہیں اور اس میں سلام ہوتا ہے، لیکن نہ تحریری جواب دینے کی نوبت آتی ہے اور نہ زبانی دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بہرحال! ایک چیز ''رَدُّ السَّلامِ'' ہے، یعنی سلام کا جواب دینا۔ ایک مسلمان کے پانچ حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے، یا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے ''اِذَا لَقِيْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ'' جب تم ان سے ملو تو تم ان کو سلام کرو۔

﴿مسلمان کا دوسرا حق: تیمارداری﴾

دوسرا حق ہے ﴿عِیَادَۃُ الْمَرِیْضِ﴾ بیمار کی خبر گیری، تیمارداری کرنا یعنی اگر کوئی آدمی بیمار ہو گیا تو اس کی عیادت کے لئے جانا۔ یہاں ایک بات اور ہے، ہمارے معاشرے میں بیمار کی خبر گیری کے لئے جایا جاتا ہے، لیکن شیطان نے ایک عجیب گمراہی کے انداز میں ہمیں اپنا تختۂ مشق بنا رکھا ہے کہ جو عبادتیں ہیں ان میں بھی ایسی کوشش کرتا ہے کہ ان عبادتوں کا ثواب اور اجر ہم کو نہ ملے، اور اس سے ہمیں محروم کر دے، لہٰذا اس نے عبادتوں میں بھی رسم ڈال دی۔ ہم کسی بیمار کی خبر گیری کے لئے جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر نہیں جائیں گے تو وہ برا مانے گا، جب ہم بیمار ہوئے تھے تو وہ ہماری خبر لینے کے لئے آیا تھا، لہٰذا جب وہ بیمار ہوا ہے تو ہمیں بھی جانا چاہیے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، آپ نے اس کی تعلیم دی ہے؛ یہ جذبہ تو دل میں ہوتا ہی نہیں۔ بس! ہم ایک رسم کو پورا کرنے کی غرض سے جاتے ہیں، اس طرح یہ چیز عبادت نہیں رہتی۔ اور رسم کے طور پر جو کیا جائے اس میں ثواب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ہم جو عبادت کر رہے ہیں، شیطان اس کے اجر وثواب سے دور کر رہا ہے، ہماری نگاہ بھی کتنی محدود اور تنگ ہو گئی ہے:-

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ❁ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

ہمیں تو یوں سوچنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، اور اللہ کے رسول نے اس کو سنت قرار دیا، بس پھر تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میں بیمار ہوا تھا تو وہ میری خیریت پوچھنے کے لئے نہیں آیا تھا، اس لئے اب مَیں کیوں جاؤں؟ یہ ایک مزاج بن گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ اس نے اللہ کی خوشنودی حاصل نہیں کی، تو اب مَیں کیوں کروں؟

یہ سب تو عبادتیں ہیں، اگر کسی نے نہیں کی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بھی نہ کریں مثلاً آپ نماز پڑھنے جاتے ہیں، اور آپ کا دوست نماز پڑھنے نہیں جاتا، تو آپ یوں کہیں گے کہ وہ تو نماز پڑھنے نہیں جاتا؛ اس لئے میں بھی نہیں جاؤں گا؟ ایسا کبھی آپ نے سوچا؟ نماز پڑھنے والا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ فلاں آدمی نماز نہیں پڑھتا اس لئے میں بھی نہیں پڑھوں گا، اسی طرح بیمار کی عیادت اور خبر گیری، اور سلام یہ ساری عبادتیں ہیں، کیا عبادتوں میں ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ وہ مجھے سلام کرے تو میں سلام کروں یا وہ میری خبر گیری کے لئے آتا تو میں اس کی خبر گیری کے جاتا۔ یہ سوچنا غلط ہے، یہ تو جہالت کی باتیں ہوئی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کہ وہ اللہ کو راضی کرتا تو میں بھی کرتا، اس نے اللہ کو راضی نہیں کیا تو میں بھی نہیں کرتا۔ جب کہ ہمیں تو اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ اس نے نہیں کیا تو اپنا نقصان کیا، اس کی وجہ سے ہم اپنا نقصان کیوں کریں؟

عیادت کے فضائل

مسلم شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتا ہے تو وہ جنت کے باغیچوں کے اندر سیر کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، ۶۷۱۹)

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب کوئی آدمی بیمار کی عیادت اور خبر گیری کے لئے اگر صبح کے وقت جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور شام کے وقت جاتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک باغیچہ مقرر کر دیتے ہیں (ترمذی شریف، ۹۶۹)

اتنی بڑی فضیلت ہے، اس کے بعد بھی یہ سوچنا کہ فلاں نے یہ کام نہیں کیا، اس لئے میں نہیں

کروں گا، اس کا کیا مطلب ہوا؟

عیادت اور بیمار کی خبر گیری ویسے تو سنت کا درجہ رکھتی ہے، لیکن بعض اوقات ضروری ہوجاتی ہے، جیسے ماں باپ بیمار ہیں تو ماں باپ کی خبر گیری اولاد کے لئے ضروری اور واجب ہے۔ کوئی پڑوسی ہے اور اس کی خبر لینے والا کوئی نہیں ہے تو آپ پر ضروری ہوجائے گا۔ یا کوئی مؤمن ہے اور کوئی دوسرا خبر لینے والا نہیں ہے اور اگر اس کی خبر گیری نہیں کی جائے گی تو وہ ہلاک ہوجائے گا، یا نقصان میں پڑ جائے گا، تب بھی قریب کے لوگوں پر اس کی خبر لینا ضروری ہوجاتا ہے۔

﴿عیادت کے آداب﴾

اور مریض کی عیادت کے آداب بھی ہیں، ان آداب کی رعایت ضروری ہے، جب بیمار کی عیادت کے لئے آدمی جائے، تو حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ عَادَ فَلْیُخَفِّفْ﴾ جو آدمی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو مختصر وقت کے لئے جائے۔

ایک روایت میں ہے ﴿اَلْعِیَادَۃُ فُوَاقَ نَاقَۃٍ﴾ عیادت: اونٹنی کے دوہنے کے دو دودھوں کے درمیان کا وقت ہے (شعب الایمان، ۹۲۲۲) یعنی جب بھینس کا دودھ دوہتے ہیں تو اس کے تھن کے سرے کو انگوٹھے سے دباتے اور پمپنگ کرتے ہیں، ایک مرتبہ دبایا، اس میں سے دودھ نکلا پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں، اگر نہیں چھوڑیں گے تو دوسرا دودھ نہیں آئے گا، اس طرح دباتے اور چھوڑتے رہنا پڑتا ہے، تاکہ دودھ آتا رہے۔ ایک مرتبہ دبانے کے بعد چھوڑ کر دوسری مرتبہ دباتے ہیں اس درمیان میں جو قلیل وقفہ ہوا؛ اس کو "فُوَاقٌ" کہتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ عیادت اتنے مختصر وقت کے لئے ہے کہ اس کے پاس گئے، سلام کیا، خیریت پوچھی کہ

کیا حال ہے؟ جب وہ بتائے تو اس کے لئے صحت کی دعا کی جائے اور واپس ہو جائے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے کہ اس کے لئے دعائے صحت کی جائے۔

بیمار کو یہ دعا دینا بھی ثابت ہے ﴿أَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ، أَنْتَ الشَّافِيُ، لاشِفَآءَ اِلَّاشِفَآؤُكَ، شِفَآءً لايُغَادِرُ سَقَماً﴾ اے لوگوں کے پروردگار! اس کی بیماری کو دور کردے، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے علاوہ اور کسی کی شفا کارگر نہیں ہوتی ہے، ایسی تندرستی دے کہ کوئی بیماری باقی نہ چھوٹے۔ (سنن أبی داؤد، ۳۸۸۳)

اور حدیث میں آتا ہے کہ آدمی اگر کسی بیمار کی عیادت کے لئے جائے تو سات مرتبہ یہ کہے ﴿أَسْأَلُ اللهَ الْعَظِيمَ، رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، أَن يَّشْفِيَكَ﴾ میں عظمت والے پروردگار سے جو عظمت والے عرش کا مالک ہے؛ سوال کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو شفا دے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اس کی موت نہیں آئی ہے تو وہ بیماری سے ضرور شفا پائے گا (ترمذی شریف، ۲۰۸۳) کتنی بڑی فضیلت ہے۔

اور پھر زیادہ دیر نہ ٹھہرے، اس لئے کہ اجنبی کے آنے کی وجہ سے بیمار اپنے اوپر ایک حجاب محسوس کرتا ہے، اور ہر آدمی اپنے آپ کو بے تکلف رکھنا چاہتا ہے، یعنی ہر آدمی چاہتا ہے کہ اپنے اٹھنے، بیٹھنے، باتوں اور گفتگو میں اور چال ڈھال میں بے تکلف رہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں پیر لمبے کرکے بیٹھوں، اور کوئی عیادت کے لئے آیا، تو وہ اس کی وجہ سے پیر سمیٹ لے گا، اور ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑے گا۔ اب آپ دیر تک بیٹھے رہیں گے تو اس بے چارے کو آپ نے تکلیف میں ڈال دیا، ایک تو بیماری ہے اور آپ نے اس کے اوپر اضافہ کردیا۔ اور وہ آدمی اپنے گھر والوں سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوگا اور آپ وہاں بیٹھ گئے ہیں تو نہیں کر سکے گا۔ اس

لئے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فیوی کول (FEVICOL) لے کر جائے کہ وہاں چپک گئے، بلکہ تھوڑی دیر میں خیریت پوچھ کر وہاں سے نکل جائے، ورنہ اس کو زحمت میں ڈالنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث، فقیہ اور صوفی گذرے ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر ایک کے متعلق کسی نہ کسی نے نقد کیا ہے، لیکن ان کی شخصیت کے متعلق کسی نے کوئی نقد نہیں کیا۔ ایسی عظیم شخصیت تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوئے، جب کوئی بڑا آدمی بیمار ہوتا ہے تو سینکڑوں لوگ اس کی عیادت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی عیادت کے لئے بھی لوگ آرہے تھے، ایک آدمی آیا تو وہ ایسا بیٹھا کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ حضرت اس کی وجہ سے پریشان تھے، جب بہت دیر ہوگئی تو حضرت فرمانے لگے کہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ ان کو عیادت کے آداب سے واقفیت نہیں ہیں، آتے ہیں اور بیمار کا خیال ہی نہیں رکھتے۔ تو اس نے کہا کہ ہاں حضرت! اگر آپ فرمائیں تو مَیں دروازہ بند کردوں تا کہ کوئی آئے ہی نہیں۔ حضرت نے کہا کہ ہاں ایسا کرو! باہر نکل کر دروازہ بند کر دینا۔

بہر حال! عیادت بھی مسنون ہے اور بیمار کے لئے دعا کرنا بھی مسنون ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

غلط رسم و رواج محرومی کا سبب

اب ہمارے یہاں عیادت میں بدعت جاری ہوگئی ہے یعنی ایک رواج پڑ گیا ہے کہ کوئی کھانے کی چیز فروٹ وغیرہ لے کر جاؤ۔ اس کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ لے جانے کی استطاعت نہیں ہے تو آپ نہیں جائیں گے۔ کسی حدیث میں ایسا نہیں آیا ہے کہ بیمار کے لئے فروٹ یا کچھ لے کر جاؤ۔ اصل تو یہ ہے کہ وہاں جا کر دعا دینی ہے، اور

آپ کے جانے سے اس کے گھر والوں کو تسلی ہوگی۔

یہاں تک کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿بَابُ عِيَادَةِ مُغْمٰى عَلَيْهِ﴾ یعنی کوئی آدمی کوما (coma) میں بے ہوش ہے، اس کی عیادت کے لئے بھی جانا چاہیے۔ اب وہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو بے ہوش ہے، اس حالت میں ہم جائیں گے تو اس کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کون میری خبر گیری کے لئے آیا ہے، اس کی عیادت کے لئے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ تو محدثین نے لکھا ہے کہ جب آپ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اس کو تو پتہ نہیں چلے گا، لیکن اس کے گھر والوں کو آپ کے جانے سے تسلی ہوگی، اور ایک مؤمن کے دل میں سرور کو داخل کرنا؛ یہ بھی بہت اہم اور بڑی چیز ہے۔

خیر! مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک رواج پڑ گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سوچ کر نہیں جاتے کہ ابھی ہمارے پاس پیش کرنے کے واسطے کچھ نہیں ہے، جب انتظام ہوگا تب جائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنا بڑا ثواب جو ایک بیمار کی عیادت کا حدیث میں آیا ہے اس سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔ یہ تو خالص عبادتیں ہیں، ان میں بھی رسموں کو اور زائد چیزوں کو داخل کر کے ہم نے اپنے آپ کو بہت بڑے اجر وثواب سے محروم کر رکھا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے بچنے کا اہتمام کیا جائے۔

﴿عیادت کا ایک اہم ادب﴾

اور ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لئے جائے تو اس کے لئے وقت بھی مناسب ہونا چاہیے، کسی ایسے وقت میں نہ جائے کہ وہ وقت بیمار کے گھر والوں کے لئے گرانی کا باعث ہو، جیسے آدھی رات کو یاد آ گیا تو اسی وقت پہنچ گئے، دوپہر

کوآرام کا وقت ہوتا ہے، اس وقت پہنچ گئے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ عام طور پر جن اوقات میں ملاقات کے لئے جایا جاتا ہے، اور جن اوقات کے بارے میں یہ خیال ہو کہ ان اوقات میں میرا جانا نہ اس بیمار کے لئے گرانی کا باعث ہے، اور نہ اس کے گھر والوں کے لئے؛ ایسے ہی وقت ہی جانا چاہیے۔تو ایک ادب یہ ہے کہ وقت کا انتخاب صحیح ہونا چاہیے۔کسی مشغولی کا وقت نہ ہو، آرام کا وقت نہ ہو۔ بلکہ جب کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے اور لوگ اس کی عیادت کے لئے آتے ہیں تو جو اوقات عرف میں ملاقات کے لئے ہوتے ہیں اور عام طور پر گھر والے بھی انہیں اوقات میں منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ملاقات کے لئے آئے گا؛ ایسے وقت ہی جایا جائے، تاکہ آپ کا جانا حقیقتاً بیمار کے لئے راحت رسانی کا ذریعہ ہو، تنگی اور پریشانی میں ڈالنے کا ذریعہ نہ ہو۔

مسلمان کا تیسرا حق: جنازہ میں شرکت

﴿وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ﴾ اور دوسری روایت میں ہے ﴿وَاِذَامَاتَ فَاتَّبِعْهُ﴾ کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازہ میں شرکت کرنا یہ بھی ان حقوق میں سے ہے جو ایک مسلمان ہونے کے ناطے سے دوسرے مسلمان پر ہیں، یعنی یہ کوئی رشتہ داری اور صلہ رحمی نہیں ہے بلکہ اسلامی حقوق میں سے ہے۔اس لئے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ رشتہ دار ہے تب ہی گئے ورنہ نہیں گئے۔اگر رشتہ داری یا دوستی ہے تو مزید تاکید ہو جاتی ہے لیکن ایک مسلمان کے حقوق میں سے ہے کہ اس کے جنازہ میں شرکت کی جائے، اس کے لئے دعائے مغفرت کی جائے، جنازہ کی نماز میں اگر شرکت کریں گے تو اس میں دعائے مغفرت ہو ہی جاتی ہے۔اور پھر اس کے جنازہ کے ساتھ جانے کی اور دفن میں شریک ہونے کی بھی حدیثِ پاک میں تاکید آئی

ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ کوئی آدمی صرف جنازہ کی نماز پڑھ کر واپس ہو جاتا ہے اور دفن میں شریک نہیں ہوتا تو اس کو ایک ہی قیراط ثواب ملتا ہے، اور اگر دفن میں بھی شریک ہوتا ہے تو اس کو دو قیراط ثواب ملتا ہے (مسند احمد) اور ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔

ویسے اگر کسی وجہ سے دفن میں شرکت کی نوبت نہ آوے تو مرنے والے کے اولیاء سے اجازت لے کر واپس ہونا چاہیے، ان کو بے خبر رکھ کر نہیں۔ الّا یہ کہ عرف کی وجہ سے اجازت ہو تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

﴿مسلمان کا چوتھا حق: دعوت قبول کرنا﴾

﴿وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ﴾ اور دعوت کو قبول کرنا بھی ان حقوق میں سے ہے جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر ہیں۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی رویت ہے کہ جب کوئی مسلمان دعوت کرے تو اس کو قبول کرو، اور اس کے یہاں جاؤ، پھر اگر تم روزہ سے ہو تو وہاں جا کر اس کے لئے دعا کر دو، اور روزہ نہیں ہے تو کھانے میں بھی شریک ہو جاؤ۔ تو دعوت دینا بھی محبت کا تقاضہ ہے، جب اس نے اخلاص اور محبت کے ساتھ دعوت دی ہے تو اخلاص اور محبت کے ساتھ ہی قبول بھی کرنی چاہیے، اس میں اس کی دل جوئی بھی ہے۔

اور پھر ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جس دعوت کے متعلق گمان ہو کہ وہاں عمدہ کھانا ملے گا وہاں تو شریک ہوا جائے اور جہاں سادہ کھانا اور دال روٹی ملنے کا گمان ہو؛ وہاں نہ جائے۔ دعوت کے قبول کرنے کا یہ حق مالدار اور غریب دونوں کے لئے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ﴿لَوْ دُعِيْتُ اِلٰى كُرَاعٍ لَأَجَبْتُهُ﴾ اگر مجھے کھری یا پائے کی دعوت دی جائے تو اس کو قبول

کروں گا (بخاری شریف، ۵۱۷۸) ہمارے زمانے میں تو پائے عمدہ چیز سمجھی جاتی ہے، اس لئے کہ عمدہ طریقہ سے پکائے جاتے ہیں اور عمدہ طریقہ سے کھائے جاتے ہیں، اُس زمانہ میں اس طرح نہیں پکتے تھے، کیونکہ اس وقت تو آگ پر سیک لیا جاتا تھا، آج بھی آپ پائے آگ پر سیک لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا لذت آتی ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں پائے ایک کمتر چیز سمجھی جاتی تھی، اس لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کی مجھے دعوت دی جارہی ہے وہ گھٹیا چیز ہے۔ کبھی داعی کا حال ہی دلالت کرتا ہے کہ اس کے یہاں معمولی چیز ہی پیش کی جائے گی تب بھی انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی دعوت کو قبول کرنا یہ اس کا حق ہے، اس نے محبت کے ساتھ دعوت پیش کی تو اس کا جواب بھی محبت اور اخلاص ہی سے دینا چاہیے۔

دعوت کے تین درجے

البتہ دعوت کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ دعوت صرف دعوت ہی ہونی چاہیے، دعوت عداوت نہیں ہونی چاہیے۔ بعض لوگ دعوت کے معاملہ میں ایسا اصرار کرتے ہیں کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے اس کی راحت کا خیال ہی نہیں رکھتے، اس لئے کہ دعوت کا مقصد تو سامنے والے کو راحت پہنچانا ہے، لہٰذا اس کی راحت کا پورا اہتمام کرنا چاہیے

اسی لئے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ دعوت کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اعلیٰ یعنی (1st Class) کا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جس کی دعوت کرنا چاہتے ہیں اس کو نقد رقم دے دیجئے، اگر اس کو نقد رقم دے دی تو وہ اس رقم کے ذریعہ جب چاہے گا اور جہاں چاہے گا اور جو چاہے گا کھالے گا۔ گویا آپ نے دعوت کے ذریعہ اس کو کسی مخصوص وقت اور

مخصوص جگہ پر جانے کا اور کسی مخصوص چیز کے کھانے کا پابند نہیں بنایا۔آپ اگر کھانا تیار کر کے اس کو اپنے گھر بلائیں گے تو اس میں اس پر تین پابندیاں آتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ وہی چیز کھائے جو آپ نے اس کے لئے بنائی ہے، اور دوسری یہ کہ آپ کے گھر آ کر ہی کھاوے، اور تیسری یہ کہ اس وقت میں آئے جو آپ نے متعین کیا ہے۔لیکن جب آپ نے اس کو نقد رقم دے دی تو گویا آپ نے اس کو تینوں پابندیوں سے آزاد کر دیا۔اور پھر وہ اس رقم کو اپنے کسی دوسرے کام میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔یہ اعلیٰ قسم کی دعوت ہے۔

درمیانی درجہ (Middal Class) دعوت یہ ہے کہ آپ کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دیں، اپنے گھر بلانے پر اصرار نہ کریں۔اس میں ایک پابندی ہوگئی کہ آپ نے اس کے لئے جو پسند کیا وہی وہ کھائے گا، اس معاملہ میں اس کی پسند باقی نہیں رہی، لیکن اس کے گھر بھیج دیا تو وہ اپنی مرضی کے مطابق جس وقت چاہے گا کھائے گا۔گویا اس میں ایک طرح کی آزادی اور راحت ہے۔

اور دعوت کا تیسرا درجہ (3rd Class) یہ ہے کہ آپ کسی کو اپنے گھر بلانے پر اصرار کریں، گویا اس پر تینوں قسم کی پابندیاں عائد کر رہے ہیں، کھانے کے معاملہ میں بھی اپنی پسند اس کے سر پر تھوپ رہے ہیں اور وقت اور جگہ کے سلسلہ میں بھی اس کو پابند بنا رہے ہیں۔

دعوت یا عداوت

اور خاص کر اس زمانہ میں لوگ دعوت کے سلسلہ میں بڑا اصرار کرتے ہیں، حالانکہ آج کل کا زمانہ لوگوں کے لئے بڑی مشغولیت کا زمانہ ہے، عام طور پر ہر آدمی کے پاس وقت کی بڑی قلت ہے، ہر ایک اپنے اپنے کاروبار اور کاموں میں ایسا مشغول ہوتا ہے کہ شاید ہفتہ

میں فرصت کا کچھ وقت مل جائے، وہ خود اپنے گھر والوں کے لئے اور اپنی بیوی بچوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتا اور آپ دعوت پر اصرار کر کے اس کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں تو آپ ہی اندازہ لگائیے کہ آپ اس کو راحت پہنچا رہے ہیں یا تکلیف پہنچا رہے ہیں؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ آبادی کی کثرت کی وجہ سے کسی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا کتنا مشکل ہے۔ مثلاً ایک آدمی نوساری میں رہتا ہے، اور آپ یہاں سورت میں رہتے ہیں، اور آپ نے اس کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، تو ظاہر ہے کہ آپ کی دعوت کا جو وقت ہے اس پر پہنچنے کے لئے وہ دو، ڈھائی گھنٹہ پہلے سے اپنی جگہ سے نکلے گا، اس کے لئے پچاس سو روپے خرچ کرے گا؛ تب آپ کے یہاں پہنچ سکے گا، تو اب آپ ہی سوچئے کہ یہ دعوت ہوئی یا عداوت ہوئی؟

اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم نے دعوتوں کو بھی رسموں کا پابند بنالیا ہے۔ دعوت تو ایک ایسی چیز تھی کہ جو خالص محبت کا تقاضہ تھا جو اخلاص کے ذریعہ پورا کیا جاتا تھا، اب ہم نے اس کو اپنی تقریبات کے ساتھ مخصوص کر دیا، گویا اسی موقعہ پر ہماری طرف سے اصرار ہوتا ہے کہ آپ کو تو آنا ہی پڑے گا، وہ بے چارہ مجبوری ہونے کے باوجود آتا ہے۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ شیطان نیکی کے کام پہلے تو کرنے نہیں دیتا اور اگر کوئی آدمی نیکی کا کوئی کام کر لیتا ہے تو اس میں شیطان اپنی طرف سے کچھ ایسی ملاوٹ کر دیتا ہے کہ اس کو ثواب نہ ملے۔ یہ دعوت تو خالص مؤمن کا دل خوش کرنے اور سنت کو ادا کرنے کے لئے ہوا کرتی تھی، جب وہاں سنت ہی ادا نہیں ہوگی تو پھر ثواب بھی نہیں ملے گا۔

بہر حال! اگر کوئی دعوت کرنے کا اعلیٰ درجہ اختیار کرے تو بہت ہی اچھا ہے۔

دعوت کا ایک نرالا انداز

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو سیرت المصطفیٰ کے مصنف ہیں، تین جلدوں میں بڑی مشہور کتاب ہے، وہ بھی بڑے عالم تھے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی گہری دوستی تھی، مولانا ادریس صاحب لاہور میں رہتے تھے اور مفتی محمد شفیع صاحب کراچی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ادریس صاحب کراچی تشریف لائے تو مفتی صاحب کے پاس ملاقات کے لئے گئے، مفتی صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ آپ تشریف لائے۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کا قیام کہاں ہے؟ فرمایا کہ تاج کالونی میں میرا قیام ہے۔ دریافت کیا کہ واپسی کب کی ہے؟ فرمایا کہ کل صبح کی واپسی ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ آپ یہاں آئے ہیں اور ہمارا پرانا تعلق ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی دعوت کروں لیکن کل آپ کی واپسی ہے، اور پھر آپ کا جہاں قیام ہے وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے، اگر مَیں اصرار کروں کہ آج شام کو آپ کو میرے یہاں کھانے کے لئے آنا ہی پڑے گا تو یہ آپ کے لئے بجائے راحت کے ایک زحمت سی ہو جائے گی، اس لئے مَیں آپ کی خدمت میں سو روپے دعوت کی جگہ پر پیش کرتا ہوں، آپ جب چاہیں جو چاہیں کھالیں۔ مولانا نے بھی وہ نوٹ لے کر اپنے سر پر رکھے، اور بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ وہاں مفتی صاحب نے ایسا اصرار نہیں کیا کہ اتنی دور سے آئے ہیں اور بڑی مدت کے بعد آئے ہیں اور ہمارا تو پرانا تعلق ہے، آپ کو تو میں اپنی دعوت کھائے بغیر جانے ہی نہیں دوں گا، چاہے ریزرویشن کینسل کرنا پڑے؛ تو کرو۔ اور مولانا نے بھی یوں نہیں کہا کہ آپ نے مجھے سو روپے دے دئے، کیا میں آپ کے سو روپے کا بھوکا ہوں۔ اس لئے

اصل تو یہ ہے کہ جس کی خدمت میں دعوت پیش کی جارہی ہے اس کی راحت رسانی مقصود ہو۔

بہرحال! ہم نے اپنے معاشرے اور سماج میں کچھ ایسی شکلیں اختیار کرلی ہیں کہ جس کی وجہ سے دعوت میں بھی رسم ورواج کو داخل کر کے دعوت کو اپنے لئے بجائے راحت کے زحمت کا سامان بنالیا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔یہی چیز ملحوظ خاطر رہے کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے اس کی راحت رسانی مقصود ہو، ہماری یہ دعوت اس کے لئے راحت اور خوشی کا ذریعہ بنے، زحمت کا ذریعہ نہ بنے۔اس کا اہتمام کیا جائے۔

میزبان کے بھی حقوق ہیں

اور ایک بات یہ ہے کہ جس کے یہاں دعوت دی گئی ہے اس میزبان کے بھی حقوق ہیں، جیسے آپ کو اگر دعوت دی گئی ہے اور آپ کو اجازت بھی دی ہے کہ آپ اپنے ساتھ دو چار ساتھیوں کو بھی لا سکتے ہیں تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر آپ کو تنہا دعوت دی گئی ہے اور آپ چار پانچ آدمیوں کو لے کر پہنچ گئے، تو یہ درست نہیں ہے، بلکہ ضرورت ہے کہ پہلے سے صاحبِ خانہ کو اطلاع دیں۔

حدیثِ پاک میں صراحت ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کی، ایک آدمی آپ کے ساتھ ہولیا، جب آپ داعی کے گھر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ آدمی ہمارے ساتھ ہولیا ہے، اگر تم اجازت دو تو وہ کھانے میں شریک ہوگا، ورنہ ہم اس کو کہہ دیتے ہیں کہ تم واپس چلے جاؤ۔اس نے کہا کہ وہ شریک ہوجائے۔ (مسند احمد،۱۷۱۲۶)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ کوئی کسی کے یہاں بغیر دعوت کے شریک ہوا تو چور بن کر داخل ہوا اور لٹیرا بن کر نکلا (شعب الایمان،۱۴۳۲۴) یہ اس وقت ہے کہ اجازت نہیں دی گئی ہے، ورنہ

اگر اجازت دی ہے تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

پھر یہ ہے کہ مہمان کو بھی میزبان کا خیال رکھنا چاہیے، اگر آپ کسی کے یہاں مہمان بن کر جارہے ہیں تو آپ اس کو پہلے سے اطلاع کردیں کہ میں فلاں وقت پہنچوں گا تاکہ وہ آپ کے لئے اس کے مطابق تیاری کرلے۔ اور اگر بلا اطلاع کے جارہے ہیں تو پھر ایسے وقت پہنچئے کہ اس کو آپ کی میزبانی کے لئے کچھ تیاری کا موقعہ ملے، اور کوئی دشواری نہ ہو۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ کوئی مہمان اپنے میزبان کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے (ترمذی شریف، ۷۸۹) اس لئے کہ اگر آپ کسی کے یہاں مہمان بن کر گئے اور آپ نے اس کو بتلائے بغیر ہی روزے کی نیت کرلی، اب اس بے چارے نے محنت کرکے آپ کے لئے ناشتہ اور کھانا تیار کیا، اور جب وقت پر اس نے پیش کیا تو آپ نے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، تو آپ نے اس کا وقت اور پیسہ دونوں ضائع کیا اور اس کو تکلیف بھی پہنچائی، تو جیسے چوری کرنا، زنا کرنا، شراب پینا؛ یہ سب حرام کام ہیں، ایسے ہی کسی مؤمن کو تکلیف اور ایذاء پہنچانا بھی حرام ہے، اور خاص کر اس طرح کرکے اپنے میزبان کو تکلیف میں ڈالنا تو بہت ہی زیادہ برا ہے۔

اور پھر میزبان کے کھانے کا جو وقت ہے اس کی رعایت بھی مہمان کے لئے ضروری ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے میزبان کے یہاں گیارہ بجے کھانا کھایا جاتا ہے، اور مہمان صاحب کہیں ملاقات کے لئے ایسے نکل گئے کہ وہ بے چارہ چاروں طرف آدمی دوڑا رہا ہے، اور دسترخوان بچھاکر مہمان کے انتظار میں پریشان ہے اور یہ مہمان صاحب کہیں ایسے گئے کہ میزبان کو پتہ ہی نہیں چل رہا ہے، اب ظہر کے بعد آئے، پوچھا کہ کہاں رہ گئے

تھے، تو کہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے ملنے کے لئے گیا تھا، انہوں نے بڑا اصرار کیا کہ چلو ذرا فلاں جگہ گھوم کر آتے ہیں، تو ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ بھائی! آپ تو گھومنے چلے گئے اور اس بے چارے کو تو زحمت میں ڈال دیا اور پریشان کر دیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کہیں جانا ہے تو پہلے سے اطلاع کر دیجئے، اور اگر کھانے کا ارادہ نہیں ہے تو پہلے سے کہہ دیجئے کہ آج کھانے کا ہمارا ارادہ نہیں ہے یا بھوک نہیں ہے۔ یا اگر دیر سے کھانے کا ارادہ ہے تو کہہ دیجئے کہ آپ اپنے وقت پر کھا لینا، اور میرا کھانا رہنے دینا، مجھے ایک ضرورت سے جانا ہے، مَیں وہاں سے آکر اپنے طور پر کھا لوں گا۔ اس طرح کرنے سے میزبان کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بہرحال! دعوت کے اندر ان ساری چیزوں کی رعایت کرنا بہت ضروری ہے۔

دعوت قبول کرنے کے شرائط

اب دعوت قبول کرنے کو ایک حق قرار دیا گیا ہے تو اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی شرعی مانع نہ ہو۔ جہاں دعوت کی جارہی ہے وہاں شریعت کے خلاف کوئی کام ہو رہا ہے مثلاً وہاں ناچ گانا ہو رہا ہے، یا وہاں تصویر کشی ہو رہی ہے، یا وہاں اور کوئی ایسی شکل ہے جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اور اس کو معلوم ہے کہ اگر مَیں اس دعوت میں شرکت کروں گا تو مجھے بھی اس گناہ میں مبتلا ہونا پڑے گا، تو اس صورت میں دعوت کا حق باقی نہیں رہتا۔ پھر وہ اس دعوت میں نہ جائے۔

اور اگر ایسی بات ہے کہ وہاں وہ حرام کام تو ہو رہا ہے اور میرے مبتلا ہونے کی نوبت نہیں آئے گی، جیسے تصویر کشی ہو رہی ہے لیکن اس کی تصویر کوئی نہیں کھینچے گا، تو اس صورت میں اگر عامی آدمی ہے تو اس کے لئے تو جانے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر وہ دینی مقتداء ہے، جیسے مولوی صاحب یا امام صاحب ہیں اور ان کے وہاں جانے سے لوگوں پر غلط اثر پڑے گا، تو پھر

چاہے خود ان کے مبتلا ہونے کی نوبت نہ آتی ہو، تب بھی ان کے لئے ایسی دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

آج کل دعوتوں میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط مجمع ہوتا ہے، یہ مخلوط مجمع بھی حرام ہے، لہٰذا ایسے مخلوط مجمع والی دعوتوں میں شرکت کرنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اگر ایسے مجمع والی دعوت میں آپ جائیں گے تو آپ اس حرام میں مبتلا ہوں گے۔

﴿غلط رسم ورواج ختم کرنے کے لئے ایک مفید مشورہ﴾

اب اگر آپ ہتھیار ڈال دیں اور یوں کہنے لگیں کہ کیا کریں، ان کے یہاں تو جانا ہی پڑے گا، اگر نہیں جاؤں گا تو سوسائٹی میں نکّو بن جاؤں گا اور تنہا رہ جاؤں گا۔ اگر اس طرح آپ ہتھیار ڈالتے رہیں گے تو پھر دھیرے دھیرے شریعت کی ساری چیزیں ختم ہو کر غلط رسم ورواج جگہ پاتے رہیں گے۔ اس لئے سماج میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ان کو یہ کہیں کہ اگر آپ ہمیں دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمارے اصول یہ ہیں جو ہمارے گھر کے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی بتلائی ہوئی ہدایات پر مبنی ہیں، اگر آپ ان کا خیال رکھتے ہیں تو ہم آپ کے یہاں دعوت میں شریک ہوں گے؛ ورنہ ہم نہیں آئیں گے۔ اگر کچھ لوگ ایسا کریں گے تو پھر وہ برائیاں جو ہمارے معاشرے اور سماج میں دن بہ دن پھیلتی جا رہی ہیں ان پر ان شاء اللہ روک لگ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ﴾ اور چھینک کھانے والے کو جواب دینا۔

مسلم شریف کی روایت میں چھ حقوق بتلائے گئے ہیں ﴿اِذَا لَقِيْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ﴾ اوپر کی روایت میں تو سلام کا جواب دینا بتلایا تھا، اور اس روایت میں بتلاتے ہیں کہ جب تم اس سے ملو

تو اس کو سلام کرو۔اس سے معلوم ہوا کہ سلام کرنا بھی حق ہے اور سلام کا جوب دینا بھی حق ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

﴿وَاِذَادَعَاکَ فَأَجِبْهُ﴾ جب وہ دعوت دے تو قبول کرو۔

﴿مسلمان کا ایک حق؛ خیر خواہی کرنا﴾

﴿وَاِذَااسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَهُ﴾ اور جب وہ آپ سے خیر خواہی چاہے تو آپ اس کی خیر خواہی کیجئے، مطلب یہ ہے کہ کسی بات میں وہ آپ سے مشورہ طلب کرے تو اس میں اس کے لئے جو خیر ہو؛ وہی مشورہ دینا چاہیے، اس میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، اور جس کو مشورہ دیا جارہا ہے وہ بھی یہی سمجھے۔آج کل تو مشورہ دینا بھی مشکل ہو گیا ہے، کسی کو کسی کام کا مشورہ اس کے حالات کے پیش نظر دیا جاتا ہے، اور جو بات اس کے لئے خیر خواہی کی ہوتی ہے وہی بتلائی جاتی ہے، تو پھر وہ سارے لوگوں میں یوں کہتا پھرتا ہے کہ مجھے فلاں صاحب نے یہ کہا ہے، گویا وہ اپنے اوپر آنے والے اعتراض کو ٹالنے کے لئے مشورہ دینے والے کا نام استعمال کرتا ہے، اور اس طرح اپنی ساری بلا کو مشورہ دینے والے کے سر ڈال رہا ہے۔مشورہ دینے والے نے اپنی بھلائی کے ارادہ سے ایسا مشورہ تھوڑا ہی دیا تھا۔اس لئے یہ طریقہ بھی غلط ہے۔

﴿چھینکنے والے کا جواب﴾

﴿وَاِذَاعَطَسَ فَحَمِدَاللهَ فَشَمِّتْهُ﴾ جب کسی کو چھینک آوے اور وہ الحمدللہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھینک کھانے والا اگر الحمدللہ کہے تب ہی ہمیں جواب میں یرحمک اللہ کہنا ہے ۔اگر وہ الحمدللہ نہیں کہتا تو پھر ہمیں جواب

میں یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے چھینک کھائی اور الحمدللہ کہا، نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ فرمایا، پھر دوسرے کو چھینک آئی اور اس نے الحمدللہ نہیں کہا تو آپ نے جواب میں یرحمک اللہ نہیں کہا، اس پر اس دوسرے نے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کو یرحمک اللہ سے دعا دی اور مجھے نہیں دی؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے الحمدللہ کہا تو میں نے یرحمک اللہ کہا، اور تم نے الحمدللہ نہیں کہا تو میں نے جواب نہیں دیا۔ (بخاری شریف،۱۷،۵۸)

﴿وَاِذَامَرِضَ فَعُدْهُ﴾ اور جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو۔

﴿وَاِذَامَاتَ فَاتْبَعْهُ﴾ اور جب انتقال کر جائے تو اسکے جنازے کے ساتھ جایا جائے

﴿سات چیزوں کا حکم، اور سات چیزوں سے ممانعت﴾

۲۳۹. وعن أبی عمارة البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللہِ ﷺ بِسَبْعٍ، وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ أَمَرَنَا بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ ، وَاتِّبَاعِ الْجَنَازَةِ ، وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ ، وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ ، وَنَصْرِ الْمَظْلُوْمِ ، وَاِجَابَةِ الدَّاعِیْ ، وَاِفْشَآءِ السَّلَامِ . وَنَهَانَا عَنْ خَوَاتِيْمَ، أَوْتَخَتُّمٍ بِالذَّهَبِ ، وَعَنْ شُرْبٍ بِالْفِضَّةِ ، وَعَنِ الْمَيَاثِرِ الْحُمُرِ ، وَعَنِ الْقَسِّیْ ، وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَاِسْتَبْرَقِ وَالدِّيْبَاجِ.

وفی روایة: وَاِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِی السَّبْعِ الْأُوَلِ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو سات چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع کیا۔

﴿۱﴾ ایک تو بیمار کی عیادت اور خبر گیری کا حکم دیا ﴿۲﴾ اور جنازے کے ساتھ جانے کا حکم دیا ﴿۳﴾ اور چھینک کھانے والے کے جواب دینے کا حکم دیا۔

﴿۴﴾اور قسم دینے والے کو اپنی قسم میں بری کرنے کا حکم دیا۔مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی معاملے پر یا کسی بات پر قسم کھالے، اور اس نے جس چیز کی قسم کھائی ہے وہ شریعت کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کام کو کرنے کا اہتمام کرے اور اس طرح اپنی قسم سے بری ہو جائے، تا کہ قسم ٹوٹ کر کفارہ واجب نہ ہو اور گنہ گار ہونے کی نوبت نہ آئے۔اب کسی نے کسی بات پر قسم کھائی اور اس کے بری ہونے کا دارومدار آپ پر ہے، مثلاً وہ آپ کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے، اور اس نے یوں کہہ دیا کہ اللہ کی قسم! مَیں آپ کو اپنے گھر ضرور لے جاؤں گا، اب آپ یوں کہیں کہ مَیں تو نہیں آؤں گا، جا تجھ سے جو ہو وہ کر لے ویسے اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے اگر قسم کھالی ہے تو ظاہر ہے کہ اگر آپ اس کے گھر چلے جائیں گے تو وہ بے چارہ اپنی قسم میں حانث ہونے سے بچ جائے گا، اس کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ گنہ گار نہیں ہوگا اور کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا اور آپ کے لئے بھی کوئی دشواری نہیں ہے، کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں ہے، اور آپ کے کسی کام میں کوئی خلل بھی نہیں پڑ رہا ہے، آپ آسانی سے اس کی ڈیمانڈ اور تقاضہ کو پورا کر سکتے ہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اس کا خیال کیجئے، اور اس کے گھر چلے جائیے۔یہ تو ابرار المقسم کی ایک مثال دی ہے

﴿۵﴾اور جو آدمی مظلوم ہے اس کی مدد کرنا، کسی کی حق تلفی ہوئی ہے تو آپ اس کی مدد کر کے اس کا حق دلوائیے، اور ظالم کو اس پر ظلم کرنے سے روکئے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا﴿أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا﴾ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، تو ایک صحابی نے پوچھا﴿یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! أَنْصُرُہُ اِذَا کَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَیْتَ اِنْ کَانَ ظَالِمًا فَکَیْفَ أَنْصُرُہُ؟﴾ اگر میرا مسلمان بھائی مظلوم ہے تو مَیں مدد

کروں گا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن آپ بتلائیں گے کہ اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیسے کی جائے گی؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو، کیونکہ یہ ظلم اس کے لئے ہلاکت کا ذریعہ ہے، یہ نادانی سے ظلم کر کے اپنے آپ کو اللہ کے غضب کا مورد بنا رہا ہے، اور اپنے آپ پر آفت لا رہا ہے، آپ اس کو ظلم سے روکئے، یہی اس کی مدد ہوئی۔ ایسا نہیں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ بھی اس کے ظلم میں اس کا ساتھ دیں۔

﴿۶﴾ دعوت دینے والے کی دعوت کا قبول کرنا ﴿۷﴾ اور سلام کو پھیلانا۔ یہ سات چیزیں وہ ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا۔

اور جن سات چیزوں سے منع فرمایا وہ یہ ہیں:-

﴿۱﴾ سونے کی انگوٹھی کے استعمال سے منع فرمایا۔ مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، اور چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے چار ماشہ سے کم کی ہو تو اس کی اجازت دی گئی ہے، البتہ عورتوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال جائز ہے، چونکہ یہ دونوں زیور کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن مردوں کے لئے تو سونے کی انگوٹھی پہننا بالکل جائز نہیں ہے، چاندی کی ہو تو ساڑھے چار ماشہ سے کم کی ہو تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اُس زمانہ میں انگوٹھی کو مُہر لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اس لئے جن لوگوں کو مُہر لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے قاضی، مفتی، حاکم وغیرہ؛ ان کے لئے مناسب سمجھا گیا ہے، اور جن کو ضرورت پیش نہیں آتی ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو استعمال نہ کریں۔ آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چاندی کی اجازت ہے تو وہ چار چار پانچ پانچ انگوٹھیاں ہاتھ میں لگائے رہتے ہیں؛ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔

﴿۲﴾ اور چاندی کے برتن کے اندر کسی چیز کے پینے سے منع کیا ہے۔چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال حرام ہے، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ کافروں کے لئے یہ دنیا میں ہیں اور ہمارے لئے آخرت میں ہیں۔عورتوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال زیورات کے طور پر تو جائز ہے لیکن چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے حرام ہے۔

﴿۳﴾ اور سرخ گدڑی کے استعمال سے منع کیا ہے۔ریشمی کپڑے سے ایک گدڑی سی بنائی جاتی تھی جس میں روئی وغیرہ بھری جاتی تھی اور اس کو گھوڑے کی زین پر رکھی جاتی تھی چونکہ زین چمڑے کی ہوتی ہے اور سخت ہوتی ہے، اس لئے آدمی براہِ راست زین پر سوار نہیں ہوتا بلکہ کوئی نرم کپڑا اور گدڑی وغیرہ اس پر بچھایا جاتا ہے، تو اُس زمانہ میں گھوڑے کی زین پر رکھنے کے لئے ریشم کے کپڑے میں روئی بھر کر گدڑی تیار کی جاتی تھی اور سرخ رنگ کی ہوا کرتی تھی، تو وہ ریشمی ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

﴿۴﴾ اور قسّی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔قسّی ایک قسم کا کپڑا ہوا کرتا تھا جو ریشم اور کتان دونوں کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا، گویا اس میں ریشم ہونے کی وجہ سے اس سے منع فرمایا گیا ہے۔اور قس ایک شہر کا نام ہے جو ساحل سمندر پر آباد ہے، وہاں سے یہ کپڑے تیار ہو کر آتے تھے، اس لئے ان کو قسّی کہتے ہیں۔

﴿۵﴾ اور ریشم کا لباس پہننے سے منع فرمایا ہے۔یہ بھی مردوں کے لئے ہے، عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے۔

﴿۶﴾ اور استبرق کے استعمال سے منع فرمایا۔حریر تو مطلق ریشم کو کہتے ہیں لیکن

استبرق موٹے قسم کے ریشم کو کہا جاتا ہے۔

﴿۷﴾ اور دیباج کے استعمال سے منع فرمایا۔ دیباج میں بھی ریشم کی ملاوٹ ہوتی تھی بہرحال! ان سات چیزوں کے استعمال سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن سات چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ کسی کی گم شدہ کوئی چیز ملی ہو تو اس کا اعلان کر کے اس کے مالک تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

سَتْرُ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ
وَالنَّهْيُ عَنْ اِشَاعَتِهَا لِغَيْرِ ضَرُوْرَةٍ

مسلمانوں کے عیوب چھپانے کا حکم
اور
بے وجہ انہیں عام کرنے کی ممانعت کا بیان

۱۴؍ربیع الاوّل ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۸؍اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

عام حالات میں عیب گوئی کی اجازت نہیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کے اندر کوئی عیب ہو یا اس کی کوئی عادت ایسی ہو جو لوگوں کے سامنے اگر ظاہر ہو جائے تو اس کی بدنامی کا باعث ہو؛ تو ایسی چیزوں کو چھپانے اور بلا شرعی ضرورت کے ایسی چیزوں کو ظاہر کرنے کی ممانعت کو بیان کیا جاتا ہے یعنی کوئی ایسی عادت کسی مؤمن کے اندر پائی جاتی ہے کہ اگر اس کو ظاہر کیا گیا تو اس پر عیب لگتا ہے، تو ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ اس کو چھپایا جائے اور لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی شرعی ضرورت اس بات کی متقاضی ہو کہ اس کو ظاہر کیا جائے تو ان تمام حدود و شروط اور قیود کی رعایت کرتے ہوئے جو ایسے موقعہ پر شریعت نے عائد کی ہیں؛ اس کو اسی حد تک ظاہر کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً وہ عیب ایسا ہے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس نقصان سے دوسروں کو بچانے کی حد تک اس کو ظاہر کرنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

بہر حال! چاہے واقعی طور پر کسی مسلمان میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہو تو اس کو

چھپانے کا اور پردہ پوشی کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ پردہ دری یعنی اس کے عیب کو کھولنے سے منع کیا ہے۔البتہ اگر وہ آدمی اپنی اس برائی میں بہت زیادہ آگے بڑھ چکا ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ حاکم کی طرف سے اس کو تنبیہ کی جائے یا سزا دی جائے اس کے بغیر وہ اپنی اس برائی سے باز نہیں آئے گا تو ایسے موقعہ پر پھر اللہ تعالیٰ کا حق ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر شرعی سزا جاری ہو جائے اس مقصد سے حاکم کے سامنے کوئی آدمی اس چیز کو ظاہر کرے تو اس کی اجازت ہے۔

﴿بعض امور کی اشاعت سے بھی برائیاں پھیلتی ہیں﴾

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ بیشک جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان (فاحشہ) برائی کے کام پھیلیں تو ایسے لوگوں کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔جیسے زنا کاری یا بے حیائی کے کام کا لوگوں کے درمیان اظہار، یا ایسی چیزیں جو بے حیائی تک لے جاتی ہیں ان کی اشاعت، یا مثلاً کسی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، یا ارتکاب تو نہیں کیا ہے لیکن اس پر الزام لگا کر لوگوں کے درمیان اس کو پھیلایا جا رہا ہے؛ یہ سب اشاعتِ فاحشہ کا مصداق ہے۔

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی جانے والے واقعہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔گویا ایسی باتوں کو پھیلانے سے بھی شریعت نے منع کیا ہے۔اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے واقعات اگر پیش آئے ہیں اور ان کو لوگوں کے درمیان ظاہر کیا جائے گا تو بہت سے طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایسی چیزوں کو سن کر وہ بھی ان

برائیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں اوران کی طبیعتوں کے اندرایسا جذبہ بیدار ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بھی ان برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔لہٰذا ایسے واقعات کولوگوں کے درمیان ظاہر نہ کرنا چاہئے،واقعتاً پیش آئے ہوں تب بھی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی بلکہ ان کو چھپایا جانا چاہیے۔

ہاں!اگرکسی سے اس جرم کا صدورنفسانی خواہش میں آ کرہوگیا ہے اوراس سے پہلے کبھی اس سے کوئی ایسی صورت پیش نہیں آئی تھی اورتنبیہ کر کے اس کوآئندہ اس سے بچایا جاسکتا ہےتو پھر حاکم کے سامنے اس کوظاہر نہ کیا جائے، بلکہ خودہی تنہائی میں نصیحت کردی جائے۔اوراگروہ اپنی اس برائی کے اندرآگے بڑھ چکا ہے کہ جب تک سزانہ پاوے تب تک وہ اپنی اس برائی سے بازنہیں آسکتا ہے،تو پھر حاکم کواطلاع دی جاسکتی ہے۔

بہرحال!اس آیت کولانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے واقعات اگرمعاشرہ وسماج میں پیش آئے ہیں تو ان کا اظہار نہ کیا جائے،لوگوں میں پھیلایا نہ جائے،اس لئے کہ لوگوں میں پھیلانے میں جہاں ایک مؤمن کے عیب کوظاہر کرنا ہے،وہیں دوسرے ایسے لوگ جواس چیز سے بچے ہوئے ہیں لیکن ان کی طبیعتوں میں کجی ہے اورشیطان کے پھندے میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے؛ایسے لوگوں کوبھی برائی میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے۔اس لئے اس سے منع کیا ہے۔

﴿پردہ پوشی کا اہم فائدہ﴾

۲۴۰.عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لَايَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْداً فِی الدُّنْيَا اِلَّاسَتَرَاللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کے اندر کوئی بندہ اگر کسی دوسرے کے عیب کو چھپاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیب کو چھپائیں گے۔

ویسے ایک چیز یہ بھی ہے کہ کوئی آدمی کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مناسب اس کو بدلہ دیا جاتا ہے، ایسے ہی کوئی برائی اور گناہ کا کام کرتا ہے تو سزا بھی اس کے مناسب دی جاتی ہے، جیسے حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ نَظَرَ اِلیٰ مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ یُلْقیٰ الْاٰنُکُ فِیْ عَیْنَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (نصب الرایہ)﴾ کسی آدمی نے کسی عورت کی خوبصورتی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں قیامت کے روز سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔ گویا جو گناہ کیا تھا اس کے مناسب اس کو سزا دی گئی کہ آنکھوں کے ذریعہ دیکھ کر اس نے لذت حاصل کی تھی اور گناہ آنکھوں کے ذریعہ کیا تھا؛ تو قیامت کے روز اسی کے مناسب سزا اس کے لئے تجویز کی گئی۔

یا جیسے کوئی آدمی گانا سنے تو اس کے کان کے اندر سیسہ ڈالنے کا تذکرہ روایت میں آتا ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ، ۴۵۴۹) وہاں بھی آدمی کان کے ذریعہ لذت حاصل کر کے گناہ کرتا ہے، اسی کے مناسب اس کو سزا دی جاتی ہے۔

تو عام طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی گناہ پر آخرت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے یا کسی نیکی پر آخرت میں جو بدلہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مناسبت بھی دیکھی گئی ہے۔ جیسا گناہ ویسی سزا، جیسی نیکی ویسا بدلہ۔

تو یہاں بھی ایسا ہے کہ دنیا میں ایک نیکی کی تھی کہ اپنے مسلمان بھائی کا عیب چھپایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں اس کے لئے جو بدلہ تجویز فرمایا اس میں اس کی اس نیکی کے

مناسب اس کو بدلہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیب لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کریں گے، بلکہ چھپائیں گے۔

عیب کو چھپانے کی دو شکلیں ہیں یا تو اس کا تذکرہ ہی نہیں آئے گا اور اللہ تعالیٰ ابتداءً ہی اس کو معاف فرمادیں گے۔اور دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اس کو اللہ تعالی اپنے قریب بلا کر اس طرح سے کہ دوسرے لوگ نہ سن سکیں اس کے سامنے اس کے گناہ کا تذکرہ کریں گے اور وہ اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالی فرمائیں گے کہ جاؤ! تم نے دنیا میں فلاں کا گناہ چھپایا تھا، یہاں مَیں بھی تمہارے گناہ چھپاتا ہوں اور معاف کرتا ہوں۔

اس روایت سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو آدمی اس بات کا خواہش مند ہو کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے گناہ، عیوب اور اس کی برائیوں کو چھپایا جائے، اور اس کو معاف کر دیا جائے؛ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے عیوب کو چھپائے۔

ہم میں سے کون ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو، کوئی گناہ اور برائی نہ ہو، ہم میں سے ہر شخص اپنے عیوب سے واقف ہے اور وہ خود اپنے حالات کو بخوبی جانتا ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ مجھ میں کیا کیا برائیاں ہیں اور ہر ایک کی یہ تمنا اور خواہش بھی ہوتی ہے کہ ان کو چھپایا جائے۔ بلکہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے ایک موقعہ پر حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا کہ دیکھو! قیامت کے روز اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی سے یوں کہہ دیں کہ تو نے جتنی برائیاں اور گناہ کئے تھے وہ سب ایک شرط کے ساتھ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔اور وہ شرط یہ ہے کہ تیرے گناہوں کی ایک فلم تیار کر کے تیرے ماں

باپ، مشائخ اور تیرے بڑے چھوٹوں کو دکھائی جائے اور یہ سب لوگ دیکھیں کہ تو نے یہ یہ کام کئے ہیں اور پھر تجھے معاف کیا جائے گا، تو کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟ تو وہ تیار نہیں ہوگا

بہر حال! ہم میں ہر شخص کسی نہ کسی برائی، عیب اور کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہے اور ہر ایک کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا لوگوں کے سامنے اظہار نہ ہو اور یہ چیز چھپی ہی رہے۔ جب ایسا ہے تو پھر اس کا آسان طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلا دیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو آپ بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیجیے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہے کہ ہم تو لوگوں کے عیوب کو کھولنے کے درپے رہیں اور دل میں خواہش یہ رکھتے ہیں کہ ہمارے عیوب کو چھپایا جائے۔ یہ کیسی بات ہے، یہ تو نادانی والی بات ہے۔

اس لئے ہر آدمی اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے ایک بہترین تدبیر اختیار کر سکتا ہے کہ اپنی زبان بند رکھے۔ لوگوں کے عیوب نادانستہ طور پر آپ کے علم میں آ جائیں، تب بھی ان کا کسی کے سامنے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

...... مجھے تو کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا

اللہ کے جو مقبول اور مخصوص بندے ہوا کرتے ہیں ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی بصیرت وفراست عطا فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ ان کے سامنے لوگوں کے عیوب اور گناہ کھل جاتے ہیں لیکن وہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے بلکہ وہ تو اس کو پسند بھی نہیں کرتے کہ لوگوں کے عیوب ہمارے سامنے کھلیں۔ بعض بزرگوں کے حالات میں لکھا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو اپنے سر اور چہرے کے اوپر نقاب ڈال دیتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ کیا کیا جائے؟ مجھے تو کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا، کوئی سور نظر آتا ہے، کوئی بندر نظر آتا

ہے،کوئی کتا نظر آتا ہے۔لوگوں نے جیسے جیسے گناہ کئے ہوتے ہیں،اس کے مناسب صورتیں نظر آتی ہیں۔تو لوگوں کے عیوب جواللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر اختیاری طور پر ان کے سامنے آتے ہیں ان کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، چونکہ پھر ان کو چھپانا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کے عیوب چھپے رہیں تو اس کا یہ بہت آسان طریقہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بہترین علاج بتلایا ہے۔

﴿یہ تو نہایت ہی بے شرمی کی بات ہے﴾

۱۴۱.وعنه قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: كُلُّ أُمَّتِيْ مُعَافًى اِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ أَن يَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلاً ثُمَّ يُصْبِحُ وَقَدْ سَتَرَهُ اللهُ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُ: يَافُلانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا، وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ، وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللهِ عَنْهُ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری امت کے تمام گنہ گاروں سے درگذر کا معاملہ کیا جائے گا یعنی ان کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا،مگر وہ لوگ جو مجاہر ہیں یعنی کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرنے والے ہیں،اور یہ بھی کھلم کھلا کرنے ہی کے برابر ہے کہ آدمی رات کو کوئی گناہ کرے پھر صبح ایسی حالت میں کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اس کی پردہ پوشی فرمائی تھی لیکن وہ خود ہی دوسروں کو کہتا پھرتا ہے کہ میں نے تو رات میں یہ یہ کیا،حالانکہ رات بھر اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی،اور یہ صبح میں اللہ تعالیٰ کے پردہ کو کھول دیتا ہے۔

کھلم کھلا ارتکاب کی ایک شکل تو یہ ہے کہ وہ گناہ لوگوں کے دیکھتے ہوئے کر رہے ہیں،ایسوں سے اللہ تعالیٰ درگذر سے کام نہیں لیتے۔ایک آدمی گناہ کرے اور ڈرتے ڈرتے

چھپ چھپ کر کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی پھر اس کو معاف کر دیتے ہیں کہ اگرچہ گناہ کا ارتکاب کیا لیکن اتنا تو کیا کہ چھپ کر کیا۔ جیسے ایک آدمی آپ کا ماتحت ہے اور وہ آپ کے سامنے آپ کی نافرمانی کر رہا ہے، کھلم کھلا ایسی چیزوں کا ارتکاب کرتا ہے جس سے آپ نے روکا ہے؛ تو پھر بھلا اس کو آپ کیسے چھوڑ دیں گے؟ آپ کہیں گے کہ اس کو در بدر کر دو۔ اور دوسرا ایسا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ اُلٹا سیدھا کرتا ہے لیکن چھپ کر کرتا ہے، تو بہت سی مرتبہ آپ بھی اس سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔

بہرحال! جو لوگ کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ درگذر کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے شرماتا ہے تو ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے بھی حیا رکھے اور شرمائے اور حیا کا تقاضہ یہ ہے کہ اس طرح کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب نہ کرے۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ اندر باہر کے تمام حالات سے واقف ہے لیکن ایک آدمی جب کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو، تو یہ اعلیٰ درجہ کی ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی ہے۔ ایسوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف نہیں کیا جاتا۔

دوسرے درجہ کی ڈھٹائی

اب مجاہرہ اور کھلم کھلا گناہ کرنے کی ایک شکل اور بتلائی جا رہی ہے کہ گناہ تو کیا چھپ کر لیکن پھر خود اپنی زبان سے اس کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بھی کھلم کھلا کرنے کی ہی ایک شکل ہے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿وَاِنَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ﴾ ایک آدمی رات میں چھپ کر کوئی کام کرتا ہے یعنی کرتے وقت تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب اس نے چھپ کر کیا تھا

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس کا معاملہ چھپا رکھا تھا، کسی کو پتہ چلنے نہیں دیا تھا اور کسی کو دیکھنے کا موقعہ نہیں دیا۔

دیکھو! نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا اس امت پر یہ بڑا انعام ہے۔ پچھلی امتوں کا حال یہ تھا کہ وہ گناہ کرتے تھے تو رات کو گناہ کیا اور صبح ان کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ آج اس نے یہ گناہ کیا، یعنی کوئی آدمی گناہ کا کام چھپ کر کرتا تھا تب بھی ظاہر ہوجاتا تھا اور سب لوگ اس کے دروازے پر پڑھ لیتے تھے کہ آج اس نے یہ حرکت کی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر کرم فرمایا ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْأَغْلاَلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے یہ چیز نقل کی ہے (درمنثور) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل اور آپ کی برکت سے امتِ محمدیہ کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ کسی نے اگر چھپ کر گناہ کیا ہے تو وہ ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ گھر والوں کو بھی پتہ نہیں چل پاتا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے۔

خیر! اس نے چھپ کر کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی چھپایا اور ظاہر نہیں کیا، لیکن پھر خود یہ آدمی ہی لوگوں کے سامنے اپنی زبان سے اظہار کرتا ہے، کسی کو کہتا ہے کہ کل تو میں نے فلاں فلم دیکھی، اور ٹی وی دیکھا، کل میں نے شراب پی۔ نعوذ باللہ! کل میں نے فلاں کام کیا۔ یعنی کسی کو پتہ تو تھا نہیں لیکن اب وہ اپنی ہی زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے؛ تو یہ بھی کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کرنے کی ایک شکل ہوئی۔

کچھ لوگ تو وہ ہیں جو گناہ کھلم کھلا کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ ہمارے معاشرے و سماج میں تعداد کے لحاظ سے اقل قلیل ہوا کرتے ہیں، لوگ بھی ان کو بے حیا اور ڈھیٹ کہا

کرتے ہیں، لیکن ان کے مقابلہ میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چھپ کر گناہ کرتے ہیں اور پھر لوگوں کے سامنے اپنی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں؛ یہ بھی ''مجاہرۃ'' میں داخل ہیں اور ایسوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف نہیں کیا جاتا۔

کسی بھی حال میں طعن و تشنیع نہ کرے

۲۴۲. وعنہ عن النبی ﷺ قال: اِذَا زَنَتِ الْأَمَةُ فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا، ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّانِيَةَ فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا، ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّالِثَةَ فَلْيَبِعْهَا، وَلَوْ بِحَبْلٍ مِّنْ شَعْرٍ. ((اَلتَّثْرِيْبُ)): اَلتَّوْبِيْخُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کی باندی زنا کرے، پھر اس کا زنا ثابت ہو جائے تو آقا اس پر حد جاری کرے، لیکن اس کو طعن و تشنیع نہ کرے، پھر اگر دوبارہ زنا کرے تو پھر اس پر حد جاری کرے، لیکن اس کو طعن و تشنیع نہ کرے، پھر اگر سہ بارہ ایسا کرے تو اسے بیچ دے چاہے بالوں کی ایک رسی کے بدلے ہی سہی

یہاں پہلے ایک بات سمجھ لیجئے۔ پہلے زمانہ میں کفار کے ساتھ جنگ ہوا کرتی تھی جس کے نتیجہ میں جو مرد وعورت قید ہوا کرتے تھے ان کے لئے سزا کے طور پر یہ ہوا کرتا تھا کہ ان کو غلام اور باندی بنالیا جاتا تھا، آج کل تو یہ سلسلہ نہیں ہے۔ گھروں میں کام کرنے والیاں جو ہوتی ہیں ان کو کوئی آدمی باندی نہ سمجھے، یہ عورتیں تو آزاد ہیں اور آپ کے یہاں اجیر اور مزدور کے طور پر ہوا کرتی ہیں، باندیاں نہیں ہوتیں۔ باندی تو وہ عورتیں ہوتی ہیں جس کا وہ شخص پورا مالک ہوتا ہے۔

اب دیکھو! وہ آقا اس باندی کا پورا مالک ہے اس کے باوجود نبی کریم ﷺ آقا کو یہ

تعلیم دے رہے ہیں کہ اگر زنا ثابت ہو گیا تو اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے وہ جاری کر دو، لیکن طعن و تشنیع نہ کرو۔

زنا کی شرعی سزاؤں کی تفصیل

بعض گناہ وہ ہیں کہ ان پر شریعت کی طرف سے باقاعدہ سزا مقرر کی گئی ہے، اسی میں سے زنا بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زنا کرنے والا اگر محصن یعنی شادی شدہ ہو، مسلمان اور آزاد ہو، اور اس کا نکاح بھی کسی مسلمان آزاد عورت کے ساتھ ہوا ہو، اور رخصتی بھی ہو چکی ہو اور آپس میں ملے بھی ہوں، اس کے بعد اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے یعنی پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے۔ چونکہ شادی ہو چکی ہے، اس کے لئے زنا سے بچنے کے اسباب مہیا ہیں، اس کے باوجود اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو ایسے آدمی کے لئے بڑی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

اور دوسرا غیر محصن ہے یعنی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو اگر وہ آزاد ہے تو پھر شریعت نے سزا کے طور پر سو کوڑے مقرر کئے ہیں۔ اور اگر وہ غلام یا باندی ہے تو اس کی سزا آدھی یعنی پچاس کوڑے ہیں۔

تو دیکھو! یہاں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی کی باندی نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ زنا ثابت ہو گیا تو آقا کو چاہیے کہ اس پر زنا کی جو حد ہے وہ حاکم کے ذریعہ جاری کروائے۔ اب حاکم کوڑے لگوائے یا خود وہ لگائے؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خود آقا ہی پچاس کوڑے مارے، اور بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ آقا خود سزا جاری نہ کرے بلکہ حاکم کے پاس لے جائے اور وہ اس پر سزا جاری کروائے۔

بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ باندی کا زنا ثابت ہوجائے تو اس پر حد جاری کی جائے ﴿وَلا یُثَرِّبُ عَلَیْھَا﴾ لیکن اس کی توبیخ نہ کرے یعنی اس کو طعن و تشنیع نہ کرے۔ یعنی اس گناہ پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے وہ تو جاری کرنی چاہیے، وہ معاف نہیں ہے۔

اس باب میں اس روایت کو لانے کا اصل مقصد یہی ہے کہ دیکھو! باندی اور آقا کا معاملہ ہے، پھر بھی اس مالک کو شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ باندی جب زنا کرچکی تو اس زنا پر طعن و تشنیع کرے، اور اس کو یوں پکارے کہ اے زانیہ، اے چھینال (اے بدکارہ) اے بدکار وغیرہ۔ ایسا نہ کہے۔ آقا کو بھی یہ حق نہیں دیا حالانکہ وہ مالک ہے اور یہ اس کی مملوکہ ہے، اور اس نے زنا کیا ہے، ایسا نہیں کہ گناہ نہیں کیا لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ برائی کے لئے شریعت کی مقرر کردہ سزا دے دو، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی بھر اس کو طعنہ دیتے رہو۔ جب آقا کو اس کی اجازت نہیں ہے تو اگر کسی ایسے آدمی نے زنا کا ارتکاب کیا ہو جس سے تعلق آقا والا بھی نہیں ہے اور اس کو لوگ زانی، زانیہ کہتے ہیں؛ تو اس کی کہاں اجازت ہوگئی؟

﴿کسی پر زنا کی تہمت لگانے کی شرعی سزا﴾

آج کل تو معاشرہ میں یہ برائی عام ہوچکی ہے۔ حالانکہ شریعت میں تو اس کی بہت بڑی سزا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کو کہہ دے ''اے زانیہ'' اور اس عورت پر زنا ثابت نہیں ہے، تو اس کہنے والے کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ سزا مقرر ہے؛ ان میں سے ایک کسی پر زنا کی تہمت لگانا بھی ہے، چاہے مرد ہو یا عورت ہو۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے معاشرے میں ایسی گالیاں بہت عام ہوگئی ہیں جن میں زنا کی تہمت لگتی ہے۔حالانکہ اسلامی حکومت ہوتی تو ایسی گالی دینے والے کو اسّی کوڑے لگائے جاتے۔اتنا ہی نہیں کہ اسّی کوڑے لگیں گے بلکہ اس کے بعد ایک اور سزا بھی اس کے لئے ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ایسے آدمی پر مہر لگ گئی کہ وہ آدمی کسی بھی معاملہ میں گواہ بن کر آئے تو اس کو ردّ کر دیا جائے گا۔شریعت کی طرف سے کتنی سخت سزا ہے کہ کوڑے تو لگوائے، ساتھ ہی ساتھ اس کو مردود الشہادۃ کر دیا۔اگر توبہ کر لے تب بھی حنفیہ کے یہاں تو وہ قابل قبول نہیں۔دوسرے ائمہ توبہ کے بعد قابلِ قبول مانتے ہیں۔

بہرحال! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا اس روایت کو یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھو! شریعت نے اس کے اس عیب کو چھپانے کی اتنی زیادہ تاکید کی ہے کہ آقا کو بھی یہ اختیار اور اجازت نہیں دی کہ اپنی باندی کو ایسے الفاظ سے خطاب کرے۔اس کا مقصد یہی ہے کہ اس عیب کا کبھی اظہار نہ کیا جائے، اگر گناہ ہوگیا تو اس پر سزا جاری ہوگئی، بس اب معاملہ ختم کرو، آئندہ تمہاری زبان پر اس کا تذکرہ نہیں آنا چاہیے۔

اس کے بعد حضور ﷺ اس آقا سے فرماتے ہیں کہ اگر وہ باندی دوبارہ زنا کرے تو دوبارہ سزا دو، لیکن پھر یہی بات ہے کہ طعن وتشنیع نہیں ہونی چاہیے، بلکہ سزا دے کر معاملہ ختم کر دو۔یہ دوسری مرتبہ میں حکم ہے۔

اور اگر تیسری مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سزا دے کر اس کو بیچ ڈالو۔آقا سے کہا جارہا ہے کہ یہ باندی زنا سے باز نہیں آرہی ہے تو اب تم اس کو اپنی ملکیت میں مت رکھو، اس کو بیچ ڈالو چاہے بالوں کی ایک رسّی کے بدلے میں ہی کیوں نہ ہو

یعنی دو پیسے بھی آئیں، معمولی قیمت آتی ہو؛ تب بھی اس کو بیچ دو۔

﴿ایک اشکال اوراس کا جواب﴾

حدیث کی شرح کرنے والوں نے یہاں ایک سوال قائم کیا ہے کہ زنا کی عادت ایک عیب ہے اور اس عیب کے ساتھ اس کو اپنے یہاں رکھنے کو پسند نہیں کیا گیا، اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے ﴿لایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْہِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ﴾ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ تو جب اس باندی کا اپنی ملکیت میں رہنا پسند نہیں کیا گیا تو پھر دوسرے کو بیچنا کیوں پسند کیا گیا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دوسرے کو بیچتے وقت بتلا دے کہ یہ باندی ایسی ہے کہ میرے یہاں تین مرتبہ زنا کا ارتکاب کرچکی ہے اور اسی لئے مَیں بیچ رہا ہوں، اب خریدار اس عیب کو جانتے ہوئے بھی خریدے تو یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے یہاں جانے کے بعد بھی وہ زنا کروائے۔

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت کسی کے نکاح میں ہے، وہاں بدکاری میں مبتلا ہے، اس نے طلاق دے دی اور دوسرے کے نکاح میں گئی تو سدھر گئی۔ ایسے ہی یہاں بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے یہاں زنا کراتی تھی تو دوسرے کے یہاں جا کر بھی زنا کرائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی اس لئے اس کی نوبت آتی تھی، اور وہاں وہ ضرورت پوری ہوجائے تو ایسی نوبت ہی نہ آئے۔ یا وہ صاحب ذرا ڈھیلے ڈھالے تھے یعنی ان کا اتنا رعب نہیں تھا اور یہ ایسا خطرناک آدمی ہے کہ اس کی آنکھ

دیکھتے ہی دبتی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نوکر کو چوری کی عادت ہے، ایک سیٹھ کے یہاں چوری کرتا تھا، لیکن دوسرے سیٹھ کے یہاں جا کر سدھر گیا۔ ایسے واقعات ہم دیکھتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں مدرسوں میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک طالب علم یہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ گیا اور سدھر گیا۔ بہت سے مدرسوں کے مہتمم صاحبان اس کو مطلقاً پسند نہیں کرتے کہ اس کا دوسری جگہ بھی داخلہ ہو، اس لئے کہ یہاں ایسا کرتا تھا۔ مَیں کہتا ہوں کہ تمہارے یہاں بگڑا ہوا تھا تو کیا ضروری ہے کہ وہاں جا کر بھی بگڑا ہوا ہی رہے، ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر سدھر جائے۔

بہرحال! یہاں حضور ﷺ نے اس کو بیچنے کا جو حکم دیا اس سے کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ ہاں! اتنی بات ضروری ہے کہ خریدار کو یہ بتلا دے کہ اس میں یہ عیب ہے۔ اگر بتلائے بغیر بیچا اور اس کو معلوم ہوگیا تو وہ لوٹا سکتا ہے۔ شریعت نے خریدار کو اس کا اختیار دیا ہے۔

اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کی مددمت کرو

۲۴۳۔ وعنہ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَدْشَرِبَ خَمْراً. قَالَ: اِضْرِبُوْهُ. قَالَ أَبُوْهُرَيْرَةَ: فَمِنَّاالضَّارِبُ بِيَدِهِ، وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهِ. فَلَمَّاانْصَرَفَ قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: أَخْزَاكَ اللهُ. قَالَ: لَا تَقُوْلُوْاهٰكَذَا، لَا تُعِيْنُوْاعَلَيْهِ الشَّيْطَان. (رواه البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی، حضور اکرم ﷺ نے اپنے پاس جو لوگ موجود تھے ان سے کہا کہ اس کو مارو۔ شراب پینے کی سزا شریعت میں اسّی کوڑوں کی شکل میں دی جاتی ہے، یہ واقعہ اس حکم سے پہلے کا ہے۔ خیر! تو کسی نے اس کو ہاتھ سے مارا، کسی کے پاس جوتے تھے

تو اس نے جوتوں سے مارا، کسی نے کپڑے سے مارا، اس طرح حضور ﷺ کے حکم پر سب نے عمل کیا۔ جب اس کو پیٹ چکے اور وہ شخص جانے لگا تو حاضرین میں سے کسی نے اس کو کہا ﴿أَخْـــزَاکَ اللّٰہُ﴾ اللہ تجھے رسوا کرے۔ تو حضور ﷺ نے اس کہنے والے سے فرمایا کہ ایسا مت کہو، اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی مددمت کرو۔ یعنی آپ اس کو بددعا دے رہے ہو کہ اللہ تجھے رسوا کرے، اس کا مطلب تو نعوذ باللہ یہ ہوا کہ وہ پھر سے ایسا کام کرے؟ گویا آپ ایسا جملہ کہہ کر اپنے مسلمان بھائی کے مقابلہ میں شیطان کو سپورٹ (Support) کر رہے ہو۔ ارے! تم کو تو اپنے بھائی کا سپورٹ کرنا چاہیے اور اس کو یہ دعا دینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ تجھے اس کام سے بچائے اور تیری حفاظت کرے، ایسا کیوں کہتے ہو کہ اللہ تجھے رسوا کرے۔

دیکھو! حضور ﷺ نے اس کو سزا تو دلوائی لیکن ایسا جملہ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو یہاں پیش کر کے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی پردہ پوشی کرنی چاہیے اور بلاضرورت اس کے کسی فعل کی اشاعت نہیں کرنی چاہیے، زبان سے اس کا تذکرہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جو سزا کے قابل ہے تو ٹھیک ہے، اس کو سزا دے دو۔ شریعت میں جو سزائیں مقرر ہیں وہ معاف نہیں ہوسکتیں، لیکن سزا دینے کے بعد وہ چیز وہیں بند ہو جانی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ مل رہے ہیں تو اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ ایسا ہوا اور ویسا ہوا۔ اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ ایک مؤمن کی حق تلفی ہے اور اس کے عیب کو ظاہر کرنا ہے، اس لئے شریعت کہتی ہے کہ اس کے عیب کو چھپاؤ۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے

قَضَآءِ حَوَائِجِ الْمُسْلِمِیْنَ

مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

۲۱ / ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۵ / اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

أعوذباللہمن الشّیطان الرّجیم. بسم اللہالرّحمٰن الرّحیم

وَافْعَلُوْاالْخَیْرَلَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

ضرورت کے موقعہ پر کسی کے کام آنا

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا یعنی کسی مسلمان کی ضرورت کے موقعہ پر اس کے کام آنا، چاہے جس طرح بھی ہو، اپنے مال سے، اپنی جان سے یا اپنے عہدہ اور منصب کے ذریعہ سے، کسی کو کہہ کر سفارش کے ذریعہ سے، اپنی زبان سے، اپنے ہاتھ سے، جس طرح بھی کسی مسلمان کی ضرورت آپ پوری کر سکتے ہوں؛ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ دعا کے ذریعہ سے کر سکتے ہو تو اس سے ہی اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابر کے حالات پڑھتے ہیں تو اس سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ حضرات لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے معاملہ میں ان سے جو کچھ سعی ممکن ہو سکتی تھی اس سے دریغ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ دعا جو آخری درجہ ہے کہ اگر کچھ نہیں کر سکتے تھے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیا کرتے تھے، اس پر بھی بڑا وعدہ ہے، بلکہ یہ تو حاجت کے پورا ہونے کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں ایک آیت اور دو روایتیں پیش کی ہیں جو ماضی کے ابواب میں گذر چکی ہیں اور اس سے متعلق جو تفصیلات ہیں وہ بھی مَیں بتلا چکا ہوں، اس لئے ان کا صرف ترجمہ کر دیتا ہوں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تم نیکی اور بھلائی کا کام کرو؛ شاید کہ کامیاب ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سے نیکی اور بھلائی جس طرح بھی ہو سکتی ہو، اس کو انجام دینے میں کوئی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی میں لوگوں کی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کرنا بھی داخل ہے۔

﴿مسلمان مسلمان کا بھائی ہے﴾

۲۴۴. عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَلْمُسْلِمُ أَخُوْ الْمُسْلِمِ، لايَظْلِمُهُ وَلايُسْلِمُهُ، مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً؛ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس کی حق تلفی کرتا ہے اور اس پر ظلم کرتا ہے، اور نہ کسی ظالم کے حوالے کرتا ہے۔ جو آدمی اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مشغول ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کریں گے۔ بس! یہاں تو اسی جملہ کی وجہ سے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں۔ پہلے اس کی تشریح پیش کر چکا ہوں۔

اور جو شخص کسی مسلمان کی کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔ اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی مدد کو متوجہ کرنے کی تدبیریں﴾

۲۴۵.عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال:مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا،نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ،وَمَنْ يَسَّرَ عَلىٰ مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ،وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ،وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ،وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا إِلىٰ الْجَنَّةِ. وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِّنْ بُيُوتِ اللّٰهِ تَعَالىٰ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ،وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا أُنْزِلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ ، وَذَكَرَ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ. وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف کو دور فرمائیں گے۔ویسے دنیا کی تکلیف کے مقابلہ میں قیامت کی تکلیفیں بہت زیادہ ہیں اور بہت بڑی ہیں اور ایسی ہیں کہ ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

شراح نے لکھا ہے کہ پہلے لفظ (كُرْبَةً) میں تنوین تحقیر کے لئے ہے اور دوسرے (كُرْبَةً) میں تعظیم کے لئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے معمولی تکلیف کوئی شخص دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور فرمائیں گے۔

اور جو آدمی کسی تنگ دست کے لئے آسانی کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت کے اندر آسانی فرمادیں گے۔تنگ دست کے لئے آسانی کرنے کا مطلب یہ ہے

کہ اگر کسی آدمی کو آپ نے قرض دے رکھا ہے اور وہ آدمی اپنی تنگ دستی کی وجہ سے قرض کی ادائیگی سے قاصر ہے، اور مزید مہلت طلب کررہا ہے تو اس صورت میں اگر آپ جانتے ہیں کہ وہ تنگ دستی کی وجہ سے اِس وقت قرض ادا نہیں کرسکتا تو آپ کو چاہیے کہ اس کو کچھ مہلت دے دیں، گویا یہ آپ نے اس کے لئے آسانی کردی۔ اور ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کا قرض کم کردیں یا پورا ہی معاف کردیں۔

اور جو شخص کسی کی پردہ پوشی کرے گا اور عیب کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے اندر اس کے عیب کو چھپائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں لگے رہتے ہیں جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ یعنی ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شاملِ حال رہے تو اس کا آسان اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھائی کی مدد میں لگے رہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ہماری شاملِ حال ہوگی۔

﴿دلی سکون کے متلاشی متوجہ ہوں﴾

اور جب کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتی ہے یعنی مسجد میں یا کوئی ایسی جگہ جو خاص تربیت کے لئے یا اللہ کی کتاب کو پڑھانے کے لئے یا نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو سکھلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہاں مسجد کی تخصیص نہیں ہے بلکہ مدرسہ و مکتب بھی اس میں داخل ہے۔ اور وہ قوم جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو سناتی ہے۔ ﴿یَتَدَارَسُوْنَ بَیْنَھُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ایک پڑھتا ہے اور دوسرے سنتے ہیں۔ دوسرا پڑھتا ہے اور پہلے والا سنتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے یعنی ان کے دلوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے طمانینت و سکون کی

کیفیت نازل کی جاتی ہے۔

آج کل عام طور پر لوگ اپنے قلب کی پریشانیوں کی وجہ سے ایسے بے چین ہیں کہ ہر ایک کے اوپر بے چینی اور پریشانی طاری ہے، اور ہر شخص اس بات کا خواہش مند ہے کہ اس کے دل کو سکون وطمانینت حاصل ہو؛ تو اس کا ایک آسان طریقہ یہی بتلایا جاتا ہے۔

﴿وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے ﴿وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو ذکر اللہ کی مجالس، کتاب اللہ کی تلاوت کی مجالس کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، جب ان کو ایسی مجلسیں مل جاتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں کہ آجاؤ! یہی وہ جگہ ہے جس کی تلاش میں تم لوگ پھر رہے ہو، اور پھر وہ چاروں طرف سے اس مجلس کو گھیر لیتے ہیں۔

﴿وَذَكَرَ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ﴾ اور جب یہ لوگ آپس میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس جو ہیں یعنی فرشتوں کے درمیان ان کو یاد فرماتے ہیں۔

﴿عملی کوتاہی کی تلافی نسبی بلندی سے نہیں ہو سکتی﴾

اور جس کو اس کا عمل پیچھے رکھے اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اپنے عمل کی کمی اور کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تو چاہے شرافتِ نسب کی وجہ سے وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو؛ اس کی نسبی شرافت اس کی عملی کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتی۔

بہت سے لوگ اپنی نسبی شرافت کی وجہ سے، علوِّ نسبی کے گھمنڈ کے اندر رہتے ہیں اور عملی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے ایسے لوگوں کو متنبہ کردیا کہ عملی کوتاہی کی تلافی نسبی بلندی سے نہیں ہو سکتی، جس کو اس کا عمل پیچھے رکھے گا؛ نسب کبھی

آگے نہیں بڑھا سکتا۔خود نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صاف طور پر بتلا دیا تھا کہ تمہارا عمل تمہارے ساتھ رہے گا اس لئے تم خود ہی عمل کرلو (مسلم شریف، ۵۲۵) مطلب یہ ہے کہ عمل ہی آدمی کو آگے بڑھا سکتا ہے۔البتہ اگر کسی کے اندر عمل کے ساتھ ساتھ نسبی شرافت بھی موجود ہے تو پھر سبحان اللہ۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ﴾ لوگوں کا حال ایسا ہے جیسے سونے چاندی کی کانیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فطری طور پر کچھ جگہوں پر سونا چاندی پیدا کردیا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کا حال بھی ہے کہ کسی میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے جیسے سونے میں ہوا کرتی ہے، کسی میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے جیسے چاندی میں ہوتی ہے۔سونے چاندی میں رکھی ہوئی یہ صلاحیتیں خود ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت فرمودہ ہیں۔اسی کو آگے فرمایا ﴿خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقُھُوْا (بخاری شریف، ۳۳۵۳)﴾ جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں اپنے خاندان اور نسب کے اعتبار سے بہتر اور اچھے سمجھے جاتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہ بہتر ہی ہیں، بشرطیکہ وہ علمِ دین حاصل کرلیں اور فقیہ بن جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے ﴿فَقُھُوْا﴾ کی قید لگائی، اس سے معلوم ہوا کہ آدمی علمی اور عملی اعتبار سے ترقی کرلے اور پھر اس کو نسبی شرافت اور بلندی بھی حاصل ہے تو نورٌ علیٰ نور ہے، یہ اس کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوتی ہے۔لیکن اگر کوئی آدمی صرف نسبی شرافت کو لے کر بیٹھ جائے اور عملی اعتبار سے کوتاہی سے کام لے؛ تو پھر وہ نسبی شرافت عملی کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتی۔

اَلشَّفَاعَةُ

سفارش کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔أمابعد:-

سفارش کرنے والا برابر کا حصہ دار ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب سفارش کے سلسلہ میں قائم کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ﴿مَن یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا (النسآء)﴾ جو آدمی کسی اچھی بات کے لئے سفارش کرے گا تو اس کے لئے بھی اس کے اندر حصہ ہے یعنی اس کو بھی اس پر اجرو ثواب ملے گا۔کام تو وہ کرے گا جس سے سفارش کی گئی ہے لیکن اس کام کے پورا ہونے میں یہ سفارش کرنے والا بھی ذریعہ بنا؛ اس لئے اس کو بھی ثواب ملے گا۔

سفارش کے سلسلہ میں بھی علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دو روایتیں پیش کرتے ہیں۔

سفارش کی حیثیت

۲۴۶۔عن أبی موسیٰ الأشعری رضی اللہ عنہ قال: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَاأَتَاہُ طَالِبُ حَاجَۃٍ أَقْبَلَ عَلیٰ جُلَسَائِہٖ،فَقَالَ:اِشْفَعُوْاتُؤْجَرُوْا،وَیَقْضِیَ اللّٰہُ عَلیٰ لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَاأَحَبَّ. (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب کوئی حاجت مند آتا تھا تو آپ اپنے پاس مجلس میں روزانہ کے حاضر باش صحابہ سے فرماتے تھے کہ ضرورت مندوں کی سفارش کرواور ثواب پاؤ۔باقی یہ ہے کہ سفارش کے نتیجہ میں اس کا

کام ہو ہی جاوے اور مَیں تمہاری سفارش مان کر اس کا کام کر ہی دوں؛ یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبانِ مبارک سے وہی بات کرواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہے؛ وہی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو وہی کروں گا جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، باقی یہ ہے کہ تم کو سفارش کرنے کا اجر و ثواب ملے گا۔

دیکھو! اس ارشادِ مبارک میں نبی کریم ﷺ نے ایک تو سفارش کرنے کی ترغیب دی اور دوسری بات یہ کہ سفارش کی حیثیت بھی بتلا دی کہ اصل سفارش کیا ہے؟

ہماری غلط فہمی

آج کل ہمارے معاشرے میں سفارش کا مفہوم بہت الگ سمجھ لیا گیا ہے۔ شریعت نے سفارش کو جو حیثیت دی ہے وہ الگ ہے اور ہم نے اپنے معاملات اور لین دین کے اندر سفارش کا درجہ اس سے بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ سفارش کی حقیقت کسی ضرورت مند کی ضرورت کی طرف کسی کو صرف متوجہ کرنا ہے۔ ایک آدمی کسی کی ضرورت پوری کر سکتا ہے اس کو آپ توجہ دلا دیں کہ بھائی! یہ ضرورت مند ہے۔ بس! آپ جو توجہ دلا رہے ہیں اس کا نام سفارش ہے۔ آج کل ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ سفارش کرنا یعنی دوسرے پر دباؤ ڈالنا۔ اسی لئے جب کسی سے سفارش کروانی ہوتی ہے تو پہلے سوچا جاتا ہے کہ اس کے پاس سفارش کروانے کے لئے کون سا آدمی زیادہ مناسب رہے گا۔

حالانکہ حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ سفارش کے اندر یہ ہوتا ہے کہ اس آدمی کو یوں کہہ دیا جائے کہ دیکھو! یہ ضرورت مند ہے، اگر آپ کے نزدیک اس کی ضرورت کو پورا کرنا قرینِ مصلحت ہے اور آپ کے اصول کے خلاف نہیں ہے تو آپ اس کی

ضرورت پوری کر دیجیے۔ یہ سفارش ہے، اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پر اصرار کیا جائے اور اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مجبور ہو جائے؛ اس کا نام سفارش نہیں ہے۔ یہ تو غلط طریقہ ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے سفارش کا جو طریقہ بتلایا وہ یہی ہے کہ اللہ کا ایک بندہ حاجت مند ہے، اس کی حاجت کو پورا کرنے میں آپ بھی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے شریک ہو رہے ہیں اور جس کے ذریعہ سے اس کی حاجت پوری ہو سکتی ہے اس کو آپ متوجہ کر رہے ہیں۔

سفارش کے متعلق پہلا اُصول

اب سفارش میں پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ یہ کام جس میں آپ سفارش کرنا چاہتے ہیں وہ کام جائز بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اگر ایسی جگہ ہے کہ جہاں سفارش کرنا جائز ہی نہ ہو اور آپ سفارش کریں تو ایسی سفارش کرنے سے تو آپ خود گنہ گار ہوں گے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ کی عادت یہ تھی کہ ضرورت کے موقعہ پر لوگوں سے چیزیں مانگ کر بعد میں مُکر جایا کرتی تھی اور انکار کر دیتی تھی اور کبھی کبھی چوری بھی کر لیتی تھی۔ فتح مکہ کے موقعہ پر چوری کی تو وہ پکڑی گئی، گواہوں سے چوری کا ثبوت بھی ہو گیا۔ اب ان کا تعلق قریش کے قبیلہ مخزوم سے تھا اور یہ قبیلہ بڑا معزز سمجھا جاتا تھا ابو جہل بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، جب چوری کا ثبوت ہو گیا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، سب لوگ بے چین اور پریشان ہو گئے کہ ایسے بڑے قبیلے کے ایک فرد کا ہاتھ جب کٹے گا تو قبیلے کی ناک کٹ جائے گی، لہٰذا انہوں نے سوچا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں سفارش کی جانی چاہیے تا کہ یہ معاملہ رُک جائے اور سزا کے طور پر ہاتھ کٹنے کی

نوبت نہ آئے۔اب یہ مرحلہ آیا کہ حضور ﷺ کی خدمت میں سفارش کون کرے؟ لوگوں نے غور وفکر کے بعد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے اور حضور ﷺ کے بڑے لاڈلے تھے ان کے یہ صاحب زادے ہیں اور یہ بھی حضور ﷺ کی نگاہوں میں ویسے ہی لاڈلے تھے۔اسی لئے ان کا لقب حِبُّ رسولِ اللہ ﷺ تھا "نبی کریم ﷺ کے محبوب"۔صحابہ کے درمیان بھی اسی لقب سے پہچانے جاتے تھے۔لوگوں نے سوچا کہ حضور کی خدمت میں سفارش پیش کرنے کے واسطے ان سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے۔چنانچہ سب لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ حضور ﷺ سے درخواست کیجیے کہ ان کا ہاتھ نہ کٹے اور کوئی دوسری سزا ہو جائے تو بہتر ہے۔چنانچہ جب بہت سارے لوگوں نے ان پر دباؤ ڈالا تو یہ حضور ﷺ کی خدمت میں گئے اور سفارش کی؛ تو حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا، آپ بہت غصّے ہوئے۔روایتوں میں آتا ہے کہ آپ اتنے غضبناک ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غضبناک نہیں ہوئے تھے اور فرمانے لگے ﴿یَا أُسَامَةُ ! أَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ؟﴾ اے اسامہ! کیا تم اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزا کے بارے میں سفارش لے کر میرے پاس آئے ہو؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے ایک تقریر فرمائی تاکہ آئندہ ایسی سفارش کی نوبت نہ آئے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے کوئی شریف گھرانے کا آدمی اگر جرم کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی غریب خاندان کا آدمی اگر جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ (أَعَاذَهَا اللّٰہُ مِنْهَا) لَقَطَعْتُ یَدَهَا﴾ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی (أعاذها الله منها) تو

میں اس کا ہاتھ بھی کاٹوں گا (بخاری شریف، ۳۴۷۵) گویا آئندہ کے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک اصول بتلا دیا کہ حدود اللہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں سفارش کی جائے۔ مَیں یہی عرض کرنا چاہتا تھا کہ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ چیز ایسی ہے کہ اس میں سفارش کی جائے۔

فقہاء نے بھی مسئلہ لکھا ہے کہ حدود کے اندر سفارش نہیں ہوا کرتی۔ ایک آدمی اپنے کرتوت کی وجہ سے واجب التعزیر اور واجب الحد ہے، حاکم کے پاس جب معاملہ پہنچ گیا اب وہاں سفارش نہیں ہوسکتی۔ ہاں! وہ معاملہ حاکم کے پاس پہنچنے سے پہلے اندر اندر سیٹنگ ہوجائے کہ وہاں معاملہ مت لے جانا؛ تو وہ بات دوسری ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد سفارش کی گنجائش نہیں رہتی۔

خیر! مَیں تو یہ عرض کرر ہا تھا کہ یہاں ایک ناجائز کام میں سفارش کی گئی تھی جو بالکل درست نہیں تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس پر اتنی زیادہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

ایسی سفارش بالکل درست نہیں ہے

ہمارے معاشرہ میں سفارش کا جو سلسلہ چلتا ہے اس میں بھی پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس چیز میں سفارش کے لئے کہا جار ہا ہے، وہ چیز قابلِ سفارش ہے بھی یا نہیں؟ مثلاً امتحان کے پرچے جانچے جا رہے ہیں اور کسی کو معلوم ہوا کہ ہمارے بیٹے کا پرچہ فلاں صاحب کے پاس ہے، تو اب تلاش کیا جاتا ہے کہ کون کون ان کا قریبی تعلق والا ہے اور پھر ان کے پاس جاتے ہیں، یہ بالکل جائز نہیں ہے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے جس میں سفارش کی جائے۔ اس نے جوابات جیسے لکھے ہیں اس کے مطابق نمبرات کا وہ حقدار ہے، اور اگر کسی کی سفارش کی وجہ سے اس کو زیادہ نمبر دیئے گئے تو دوسروں کا حق مارا گیا۔ اس لئے یہ سفارش بالکل درست

نہیں ہے۔

اسی طرح سے کسی معاملہ کا فیصلہ کسی کے پاس پیش کیا گیا تو وہاں فیصل کے سامنے اس فیصلے سے متعلق جو شہادتیں اور باتیں اور جو معلومات پہنچیں گی، ان ساری چیزوں کو مدِ نظر رکھ کر وہ فیصلہ کرے گا۔ اب وہاں یہ جائز نہیں ہے کہ کسی کی سفارش کی جائے اور کہا جائے کہ ان کا ذرا خیال رکھنا۔

نااہل کے متعلق سفارش مت کیجئے؛ ورنہ......

کسی منصب کے سلسلہ میں سفارش کرنا، مثلاً کسی جگہ کوئی پوسٹ خالی ہے، اور اس پر تقرر کے اختیارات جس کے ہاتھ میں ہیں وہ افسر آپ کی جان پہچان والا ہے، اور کوئی ایسا آدمی آپ کو سفارش کے لئے مجبور کر رہا ہے جس میں اس کی اہلیت نہیں ہے، اور آپ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ اس پوسٹ کا اہل نہیں ہے؛ پھر بھی اگر آپ اس کی سفارش کریں گے اور اس کے نتیجہ میں خدانخواستہ اس کا تقرر ہو گیا؛ تو آئندہ اس سے جتنی بھی غلطیاں اور بے اصولیاں ہوں گی؛ ان سب جرموں میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

دیکھئے! یہ عہدے اور مناصب بھی اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں۔ پہلے امانت کا تذکرہ گزر چکا ہے، اور وہاں میں بتلا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ﴿اِنَّ اللہَ یَـاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰیٓ اَھْلِھَا (النسآء)﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم کرتا ہے کہ تم امانتیں اس کے حقدار کے حوالے کرو۔ اس موقعہ پر لکھا ہے کہ یہ منصب بھی امانت ہے۔ اسی لئے جب حضور اکرم ﷺ سے قیامت کی علامتیں پوچھی گئیں تو آپ نے ایک علامت یہ بھی بتلائی ﴿اِذَا ضُیِّعَتِ الْاَمَانَۃُ﴾ جب امانت ضائع کی جائے، پوچھا گیا ﴿یَـا رَسُوْلَ اللہِ! مَا اِضَاعَتُھَا؟﴾ امانت کے ضائع

کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا﴿اِذَا أُسْنِدَ الْأَمْرُ اِلیٰ غَیْرِ أَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ (سنن کبریٰ، ۲۰۸۶۰)﴾ جب کوئی کام، کوئی عہدہ ومنصب نااہل کے حوالے کیا جائے؛ تو یہ امانت کا ضائع کرنا ہے، اس وقت قیامت کا انتظار کرو۔

﴿سفارش میں جانبین کی رعایت کریں﴾

ہاں! جو آدمی آپ سے سفارش کروا رہا ہے اس میں اس منصب کی پوری صلاحیت موجود ہے، اور آپ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اس عہدے کے لائق ہے؛ تو پھر گنجائش ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے کہہ دیا جائے کہ آپ کے اصول اور ضوابط اور آپ کی مصلحت کے خلاف نہ ہو؛ تو آپ اس کی طرف توجہ فرمائیے۔

آج کل تو معاملہ عجیب ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب میرے پاس آئے، اور ان کو ان الفاظ کے ساتھ سفارش لکھ دی، تو وہ کاغذ لے کر کہتے ہیں کہ یہ کوئی سفارش ہے۔ گویا ان کے نزدیک سفارش یہ ہے کہ یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہی ہے، اگر نہیں کریں گے تو ہمارے اور آپ کے تعلقات آئندہ کے واسطے خراب ہو جائیں گے، اگر آپ ایسا لکھ کر دیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سفارش ہے، حالانکہ یہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ اور جو ایسی سفارش کرتے ہیں وہ بڑا ظلم کرتے ہیں۔

کوئی کہے گا کہ یہ ظلم کیسے ہوا؟ تو مَیں آپ کو ظلم کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ ظلم اس طرح ہوا کہ ایسی طرح سفارش کر کے جو حاجت مند ہے اس کی تو آپ نے رعایت کر رہے ہیں لیکن جس سے سفارش کر رہے ہیں اس کی رعایت نہیں کر رہے ہیں، اس کو اپنا اصول توڑنے پر اور اپنی مصلحت فوت کرنے پر مجبور کر کے اس کا نقصان کر رہے ہیں۔ یہ کیسی بات ہوئی۔

انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آپ ایک کی طرف نظر نہ کریں۔ جس کی سفارش کر رہے ہیں اس کو تو دیکھ رہے ہیں، لیکن جس سے سفارش کر رہے ہیں اس کو نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس دباؤ کی وجہ سے اس کا کتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ آپ یہ تو سوچیے کہ اگر اس کی جگہ پر آپ ہوتے اور آپ کے پاس اس طرح کی سفارش آتی تو آپ پر کتنا دباؤ پڑتا؟ آج تو وہ بیچارہ سوچنے پر مجبور ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر مَیں نے اس کی سفارش قبول نہیں کی اور اس پر دھیان نہیں دیا تو وقت آنے پر یہ بھی بدلہ لیں گے، لہٰذا وہ بے چارہ مارے ڈر کے اور طبیعت کے نہ چاہتے ہوئے بھی سفارش قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی مصلحت کا تقاضہ نہیں ہے اور اس کے اصول کے بھی خلاف ہے؛ پھر بھی بادلِ ناخواستہ سفارش قبول کر رہا ہے۔ اس لئے آپ کے لئے ایسی سفارش کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کا قصہ

دیکھو! سفارش کا طریقہ تو وہ ہے جو آنے والی روایت میں بتلا رہے ہیں، حالانکہ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے کام میں بھی سفارش کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؛ نبی کریم ﷺ نے اس کی ہم کو تعلیم نے دی ہے، اور وہی ہمارے لئے نمونہ ہے۔

۲۴۷۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فِیْ قِصَّۃِ بَرِیْرَۃَ وَزَوْجِھَا. قَالَ: قَالَ لَھَا النَّبِیُّ ﷺ: لَوْ رَاجَعْتِیْہِ؟ قَالَتْ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! تَأْمُرُنِیْ؟ قَالَ: اِنَّمَا أَشْفَعُ. قَالَتْ: لَا حَاجَۃَ لِیْ فِیْہِ.

(رواہ البخاری)

حضرت بریرہ نامی ایک باندی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کیا کرتی تھی۔ دراصل وہ کسی اور خاندان والوں کی باندی تھی اور انہوں نے ان کے ساتھ عقدِ کتابت کر رکھا تھا یعنی اگر وہ کچھ رقم ادا کر دیں تو ہم آزاد کر دیں گے۔ غلام باندیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا

بھی چاہیے۔اب ان کے پاس تو رقم نہیں تھی تو اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں تعاون حاصل کرنے کی غرض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسا کیوں نہ ہو کہ مَیں ہی تمہیں خرید کر آزاد کر دوں۔انہوں نے کہا کہ ایسا سہی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لوگوں سے گفتگو کی تو انہوں نے ایک شرط رکھی، جو ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ بہرحال! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔اب معاملہ یہ تھا کہ یہ جس زمانہ میں باندی تھی اس زمانہ میں ان کے آقا نے ان کا نکاح ایک صحابی سے کر دیا تھا جن کا نام مغیث تھا، وہ بھی غلام تھے۔اور مسئلہ یہ ہے کہ آقا اپنی باندی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف جہاں چاہے کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک ہے۔اب حضرت بریرہ حسین وجمیل تھیں اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ شکل وصورت کے لحاظ سے ان کے درجے کے نہیں تھے، ذرا سیاہ فام بھی تھے، اگرچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں کرتی تھیں لیکن آقا کا اختیار تھا اس لئے اس نے نکاح کرا دیا تھا اور وہ ان کے نکاح میں تھیں، اور اسی نکاح کے دوران بچے بھی پیدا ہوئے تھے، لیکن جب ان کی آزادی ہوگئی تو ان کو اس نکاح کے باقی رکھنے اور نہ رکھنے کا پورا اختیار حاصل ہو گیا، کیونکہ مسئلہ یہی ہے کہ اگر کسی باندی کا نکاح اس کے آقا نے اس کی غلامی کے زمانہ میں کرا دیا ہو، تو جب اس کو آزادی حاصل ہوگی تو اس کو اختیار رہتا ہے کہ آقا نے اس کے باندی پنے میں اس کا جو نکاح کرایا تھا اس کو باقی رکھے، اور چاہے تو فسخ اور ختم کر دے۔ چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جب آزاد ہوئیں تو اپنے اسی اختیار اور پاور کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا کہ مَیں اس نکاح کو فسخ اور ختم کرتی ہوں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿لَکِ بُضْعُکِ فَاخْتَارِیْ﴾ تو انہوں نے کہا ﴿اِخْتَرْتُ

نَفسِی﴾ اس طرح انہوں نے اپنا نکاح کینسل کردیا۔جب ان کے شوہر حضرت مغیث کو معلوم ہوا کہ انہوں نے تو نکاح ختم کردیا ہے،تو وہ بے چین ہوگئے۔ چونکہ حضرت مغیث کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی؛اس لئے ان کی جدائی کی وجہ سے پریشان ہوگئے۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا مدینہ کی گلیوں میں آگے جارہی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت مغیث رضی اللہ عنہ رورہے ہیں،اوران کی داڑھی پر آنسو ہیں اوروہ ان کو منانے کی کوشش کررہے ہیں کہ مجھے منظور کرلو،دوبارہ نکاح کرلواوروہ انکار کررہی ہیں۔

(بخاری شریف،۵۲۸۳)

بہرحال! حضرت مغیث رضی اللہ عنہ نے ان کو منانے کی اپنی سی کوشش کرڈالی،لیکن دیکھا کہ بریرہ کا دل پسیج نہیں رہا ہے اور وہ نہیں مانتی ہیں تو حضرت مغیث رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ان کا حال معلوم ہوچکا تھا۔انہوں نے آکر حضور سے درخواست کی اورعرض کیا: یارسول اللہ! میری سفارش کردیجیے اوراس کو کچھ سمجھائیے۔چنانچہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فرمایا﴿لَوْ رَاجَعْتِیهِ بِأَنَّهٗ أَبُوْأَوْلَادِكِ﴾ اگر تم اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلواوران سے رجوع کرلواوردوبارہ ان کے نکاح میں آجاؤ؛تواچھا ہے،کیونکہ یہ تمہارے بچوں کے باپ ہیں،ان کے نکاح میں رہ کر تمہیں اولاد بھی ہوئی ہے۔

اولاد کی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باوجود حالات اورطبیعت کے نہ چاہنے کے بھی عورت آمادہ ہوجاتی ہے۔تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح ان کو سمجھانا چاہا۔وہ بھی بڑی سمجھ دار عورت تھی،انہوں نے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا﴿یَارَسُوْلَ اللهِ! تَأْمُرُنِیْ؟﴾ کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟یعنی اگرآپ کا حکم ہے تو سرآنکھوں پر،انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا أَشْفَعُ﴾ مَیں حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ صرف سفارش کر رہا ہوں۔تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا ﴿لاحَاجَةَلِيْ فِيْهِ﴾ تب تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے،اور انہوں نے نہیں مانا۔

دیکھئے!حدیثِ پاک کا یہ واقعہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو سفارش کے سلسلہ میں بڑا درس دیتا ہے۔حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت کیا تھی؟ وہ حضور ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ باندی تھیں لیکن ان کی طبیعت اور مصلحت کا تقاضہ یہی تھا اس لئے انہوں نے حضور ﷺ کی سفارش کو قبول نہیں کیا اور حضور ﷺ نے بھی ذرّہ برابر ناگواری اور گرانی کا اظہار نہیں فرمایا۔آپ نے ایسا نہیں کہا کہ واہ بھئی واہ! ہمارے گھر کی باندی تھی،اور آزادی تو ہمارے گھر کے طفیل نصیب ہوئی اور ہم کہہ رہے ہیں پھر بھی ہماری بات کو ٹھکرا رہی ہے،تیری یہ حیثیت کہ میری بات کو ٹھکرائے۔حضور نے ذرہ برابر بھی ناراضگی ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا،اس وقت بھی نہیں اور بعد میں بھی نہیں۔ان کے اور بھی قصے حدیثوں میں موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قصہ کے بعد بھی وہ برابر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔

﴿ایک اہم مسئلہ﴾

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نبی کریم ﷺ گھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کھانے کے واسطے کچھ ہے؟ روٹی وغیرہ پیش ہوئی۔حضور ﷺ نے دیگچی میں گوشت دیکھا تو فرمایا کہ گوشت رکھا ہوا ہے وہ پیش نہیں کیا؟ تو کہا گیا ﴿قَدْ صُدِّقَ عَلٰى بَرِيْرَةَ﴾ بریرہ کو صدقہ میں ملا ہے اور آپ تو صدقہ نوش نہیں فرماتے۔حضور ﷺ نے فرمایا ﴿هِيَ لَهَا صَدَقَةٌ،وَلَنَا هَدِيَّةٌ﴾ یہ ان کے لئے

صدقہ ہے، وہ جب ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ ہو جائے گا (بخاری شریف،۱۴۹۳) یہاں سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ خیر! مَیں یہ عرض کر رہا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے ذرہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ سفارش کے معاملہ میں یہ واقعہ آنے والی امت کے واسطے بہت بڑا معیار ہے۔

﴿سفارش کے معاملہ میں ہونے والی کوتاہیاں﴾

ہمارے معاشرے میں سفارش کی کیا حیثیت ہو گئی ہے، ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ، دین دار، پڑھے لکھے، علماء وصلحاء بلکہ بعض جگہوں پر مشائخ تک کا یہ حال ہے کہ وہ اگر کسی کی سفارش کریں اور اس پر توجہ نہیں دی گئی؛ تو ان کو ناگواری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ معلوم ہونا چاہیے کہ سفارش تو ایک طرح کا مشورہ ہے۔

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد میں بھی فرمایا ﴿اِشْفَعُوْا تُؤْجَرُوْا﴾ سفارش کرو؛ تم کو ثواب ملے گا۔ بس! آدمی تو اسی نیت سے سفارش کرے کہ اللہ کے ایک بندہ کا کام میرے کہنے سے ہو جاتا ہے تو مجھے ثواب ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ہو گا تب بھی سفارش کا ثواب تو ملنے ہی والا ہے، یہ تو کہیں گیا ہی نہیں۔

باقی یہ کہ تم سفارش کرو اور مَیں مان ہی لوں اور اس کا وہ کام کر ہی دوں، یہ میرے لئے ضروری بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے فیصلہ کروالے یعنی چاہے تو اس کا کام ہو جائے، چاہے تو نہ ہو، باقی آپ کا کام یہ ہے کہ سفارش کیجیے۔

سفارش کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آپ نے اس کا معاملہ اوپر تک پیش کر دیا اس لئے کہ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے چارہ اپنے مقام اور اپنی حقیقت کے کم تر ہونے کی وجہ

سے اپنی ضرورت کسی بڑے کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے اور جھجک رہا ہے، اس کی وہاں تک پہنچ نہیں ہے تو آپ اتنا کر رہے ہیں کہ اس کو وہاں پہنچا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ایک کام ہے، اگر آپ کی مصلحت، اصول وضابطہ کے خلاف نہ ہو؛ تو کر دیں؛ ورنہ آپ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر آپ اس فکر میں نہ رہیے کہ اس کا وہ کام ہوا یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا تو آپ دعا کر دیجیے، دوسری کوئی جگہ اس کا یہ کام ہوسکتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ خواہ مخواہ یہ سوچنے لگیں کہ اس نے کیوں نہیں کیا؟

ایک بزرگ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرا یہ کام ہے، فلاں صاحب سے سفارش کر دیجیے۔ ان بزرگ نے کہا کہ وہ تو میرا پکا دشمن ہے، اگر مَیں سفارش کروں گا تو وہ آپ کا کام کرتا ہوگا تب بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کہا کہ آپ تو بس سفارش کر دیجیے، اور بہت اصرار کیا۔ انہوں نے سفارش لکھ دی، وہ لے کر گیا تو اس نے پڑھتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس نے آ کر بتلایا کہ میرا کام تو نہیں کیا لیکن آپ کو بھی بہت برا بھلا کہا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں تو پہلے کہتا تھا، خیر! کوئی بات نہیں، مَیں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کا کام کسی اور جگہ سے کروا دے، اور تمہاری ضرورت پوری ہو جائے۔

بہترین سفارش نامہ

ایک صاحب ایک بزرگ کے پاس آئے کہ فلاں صاحب کے پاس سفارش نامہ لکھ دیجیے۔ انہوں نے اس میں لکھا کہ ان صاحب کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کا کام کر دیجیے، اور کام کرنے والی اصل ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے (وَأَنْتَ الْمَأْجُوْرُ) اور تمہیں ثواب ملے گا۔ اور اگر آپ ان کا کام نہیں کریں گے تو روکنے والی ذات بھی

اللہ تعالیٰ ہی کی ہے (وَأَنْتَ الْمَعْذُوْرُ) اور تم معذور ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں سب چیزوں کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اگر کسی کے دل میں کرنے کے لئے ڈالیں تو وہ کرے گا، تو کرنے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اور روکنے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ لہٰذا آپ اس سے کیوں ناراض ہوتے ہیں، بس! آپ تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کیجیے۔

خلاصۂ کلام

بہرحال! سفارش کی حقیقت صرف اتنی ہی ہے ''کسی کی توجہ کسی کام کی طرف دلانا'' آج کل ہمارے معاشرے میں سفارش کا معاملہ اس کے حدود سے بہت زیادہ تجاوز کر چکا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سفارش کے سلسلہ میں شریعت نے جو حدود و قیود قائم کئے ہیں ان کا لحاظ کیا جائے اور یہ بھی کہ سامنے والے کو اپنے اصول وضوابط کے خلاف یا اپنی مصلحت کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے، آپ کو تو دونوں فریق کو دیکھنا ہے، حاجت مند کو بھی اور جو اس حاجت کو پورا کرنے جا رہا ہے اس کو بھی کہ اس کی بھی مصلحت فوت ہونی نہیں چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ اور توفیق نصیب فرمائے

الاصلاح بین الناس

آپس کے تعلقات درست کرانا

﴿مجلس ۱﴾

۲۸ ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۲/اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

فأعوذباللّٰہمن الشيطان الرجيم بسم اللّٰہالرحمن الرحيم.

لاخَيْرَفِىْ كَثِيْرٍمِّنْ نَجْوَاهُمْ اِلَّامَنْ أَمَرَبِصَدَقَةٍأَوْمَعْرُوْفٍ أَوْاِصْلاحٍ بَيْنَ النَّاسِ. (النساء۱۱۴)

وقال تعالىٰ: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ. (النساء۱۲۸)

وقال تعالىٰ: فَاتَّقُوْااللّٰهَ وَأَصْلِحُوْاذَاتَ بَيْنِكُمْ. (الأنفال ۱)

وقال تعالىٰ: اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌفَأَصْلِحُوْابَيْنَ أَخَوَيْكُمْ. (الحجرات ۱۰)

لوگوں کے تعلقات درست کرانے کی اہمیت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے "اَلاِصْلاحُ بَيْنَ النَّاسِ" لوگوں کے درمیان تعلقات کو درست کرانا یعنی اگر دو مسلمان بھائیوں میں آپس میں تعلقات خراب ہو چکے ہیں اور بگڑ چکے ہیں، اُن کے آپس کے بگاڑ کو درست کرا کے ان کے تعلقات کو استوار کرانا؛ یہ "اِصْلاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ" کہلاتا ہے اور اس باب میں اسی کی اہمیت کو بتلایا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آپس کے تعلقات کی نا استواری و بگاڑ کتنی خطرناک چیز ہے، تو ان تعلقات کو درست کرانے کے لئے کی جانے والی کوشش کی اہمیت بھی معلوم ہو سکتی ہے۔

﴿تعلقات کے بگاڑ پر وعیدیں﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز، روزہ اور صدقہ سے آدمی کبھی وہ بات حاصل نہیں کر پاتا جو اصلاحِ ذات البین سے یعنی آپس کے تعلقات کو درست کرنے سے حاصل کر لیتا ہے، اور پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپس کے تعلقات کے بگاڑ سے اپنے آپ کو بچاؤ ﴿بِأَنَّهَاهِيَ الْحَالِقَةُ﴾ اس لئے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔
(الادب المفرد۔۳۹۱)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے، یعنی آدمی کا دین اس کی وجہ سے برباد اور ختم ہو جاتا ہے (الادب المفرد۔۲۶۰) اس لئے کہ اگر کسی کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ آیا اور کسی دو میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ دونوں ایک دوسرے کے درپئے آزار رہیں گے، ایک دوسرے کی عزت و آبرو ختم کرنے میں اور برائی میں لگے رہیں گے۔

حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بدترین سود کسی مؤمن کی آبروریزی ہے یعنی کسی مؤمن کی عزت کو دھچکا پہنچانا اور اس کو زک پہنچانا، ایسی کوئی حرکت یا معاملہ یا بات کرنا کہ جس سے کسی مؤمن کی عزت پر زد پڑے؛ یہ سب سے بدترین سود ہے۔
(سنن ابی داؤد۔۴۸۷۶)

اور آپس کے تعلقات کے بگاڑ کو دور کرنا اتنا ضروری ہے کہ اگر دو آدمیوں نے آپس میں تین دن سے زیادہ تک گفتگو نہیں کی، اپنے تعلقات کو بگاڑے رکھا اور اس کے بعد ان میں کسی کی موت واقع ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

ایسے ہی روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر پیر اور جمعرات کو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور ان اعمال کو دیکھ کر ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی مغفرت کا فیصلہ ہوتا ہے، مگر ایسے دو آدمی جو آپس میں لڑے جھگڑے ہوں اور آپس میں دونوں کے تعلقات بگڑے ہوئے ہوں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا معاملہ ابھی رہنے دو، یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کرلیں (مسند احمد۔۶۳۹۷) جب تک وہ صلح نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا فیصلہ نہیں ہوگا۔

اور بھی بے شمار روایتیں اس طرح کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس کا جھگڑا، تعلقات کی ناگواری، نااستواری اور بگاڑ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بلکہ جھگڑے کی وجہ سے آدمی ہر طرح کی برکتوں سے بھی محروم ہوجاتا ہے، روحانی نعمتیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حاصل ہوسکتی ہیں ان سے بھی آپس کے جھگڑے کی وجہ سے محرومی ہوتی ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنے حجرۂ شریفہ سے نکلے تاکہ لوگوں کو بتلائیں کہ لیلۃ القدر کب ہے، لیکن آپ نے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مَیں اس لئے باہر آیا تھا لیکن ان کے جھگڑے کی وجہ سے اس کی تعیین اُٹھالی گئی، یعنی کون سی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے اس کا علم آپ کو دیا گیا تھا مگر اس جھگڑے کی وجہ سے ختم کردیا گیا۔ (بخاری شریف۔حدیث نمبر ۴۹)

بہرحال! یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور اسی جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے کسی کی بھی طرف سے جو کوشش کی جائے گی، اسی کو ''اصلاح ذات البین'' یعنی ''آپس کے تعلقات درست کرانا'' کہا جاتا ہے۔

﴿مجلس بازی میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے﴾

حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کے ارشادات نقل کئے ہیں ﴿لا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَجْوَاهُمْ﴾ لوگ آپس میں جو سرگوشیاں کرتے ہیں اور رازدارانہ طریقہ سے جو گفتگو کرتے ہیں، اپنی مجلس میں بیٹھ کر جو باتیں کرتے ہیں، باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب مجلس بازی ہوتی ہے اور باتیں چلتی ہیں تو خیر اور بھلائی کی باتیں تو کم ہی ہوتی ہیں اور گاڑی پٹری سے اتر ہی جاتی ہے اور آدمی دوسروں کی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی مجلس کی گفتگو اور سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہے، البتہ ﴿اِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ﴾ اگر کوئی آدمی کسی کو صدقہ کرنے کا حکم کرے ﴿أَوْ مَعْرُوْفٍ﴾ یا بھلی بات کا حکم کرے ﴿أَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ یا لوگوں کے آپس کے تعلقات کو درست کرنے کے لئے کوئی کوشش کرے، ان تین امور کے لئے مجلسیں منعقد ہوں تو ان میں بھلائی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کے کاموں کے لئے اگر کچھ لوگ بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں تو باعثِ خیر ہے، ورنہ چاہے گناہ کی کوئی بات نہ ہوئی ہو، ویسے ہی لغو باتیں ہوئی ہیں، تب بھی وہ لایعنی میں شمار ہوگا اور وقت ضائع ہوا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

﴿صلح؛ بھلائی کی چیز ہے﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ صلح؛ بھلائی اور خیر کی چیز ہے۔ یہ سورۂ نساء کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس میں میاں بیوی کے تعلقات کے سلسلہ میں کچھ

ہدایتیں دی گئی ہیں اور وہیں یہ بھی بتلایا گیا کہ میاں بیوی اپنے تعلقات کو درست کرنے کے لئے ان میں سے کوئی ایک اگر اپنے حقوق سے درست بردار ہو جائے تا کہ نکاح باقی رہے، اور اس طرح اگر صلح کرنا چاہتے ہیں تو باری تعالی کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔اور آگے اس کے متعلق فرمایا گیا ﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ صلح ہی بھلائی کی چیز ہے۔چاہے صلح کو اپنے کچھ حقوق کو چھوڑ کر ہی کیوں حاصل نہ کرتے ہوں یعنی اس صلح کے واسطے اگر اپنے کچھ حقوق چھوڑنا بھی پڑیں تو باری تعالی فرماتے ہیں کہ وہ بھلائی کی چیز ہے۔

ویسے صلح ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے کچھ مطالبات چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے، ورنہ پھر صلح کیا ہوگی۔جب دونوں کی طرف سے مطالبات ہوا کرتے ہیں اور دونوں فریق اپنے جن مطالبات پر مصر ہوتے ہیں، تو ان میں سے ہر فریق کو اپنے کچھ مطالبات چھوڑنے پڑتے ہیں، تب ہی صلح وجود میں آتی ہے۔باری تعالیٰ کی طرف سے فرمایا گیا کہ اگر اپنے کچھ مطالبات چھوڑ کر بھی صلح حاصل ہوتی ہو؛ تو اس کو حاصل کرنا چاہیے، اس لئے کہ اس میں خیر ہے۔

﴿تعلقات کو خوش گوار بناؤ﴾

اور باری تعالی کا ارشاد نقل کیا ﴿فَاتَّقُوا اللهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات کو خوش گوار بناؤ اور درست کرو۔

سورۂ انفال کی یہ آیت دراصل غزوۂ بدر کے وقت نازل ہوئی تھی، جب غزوۂ بدر کے اندر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو اُبھارنے کے واسطے کچھ انعام مقرر کئے تھے کہ جو اس طرح کرے گا اس کو یہ

انعام دیا جائے گا۔اگر کوئی دشمن کے کسی آدمی کو قتل کرے گا تو اس کا سب سامان اُس قتل کرنے والے کو بطورِ انعام کے دیا جائے گا﴿مَنْ قَتَلَ قَتِيْلاً فَلَهُ سُلُبُهُ (مسند احمد، ۲۲۸۱۴)﴾ تو آپ ﷺ کے ان اعلانات کی وجہ سے نوجوانوں نے خوب آگے بڑھ چڑھ کر دشمنوں کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا، جب مالِ غنیمت آیا تو سب نے اپنے مطالبات رکھے کہ ہم نے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں، ہم کو انعام ملنا چاہیے۔اس موقعہ پر جو بوڑھے تھے انہوں نے کہا کہ میدان کی جو مرکزی جگہ تھی، ہم اس کی حفاظت کرتے رہے، یعنی ہم نے مرکز کو سنبھالے رکھا تب ہی تو آپ لوگوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا، ورنہ اگر ہم اس مرکز کی حفاظت نہ کرتے اور لشکر کے پاؤں اُکھڑ جاتے، تو کسی بہادر کو اپنی بہادری دکھلانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا گویا ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے، اس لئے ہمیں بھی ملنا چاہیے۔دونوں فریق میں آپس میں گفتگو ہوئی۔اس وقت باری تعالیٰ کی طرف سے سورۂ انفال کی کچھ آیتیں جو مالِ غنیمت کے احکام پر مشتمل ہیں نازل ہوئیں اور انہیں آیتوں کے بعد اخیر میں ایک بات فرمائی گئی کہ مالِ غنیمت کی وجہ سے آپس کے تعلقات کو خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿فَاتَّقُوا اللهَ﴾ آپس کے تعلقات کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی وہ بگڑنے نہ پائیں اور ان کو درست کرو۔یہ مال کتنے روز کے واسطے ہے؟ چند دن رہنے والی چیز ہے، یا تو وہ خود آدمی کی موجودگی میں زندگی ہی میں ہاتھ سے نکل جائے گا، یا خود اس کو مال چھوڑ کر جانا پڑے گا، بہرحال باقی رہنے والی چیز نہیں ہے، اس کی وجہ سے اپنے مؤمن بھائیوں کے ساتھ یا حقیقی بھائیوں کے ساتھ یا خاندان کے لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرنا اور آپس کے تعلقات کو بگاڑنا؛ کوئی دانشمندی کی چیز نہیں ہے۔

بلکہ اس پر تو بڑی خوش خبری سنائی گئی ہے کہ ایک آدمی کا حق ہو اور وہ جھگڑا ختم کرنے کے واسطے اپنے حق کو چھوڑ دے، ایسے آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ نے وسطِ جنت یعنی جنت کے بیچ میں جگہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کے لئے بڑے وعدے ہیں۔

بہرحال! یہ ایک چیز ہے جو آج کل بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ عام طور پر میراث کے معاملہ میں ایسا بہت زیادہ ہوتا ہے کہ صاحبِ مال کا انتقال ہوا تو ورثاء میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ ویسے غریب مرتا ہے تو وہاں تو جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ کا احسان ہے اس نے جھگڑے کی چیز چھوڑی ہی نہیں ہے، لیکن جب مالدار کا انتقال ہوتا ہے تو وہ مال و دولت چھوڑ کر جاتا ہے، وہ جھگڑے کی چیز چھوڑ کر گیا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وارثوں میں آپس میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور تعلقات بگڑتے ہیں اور معلوم نہیں پھر اس کا نتیجہ کہاں کہاں تک پہنچتا ہے، اس لئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور آپس کے تعلقات کو ٹھیک رکھو، اس کے بگڑنے کو نوبت نہ آئے۔

مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں

ایک اور آیت ذکر کی جو سورۂ حجرات کی ہے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لئے اگر دو مؤمنوں کے درمیان جھگڑا ہے یا زیادہ آدمیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہے، تو تمام اہلِ ایمان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا وہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ ﴿فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ، چاہے وہ سامنے چل کر آپ کو کہنے آویں یا نہ آویں، آپ کو اگر اس بات کا یقین ہے کہ آپ کے بیچ میں پڑنے سے، اور آپ کی کوشش سے ان کا جھگڑا ختم ہو سکتا ہے؛ تو یہ

سوچ کر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص طور پر اس کا حکم دیا ہے، آپ کو اپنے طور پر کوشش کرنی چاہیے، اللہ کے اس حکم کو بجالانے ہی کی نیت سے آدمی کوشش کرے، اگر کامیابی مل گئی تو اجرو ثواب بھی ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ جھگڑا بھی ختم ہوجائے گا، دونوں طرح فائدہ ہوگا۔ اور اگر کامیابی نہیں بھی ہوئی تب بھی اجروثواب سے خالی نہیں ہے۔

بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے جھگڑے میں کاہے کو پڑیں۔ یہ پڑنے کا سوال نہیں ہے، بلکہ نیک نیتی کے ساتھ ان کے تعلقات درست کرنے کے لئے جو کوشش ہوسکتی ہے، وہ ہر مؤمن کو انجام دینی چاہیے، اس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے خود نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ بھی یہ تھی کہ آپ کو اگر معلوم ہوجاتا کہ کہیں دو آدمیوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں تو آپ اس کو درست کرنے کے لئے کوشش کرتے۔ حضور ﷺ سے بڑھ کر اور کون باعزت ہوسکتا ہے؟ آپ سے اونچا مقام اور کس کا ہے؟ آپ یوں نہیں سوچتے تھے کہ وہ لوگ میرے پاس آئیں گے تو میں سمجھاؤں گا، بلکہ آپ خود تشریف لے جاتے تھے اور ان کے تعلقات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انصاف کے ساتھ صلح کرانا صدقہ ہے

۲۴۸۔ عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: كُلُّ سُلامیٰ مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ، تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَآبَّتِهٖ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا، أَوْتَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خَطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيْطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ. (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر دن

جب سورج طلوع ہوتا ہے اور آپ زندہ سلامت موجود ہیں، اس وجہ سے انسان کے اوپر اپنے ہر جوڑ کی سلامتی کے بدلہ میں شکرانے کے طور پر صدقہ واجب ہے۔

﴿سُلامیٰ﴾ اصل تو انگلیوں کے پوروں کو کہتے ہیں، ویسے ہر جوڑ کا موڑ والا جو حصہ ہوتا ہے؛ یہاں وہی مراد ہے۔ گویا ہر جوڑ کی سلامتی پر شکر ادا کرنا واجب ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ انسان کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب آدمی صبح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو زندگی کا ایک نیا دن سلامتی کے ساتھ عطا فرمایا، اس کے شکرانے میں ہر جوڑ پر ایک صدقہ واجب ہے۔ اور اگر کوئی آدمی چاشت کی دو رکعت نماز پڑھ لے: تو سب شکرانے کی طرف سے کافی ہو جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو دن بھر میں تین سو ساٹھ صدقہ کرے؟ یہ تو بڑا مشکل کام ہو گیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے مفہوم کو بہت عام کر دیا، ہر نیکی کے کام کو حضور ﷺ نے صدقہ میں داخل فرما دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ﴿تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ﴾ آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے ﴿تُصْلِحُ بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ﴾ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہے، تو انصاف کے ساتھ آپ ان کے درمیان میں صلح کرا دیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ صلح کے موقعہ پر انصاف کے تقاضے بھی چھوٹنے نہیں چاہئیں، کسی کا حق ختم ہو جائے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی آپ دونوں فریق کو راضی کر کے، ترغیب دے کر آمادہ کیجیے، اور اس طرح اپنا مطالبہ چھوڑنے پر راضی کر کے صلح ضرور کرائیے، لیکن جب فیصلہ آپ کے حوالے کیا گیا ہو، تو پھر کسی کا حق مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ انصاف کے ساتھ دونوں کے درمیان میں صلح کرائیں یا دونوں کا جھگڑا ختم کرائیں؛ تو پھر یہ صدقہ کے حکم

میں ہے۔بس! یہاں تو اسی لئے لائے کہ نبی کریم ﷺ نے جھگڑا ختم کرانے کو بھی صدقہ کے حکم میں شمار کیا ہے۔

﴿کسی کو سہارا دینا بھی صدقہ ہے﴾

﴿وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَآبَّتِهٖ فَتَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا،أَوْتَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَامَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ﴾ آدمی کی اس کے جانور اور سواری کے سلسلہ میں مدد کرنا۔اس زمانہ میں عام طور پر سواری کے لئے اونٹ یا گھوڑا استعمال کیا جاتا تھا۔اگر جوان آدمی مشاق اور تجربہ کار ہے تو گھوڑا ہو یا اونٹ ہو، آسانی کے ساتھ اس پر سوار ہو سکتا ہے۔لیکن اگر تجربہ کار اور مشاق نہیں ہے یا کمزور اور بوڑھا ہے تو وہ خود آسانی سے سوار نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو سوار کرانے کے لئے سہارا دینا پڑتا ہے،اور اس کی اس زمانہ میں بہت کثرت سے نوبت آتی تھی،اس لئے کہ کوئی بوڑھا سواری لے کر چلا ہو اور کہیں اترنے کی ضرورت پیش آئی یا کہیں چڑھنے کی نوبت آئی تو وہ راستہ چلنے والوں سے درخواست کرتا تھا یا لوگ ہی دیکھ کر مدد کے لئے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔اس پر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی کو اس کی سواری کے جانور پر آپ سوار کرادیں؛ یہ بھی صدقہ ہے،یعنی اس میں بھی آپ کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔حالانکہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا، ذرا سا ہاتھ لگا دیا اور سہارا دے دیا،لیکن اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سواری پر ہے،اور اس کا سامان نیچے گر گیا تو آپ نے اُٹھا کر اس کو دے دیا تاکہ اس کو اترنا نہ پڑے۔یا کوئی آدمی اپنے سر پر یا پیٹھ پر سامان لے کر جارہا ہے یا لے جانا چاہتا ہے اور اس کو سر پر چڑھانے کے لئے دوسرے شخص کی ضرورت پڑی جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ گھاس کاٹنے والے گھاس کاٹ کر گٹھڑ باندھ کر

بیٹھے ہوتے ہیں کہ کوئی آئے اور سر پر چڑھادے تو ہم آگے چلیں، اب آپ گذر رہے ہیں، اور اس نے آپ سے درخواست کی یا درخواست نہیں کی لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ آدمی انتظار میں ہے یا خواہش مند ہے؛ تو آپ بغیر اس کے کہے ہوئے بھی آگے بڑھ کر اس سے کہیں کہ لاؤ ذرا اس کو تمہارے سر پر چڑھا دیتا ہوں، پیٹھ پر لاد دیتا ہوں، اس طرح اگر آپ ذرا سا ہاتھ لگا دیں گے؛ اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔ کتنے چھوٹے چھوٹے نیکی کے کام ہیں جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، اس کی بھی نبی کریم ﷺ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے

﴿مختلف کام جو صدقہ کا ثواب دلاتے ہیں﴾

﴿وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ﴾ کسی کو آپ بھلی بات کہہ دیں تو یہ بھی صدقہ ہے۔

﴿وَبِكُلِّ خَطْوَةٍ تَمْشِيهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ﴾ اور ہر قدم جو آپ نماز کے واسطے مسجد کی طرف چل کے جاویں یعنی آپ گھر سے مسجد آنے کے لئے چلے تو آپ کو ہر قدم پر صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿وَتُمِيطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ﴾ اور راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا بھی صدقہ کا حکم رکھتا ہے۔ ویسے راستہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنے پر جہاں صدقہ کا ثواب ملتا ہے وہاں اس کی بڑی اہمیت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ﴿اَلْاِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، أَعْلَاهَا كَلِمَةُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ﴾ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ساٹھ سے کچھ اوپر شعبہ ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ شاخ اور اعلیٰ قسم کلمۂ طیبہ ''لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' ہے اور سب سے ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا ہے۔

راستہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی مختلف صورتیں

ویسے ہی نادانستہ طور پر کوئی چیز گرگئی ہو، یا کسی نے جان بوجھ کرڈال دی ہواور آپ ہٹا دیں؛ تواس کوایمان کی ایک شاخ قرار دیا گیاہے۔لیکن اگرہم ہی لوگوں کی تکلیف کا باعث بن جائیں، جیسے راستہ میں سکوٹرکھڑا کردیا، موٹرسائیکل کھڑی کردی، جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کاراستہ رُکا ہواہے، راستہ میں سائیکل لے کرکھڑے ہوگئے اور پیچھے سے ٹرافک رُکی ہوئی ہے اورآپ اطمینان سے باتیں کررہے ہیں اورکوئی پرواہ نہیں کررہے ہیں؛ یہ بھی تکلیف پہنچاناہے جوگناہ کا کام ہے۔

یا مثلاً محلّہ میں کھیل رہے رہیں اورآنے جانے والے خطرہ محسوس کرتے ہیں، اور کبھی بچوں کوکہا جاتاہے کہ ذرا ہٹ جاؤ، تو داداگیری سے جواب دیں گے کہ یہاں سے چلے جاؤ، راستہ تو کھلا ہواہے۔ارے ہاں! راستہ کھلا ہواہے لیکن چونکہ تو گیند ڈال رہاہے اس لئے جانے والاخطرہ محسوس کرتاہے کہ کہیں مجھے لگ نہ جائے، اس کی وجہ سے بیچارہ ڈرا سہا ہواہے

آپ پہلے روایت سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مجمع میں سے کھلے ہوئے تیر ہاتھ میں رکھ کرگذرنے کی بھی نبی کریم ﷺ نے اجازت نہیں دی۔وہ اسی لئے تاکہ اس طرح کھلے ہوئے تیر لے کرگذرے گا تواگرچہ کسی کو مارنہیں رہاہے، لیکن اس کوکھلا ہوادیکھ کرمجمع کی بھیڑ کی وجہ سے شاید کسی کوخطرہ محسوس ہوکہ کہیں مجھے لگ نہ جائے؛ تواس پربھی نبی کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔اورایک آدمی کوتوسختی سے منع کیا اورٹوکا۔توپھردانستہ طور پراس طرح کرنے کی کیسے اجازت ہوگی۔

﴿اپنا کام دوسرا کردے؛ تو اس کا شکریہ ادا کرو﴾

یا مثلاً کسی کے سونے کا وقت ہے، دوپہر کے دو بجے ہیں جو عام طور پر قیلولہ کا وقت ہوتا ہے، رات کے گیارہ بجے ہیں جو سونے کا ہی وقت ہے، اس موقعہ پر کھیل رہے ہیں، بچے تو بچے ہی ہیں، اب تو بڑوں نے بھی کھیلنا شروع کردیا ہے۔ اور اگر بچوں کو تنبیہ کرتے ہیں تو بڑے لوگ ان کی حمایت کرنے سامنے آجاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو تو شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اگرچہ میں تو اس قابل نہیں رہا کہ اپنے بچے کو تنبیہ کرسکوں، اور اس کی اصلاح کی مجھ میں تو طاقت رہی نہیں تھی، لیکن آپ کی بڑی مہربانی ہوئی کہ آپ نے اس کو کہہ دیا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ اس کو تو ایسا کہنا چاہیے۔

اس لئے کہ ذمہ داری تو ان کی اپنی تھی ﴿یَآ أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَکُمْ وَأَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو، اپنے ماتحتوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، برائی کے کاموں سے روکو۔ اور حدیثِ پاک میں ہے ﴿کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ﴾ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک کو اپنے ماتحت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ہماری اولاد جو ہماری ماتحت ہیں ان کی طرف سے کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو ہماری اخلاقی ذمہ داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خود ان کو متنبہ کریں یعنی ہم مقدور بھر ایسی کوشش کریں کہ وہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے۔ ہماری پوری کوشش کے بعد بھی وہ نہ مانے؛ تو بات دوسری ہے۔

لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ خود تو کہنے سے رہے، خود میں تو اتنی طاقت اور ہمت رہی نہیں، بلکہ اب تو باپ بیٹے سے ڈرتا ہے جیسے میاں صاحب بیوی سے ڈرتے ہیں، یہ عام ہوگیا ہے۔ اب تو اگر باپ سے کہو کہ اپنے بیٹے کو تنبیہ کرو تو وہ تیار نہیں ہوتا، جیسے استاذ بھی

شاگردوں سے ڈر رہے ہیں کہ تنبیہ کر دی تو کہیں ہماری پٹائی نہ ہو جائے۔ایک دو روز پہلے اخبار میں دیکھا کہ اسکول کے استاذ نے ایک بچہ کو کسی اخلاقی بات پر تنبیہ کی، شام کو جب وہ جارہے تھے تو جس کو تنبیہ کی گئی تھی اس نے ماسٹر صاحب کی پٹائی کر دی۔ایسا زمانہ آ ہی گیا ہے، اس لئے اگر وہ ڈرتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

زمانہ میں کیسا تغیر آ گیا ہے؟

بہرحال! آپ ڈرتے ہیں اور آپ کہنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم سے کم اللہ کے جو بندے باہمت ہیں اور کہہ رہے ہیں، آپ ان کو کیوں روک رہے ہیں۔آپ کو تو چپکے سے ان کی خدمت میں مٹھائی بھیجنی چاہیے کہ آپ کا شکریہ اور مہربانی ہوئی کہ آپ نے اس کو تنبیہ کی اور آپ آئندہ بھی اس کو تنبیہ کرتے رہیے، اور مناسب طریقہ سے اس کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیے، مَیں آپ کا ممنون ہوؤں گا، آپ کا احسان ہوگا اور دعائیں بھی دیتا رہوں گا اور ہدیے بھی دیتا رہوں گا۔

آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے آپ بچے کی حمایت میں لڑائی کے واسطے کھل کر میدان میں نکل آتے ہیں کہ ہمارے بچے کو کیوں کہا۔وہ سامنے والا کہتا ہے کہ آپ کے بچے کو ہم نے مارا پیٹا نہیں ہے، صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ابھی مت کھیلو۔تو کہتے ہیں کہ کیا محلّہ تمہارے اکیلے کا ہے؟ محلے میں ہمارا بھی حق ہے، ہمارا بچہ کھیلے گا۔پھر بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا برابر کھیلو اور بارہ بجے تک کھیلو۔دیکھئے! زمانہ میں کیا تغیر آ گیا ہے کہ نہ تو خود کچھ کہنے کے لئے تیار ہیں اور جب دوسرے اصلاح کے لئے کوشش کرتے ہیں تو اس کو برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ جب ہمارے

معاشرے اور سماج کا یہی حال ہوگا تو پھر تربیت کیسے ہوگی؟ اور آگے سماج دن بدن انحطاط پذیر ہوکر ایسی حالت پر پہنچ جائے گا کہ پھر وہ اصلاح کے قابل ہی نہیں رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اصلاح کے لئے دوسری شکلیں پیدا کریں گے تو وہ برداشت نہیں ہوگی۔

معاشقہ والے نکاح کا آپریشن

جیسے آج کل معاشقہ کے قصوں میں ہو رہا ہے جو ہم سب دیکھتے اور سب سنتے رہتے ہیں۔ کہ شروع میں نہ باپ روکتا ہے، نہ ماں روکتی ہے، نہ دوسرے روکتے ہیں، اور جب اندر کی بات اندر نہیں رہی اور باہر والوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو جو مسلط کیا تو اب پوری قوم بھگتتی ہے۔

دیکھو! ایک بات یاد رہے، کوئی لڑکی اپنے طور پر اسلام کی حقانیت اور اسلام کی خوبیوں سے متأثر ہوکر اسلام لائی اور اس کے بعد اس کے ساتھ کسی نے نکاح کا معاملہ کرلیا، تو یہ دوسری چیز ہے۔ لیکن یہاں تو پہلے معاشقہ ہوا اور اب لڑکی دیکھ رہی ہے اور لڑکا بھی دیکھ رہا ہے کہ مَیں اس کو اپنے ساتھ رکھوں اس کے لئے میرے گھر والے یا میرا سماج اور برادری تیار نہیں ہے جب تک کہ یہ اسلام نہیں لائے گی، تو اب وہ دونوں محض اپنا کام نکالنے کے لئے یہ طے کرتے ہیں کہ اچھا! تو کلمہ پڑھ لے۔

چلئے! اس نے کلمہ پڑھ لیا تو ہم انکار نہیں کرتے، ہم اس کے اندر کی نیت پر شبہ نہیں کرتے، لیکن آپ کو تو اپنے کے سماج کی بچیوں کے متعلق بھی یہ تاکید کی گئی تھی کہ اگر آپ شادی کے لئے خواہش رکھتے ہیں تو ایسی بچی تلاش کیجیے جس کے اندر دین داری ہو، اور پیدائشی دین دار گھرانے کی بچی ہونا بھی کافی نہیں تھا، اس لئے کہ اسلامی گھرانوں میں پیدا

ہو کر بھی وہ بے دین ہو سکتی ہیں، لہٰذا اگر اس میں بے دینی ہے تو ایسی بچیوں کو بھی نکاح کے لئے اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، بلکہ یوں کہا کہ ان میں بھی دین داری کو دیکھنا چاہیے۔ تو پھر آج جس نے صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا ہے اور اس کو کسی چیز سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اور نہ آپ کو واسطہ ہے (جو کلمہ پڑھا رہے ہیں ان سے کہہ رہا ہوں، آپ لوگ بُرا نہ مانیں) اب ایسی عورت سے آپ نکاح کریں گے اور اس کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوگی؛ ان کی تربیت کون کرے گا؟

ہمارے سامنے ایسے بے شمار واقعات آئے کہ نکاح کے بعد بھی وہ عورت اپنے گھر میں باقاعدہ ہندوانہ طرز پر ہی رہتی ہے۔ اس لئے کہ اب تو اس کا گھر وہی ہو گیا جو اس کے شوہر کا ہے۔ اسی گھر میں طاقچہ میں مورتی اور فوٹو رکھ کر اس کی پوجا کر رہی ہے اور شوہر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، لیکن ایک مرتبہ سماج کو بتلا دیا کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا ہے، اس لئے اب اس کو کوئی فکر نہیں ہے، اس لئے کہ اب سماج میں بھی کوئی کہنے والا نہیں ہے، نہ اس کو کوئی تنبیہ کرنے کے واسطے آئے گا کہ تم نے غیر مسلم کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ اور اگر کوئی کہے گا تو یہ جواب میں کہے گا کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا ہے، فلاں صاحب کو پوچھو، فلاں تاریخ کو فلاں مولوی صاحب کے سامنے اسلام قبول کیا تھا، اور یہ سرٹیفکٹ بھی موجود ہے۔ لیکن اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے سرٹیفکٹ پیش کرنے سے اس کی زندگی تو سدھرنے والی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان چیزوں کی طرف توجہ کی جائے۔ آج کل اس بارے میں بہت غفلت برتی جا رہی ہے۔

﴿صحیح تربیت نہ ہونے کا اثر﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں باقاعدہ ایک حکم جاری کیا تھا۔قرآن نے اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ (یعنی یہود اور نصاریٰ جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے سچے یہودی اور نصرانی ہیں) نکاح کرنے کی اجازت دی ہے،یعنی حلال قرار دیا ہے۔لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں باقاعدہ سرکاری فرمان جاری کیا تھا کہ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے،اس لئے کہ اس کا اثر بچوں پر پڑے گا،اور یہ ان کی تربیت کا معاملہ ہے۔ (احکام القرآن للجصاص الرازی۔۲/۳۲۴)

بلکہ میں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کا اثر صرف آپ کے بچوں پر ہی نہیں بلکہ آپ کے پورے گھرانے پر پڑے گا۔اس سے صرف آپ کے آنے والے بچے ہی نہیں، بلکہ آپ کی گھر کی عورتیں اور آپ کا خاندان اور آپ کا سماج پورا متأثر ہوگا۔ہمارے سماج میں شادی کے اور موت میت کے اور دوسرے مواقع کے ہندوانہ رسم و رواج جو چلے آرہے ہیں اور ہمارے یہاں ہورہے ہیں، یہ سب دراصل اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ جولوگ وہاں سے آئے تھے،ان کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تھی،اسلام کا کلمہ پڑھنے کے بعد بھی اسی ڈگر اور اسی راستہ پر چلتے رہے،تو آج ان کے طریقوں کو بھی دین کی شکل دے دی گئی،اور پھر آج کوئی کہتا بھی ہے تو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی چیزوں کی طرف ہمیں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

﴿پردے کا مسئلہ کتنا اہم ہے﴾

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا چاہیے،اس کو

بھی صدقہ شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی ہمارے سننے والوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ محلے میں آدھی رات کو کرکٹ کھیلتے ہیں اور گیند ہمارے گھر کی کھڑکی پر لگتی ہے، کھڑکی کے شیشے بھی ٹوٹتے ہیں اور اگر گیند گھر میں آجائے تو بڑے دھڑلّے سے بغیر پوچھے ہوئے گھر میں گھس جاتے ہیں، اور اگر کوئی روکتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہماری گیند اندر آگئی ہے، وہ لینے آئیں ہیں۔ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے اجازت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

پردے کا مسئلہ کتنا اہم ہے، یہ بھی ذرا دیکھئے۔ فقہ کی کتابوں میں ایک مسئلہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کے پڑوس میں دوسرے کا مکان ہے اور اس کا شہتوت کا درخت ہے، اب اگر وہ اس درخت پر شہتوت کے پھل توڑنے کے لئے چڑھتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اوپر چڑھنے سے پہلے پڑوس میں اطلاع کرے اور خبر بھیجے کہ ہم شہتوت کے درخت پر پھل توڑنے کے لئے چڑھ رہے ہیں، آپ کے گھر والوں سے پردہ کرالیجیو، تا کہ کہیں نادانستہ طور پر اور بے خبری میں بے پردگی نہ ہو جائے۔

یہ آدمی اپنے گھر میں، اپنے باڑے میں، اپنے درخت پر چڑھ رہا ہے لیکن چونکہ اس کے چڑھنے کی وجہ سے پڑوس میں بے پردگی ہو سکتی ہے، اس لئے اطلاع دینا ضروری ہے۔ اگر وہ بغیر اطلاع کے چڑھے تو پڑوسی اس کو متنبہ کرے گا۔ ابھی یہ مسئلہ ہی چل رہا ہے، میں مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بتلا رہا ہوں کہ بغیر اطلاع کے چڑھ گیا اور بے پردگی ہوئی تو ایک مرتبہ پڑوسی اس کو وارننگ دے گا کہ آپ غلط کر رہے ہیں، آئندہ اگر آپ کو اپنے درخت کے پھل توڑنے کے لئے چڑھنا پڑے تو پہلے سے اطلاع دیجیو تا کہ ہمارے گھر میں بے پردگی نہ ہو،

اگر دوسری مرتبہ بھی وہ نہیں مانتا تو پڑوسی کو حق ہے کہ حاکم کے سامنے یہ بات پیش کرے اور حاکم اس کا درخت کاٹ دے، کہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ جھگڑا ہی نہیں چاہیے۔ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے، اور بھی بہت سارے مسئلے ہیں۔

غور کیجئے! یہاں اپنے گھر میں اپنے درخت پر اپنے کام سے چڑھ رہا ہے، کسی دوسرے کے گھر میں داخل بھی نہیں ہوا، پھر بھی یہ احتیاط کروائی جا رہی ہے، لیکن ہمارے یہاں بچے جو معاملہ کرتے ہیں ان کے بارے میں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کھیل کی اجازت کب ہے؟

اور پھر کھیلنے والے ایسا شور مچاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ! صرف یہی محلّہ ہی نہیں جس میں کھیل رہے ہیں، اس لئے کہ یہاں کے رہنے والے تو بے چارے تنگ ہیں ہی، دوسرے محلے والے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور مَیں پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تو سونے کے اوقات میں زور سے اس طرح ذکر کرنے کی اور قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا جس سے کسی دوسرے کی نیند خراب ہوتی ہو۔ اور یہ بھی بتلا چکا ہوں کہ خود نبی کریم ﷺ رات کو جب گھر میں تشریف لاتے تھے، تو ایسی آواز سے سلام کرتے تھے کہ اگر کوئی سویا ہوا ہو تو اس کی نیند خراب نہ ہو، اور جو بیدار ہو وہ سن لے۔ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے۔ اسلام نے تو یہ تعلیم دی ہے اور لوگوں کو تکلیفوں سے بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ اور اب جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان کا اسلام سے کہاں میل کھاتا ہے؟ اور پہلی بات تو یہ ہے کہ رات کا وقت یہ کون سا کھیل کا وقت ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اب تو یہ کھیل کھیل رہا ہی نہیں ہے، مقصدِ زندگی بن گیا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اسلام نے تو

صرف انہیں کھیلوں کی اجازت دی ہے جس میں ورزش کا پہلو موجود ہو، اور وہ کھیل بھی اپنے حدود میں رہ کر ہوں؛ تب تک ہی اجازت ہے۔

﴿عمدہ مثالیں﴾

بھائی! زندگی کی حفاظت کے لئے کھانا کھانا اچھی چیز ہے، اس سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن آپ صبح بھی کھا رہے ہیں، آٹھ بجے بھی کھا رہے ہیں، نو بجے بھی کھا رہے ہیں، دس بجے بھی کھا رہے ہیں، بارہ بجے بھی کھا رہے ہیں، چار بجے بھی کھا رہے ہیں، رات کو بھی کھا رہے ہیں، آدھی رات کو بھی کھا رہے ہیں؛ تو نتیجہ کیا ہوگا؟ موت آئے گی۔ تو کیسی ہی اچھے سے اچھی چیز ہو، اس کے لئے بھی اوقات رکھے گئے ہیں۔

نماز سے اچھی چیز اور کون سی ہوسکتی ہے؟ لیکن اسلام نے تین اوقات ایسے بتلائے ہیں کہ ان میں نماز پڑھی ہی نہیں جاسکتی۔ پہلا جب سورج طلوع ہورہا ہو، دوسرا جب سورج بالکل سر پر ہو اور تیسرا جب سورج غروب ہورہا ہو؛ ان تینوں اوقات میں فرض اور نفل کسی بھی طرح کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور دو وقت ایسے ہیں کہ ان میں نفل پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، فجر کے بعد اور عصر کے بعد۔ آخر یہ مسئلے کاہے کو رکھے ہیں؟ علماء نے لکھا ہے کہ ان مسائل اور ان تعلیمات کے ذریعہ یہی بتلایا جاتا ہے کہ مؤمن کی شان تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو عبادت سمجھے۔ نماز اپنی ذات کے اعتبار سے عبادت نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول کے فرمان کو پورا کررہے ہیں اس لئے عبادت ہے۔ اگر بے وقت پڑھ رہے ہیں تو پھر یہ نماز بھی عبادت نہیں ہے، اس پر ثواب نہیں ملے گا بلکہ گناہ ہوگا۔

روزہ عبادت ہے لیکن عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، اس دن اگر کوئی روزہ رکھے

گا تو گنہ گار ہوگا۔تو عبادت کے کاموں کے لئے بھی شریعت نے ایسے اوقات بتلائے کہ ان میں نہیں کئے جاسکتے ہیں۔اور ہمارا کھیل ماشاء اللہ ایسا ہے کہ کسی بھی وقت کھیل لو، چار بجے کھیل لو، رات کے وقت کھیل لو؛ ہم اس میں کوئی حرج ہی نہیں سمجھتے۔

ایسے لوگوں سے بھی کبھی کبھی راحت پہنچ جاتی ہے

اسی سال رمضان کے بعد لکھنؤ وغیرہ کا سفر ہوا تھا۔تو ہمارے ساتھیوں کو معالجہ کے لئے بریلی کے حکیم صاحب کو دکھلانا تھا۔میں نے کہا کہ میں تو مراد آباد کا ٹکٹ لے کر مراد آباد اُتر جاتا ہوں، آپ لوگ بریلی سے نمٹ کر فلاں ٹرین میں دہلی کے لئے سوار ہوجانا، جب بریلی سے ٹرین چلتی ہے تو دہلی جانے والی ٹرین مراد آباد ہوکر ہی گذرتی ہے، مَیں مراد آباد سے بیٹھ جاؤں گا، میری نیت یہ تھی کہ مراد آباد میں حضرت مولانا رشید الدین صاحب دامت برکاتہم (رحمہ اللہ) اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوجائے گی اور میرا بریلی میں کوئی کام بھی نہیں تھا۔ میں نے ان ساتھیوں کو حکیم صاحب کا پتہ بتلا دیا تھا۔اب اتفاق کی بات کہ وہ ٹرین مراد آباد رات میں تین بجے پہنچتی تھی، رات میں تین بجے رکشہ لے کر مدرسہ پہنچا تو میرے لئے یہ آسانی ہوگئی کہ وہاں رات کے تین بجے مسلمان بچے کرکٹ کھیل رہے تھے، انہوں نے ہی دروازہ ٹھوک کر مدرسہ کا دروازہ کھلوایا اور میں آسانی سے پہنچ گیا۔اس پر میں نے کہا کہ چلئے! ایسے لوگوں سے بھی کبھی کبھی راحت پہنچ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ان ہی خدمات کو قبول کرلے، اور نجات کا ذریعہ بنادے۔اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نیکی کی توفیق دے دے اور قبول فرمالے؛ لیکن یہ چیزیں بہت ڈرنے کی ہیں۔

﴿اُلٹی گنگا﴾

ہمارے سماج میں یہ طریقے چل رہے ہیں جو بڑے خطرناک ہیں،شریعت ان کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے بڑے موجود ہوتے ہیں،اگر بڑے ان چھوٹوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں،تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ خود چاہے اصلاح نہ کر سکتے ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ دوسرے ایسے بندے ضرور پیدا کر دیتا ہے جو ان کی اصلاح کریں اور ان کو تنبیہ بھی کریں۔لیکن ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ نہ تو خود اصلاح اور تنبیہ کرتے ہیں، نہ دوسروں کو اصلاح کا موقعہ دیتے ہیں اور نہ تنبیہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، بلکہ اُلٹا ان کی حمایت کرتے ہیں؛ یہ تو غلط حمایت ہوگئی جس کو عصبیت کہتے ہیں اور اسلام میں عصبیت پر بڑی بڑی وعیدیں آئی ہیں۔

عصبیت کا مطلب کیا ہے؟ فلاں میری پارٹی کا ہے،فلاں میرے خاندان کا ہے، فلاں میرا بھائی ہے۔چاہے ناحق ہی ہو لیکن میرا بھائی ہے اس لئے مَیں اس کا ساتھ دوں گا۔ اگر کسی کا ساتھ آپ اس کے حق ہونے پر دیں تو اسلام اس کی تاکید کرتا ہے۔اسلام میں رشتہ داری اصل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اصل ہے،اسلام تو حق اور باطل کو دیکھتا ہے،لیکن ہمارے یہاں یہ نظریہ ہو گیا کہ وہ کتنا ہی غلط ہو،لیکن ہمارا بھائی ہے، ہمارے خاندان کا آدمی ہے، ہماری برادری کا ہے، ہمارے محلے کا ہے، ہماری بستی کا ہے؛ اس لئے ہم اس کا ساتھ دیں گے۔

﴿عصبیت کو ابھارنے کا شیطان کا عجیب انداز﴾

جیسی جگہ ہوتی ہے ویسی عصبیت بڑھتی ہے۔ہم لوگ جب دیوبند میں پڑھتے تھے

تو گجراتی سب ایک کہلاویں، اس لئے کہ وہ دوسرے صوبے میں ہیں؛ تو یہاں صوبائیت والی عصبیت آئی۔ وہاں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کہاں کا ہے، احمد آباد کا ہے، سورت کا ہے، بھروچ کا ہے، بلکہ وہاں گجراتی سب ایک ہیں اس لئے مل جل کر برابر اچھی طرح رہتے ہیں۔ اور وہی لوگ جب گجرات میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سورتی، یہ بھروچی، یہ احمد آبادی ہے، اب یہاں سورتی سب ایک ہیں۔ اور پھر جب وہی لوگ اپنے یہاں آئیں گے تو کہتے ہیں کہ یہ راندیر کا ہے اور یہ سگرام پورہ کا ہے۔ پھر جب محلے میں آئیں گے تو یہ منیار والوں کا ہے اور داداوالوں کا ہے اور یہ چوکسی والوں کا ہے۔ عصبیت کو اُبھارنے کا شیطان نے عجیب انداز پیدا کر رکھا ہے۔ باہر کے ملکوں میں دیکھا کہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہے ہیں یا کسی اور جگہ گئے تو وہاں ہندوستانی سب ایک ہیں، چاہے یوپی کا ہو یا گجرات کا ہو۔ اپنے یہاں سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات کرواتے ہیں کہ ہمارے یہ ساتھی ہندوستان میں فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔

عصبیت کمزوری کو چھپانے کے لئے آتی ہے

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ عصبیت دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کے واسطے آتی ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ جب کسی معاملہ میں دو آدمیوں میں صلاحیت کا مقابلہ ہوتا ہے، جیسے کوئی منصب ہے، یا کوئی چیز ایسی ہے جو صلاحیت کی بنیاد پر کسی کو دینا چاہیے، تو اب دونوں میں سے ایک نے دیکھا کہ مَیں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہوں، تو پھر وہ عصبیت کو چھیڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو! یہ فلاں محلے کا ہے، فلاں بستی کا ہے، فلاں جگہ کا ہے، یہ یوپی والا ہے، مَیں گجراتی ہوں، اور آپ بھی گجراتی ہیں، لہٰذا مجھے دیدو تو برابر رہے گا۔

یوپی والے کوکاہے کودیتے ہو۔میرے اندرصلاحیت نہیں تھی،تومیں نے اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ بہانہ پیش کیا۔دراصل یہ شیطانی حربے ہیں،حالانکہ اسلام توصلاحیتوں کودیکھتاہے۔

﴿بدبودارنعرہ﴾

مَیں یہ عرض کررہاتھاکہ اسلام بے جاحمایت کی اجازت نہیں دیتا۔شاید پہلے بھی قصہ آچکاہے اورمَیں بتلاچکاہوں۔غزوۂ بنوالمصطلق کے موقعہ پرایک مرتبہ راستہ میں پانی نہیں تھا،جب بارش ہوئی تو چھوٹے چھوٹے گھڑے سب بھرگئے۔اب جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں لوگ گھڑوں پرقبضہ کرلیتے ہیں۔اسی طرح وہاں گھڑوں پرانہوں نے قبضہ کرلیا،کسی نے اس پراپنا چمڑاڈال دیا،کسی نے ڈھال ڈال دی۔ایک انصاری نے ایک مہاجری کے روکے ہوئے گھڑے میں جوپانی تھاوہ اپنے جانوروں کوپلاناچاہا،توانہوں نے روکا،اسی میں دونوں کی ذراتوُتوُمَیں مَیں ہوئی توایک نے دوسرے کومار دیا،اس نے کہا﴿یَالَلْمُهَاجِرِیْنَ﴾ اے مہاجرین کی جماعت!مدد کے واسطے آؤ۔دوسرے نے کہا﴿یَالَلْأَنْصَار﴾ اے انصار کی جماعت!میری مدد کے واسطے آؤ،حضوراکرم ﷺ کے گوشِ مبارک میں یہ آواز پہنچی توآپ نے فرمایا﴿مَابَالَ دَعْوَی الْجَاهِلِیَّةِ،اُتْرُكُوْهَا؛فَاِنَّهَامُنْتِنَةٌ﴾ کیابات ہے کہ مَیں جاہلیت کی پکاراورجاہلیت کانعرہ سن رہاہوں یعنی قبیلے اورخاندان یابستی کی بنیادپرکسی کواپنی مدد کی دعوت دینے کوجاہلیت کاطریقہ بتلایا۔اورحضور ﷺ نے فرمایاکہ اس سب کوچھوڑو؛یہ بدبودارچیزیں ہیں(الروض الانف)حضور ﷺ نے اس کوبدبودارقراردیا۔آدمی کی روش تویہ ہونی چاہیے کہ اپنا بھی ہواوراس نے غلط کیاہے تواس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے،غلط کی حمایت کرنااللہ تعالیٰ کے

عذاب کودعوت دینا ہے۔اگرآپ روک نہیں سکتے توکم ازکم چپ چاپ توبیٹھے رہو،لیکن غلط کام میں حمایت کرکے اللہ کی پکڑکواپنی طرف متوجہ کیوں کرتے ہو۔

غلط حمایت سے حضور ﷺ کی براءت

حضوراکرم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کوفتح مکہ کے بعد ایک مقام پرلوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا،وہ گئے اوران کودعوت دی،انہوں نے قبول نہیں کیا، پھردوبارہ پیش کی توانہوں نے کہا ﴿صَبَوْنَا،صَبَوْنَا﴾ عربی زبان میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم پھر گئے،ہم اپنے دین کوبدل چکے۔اصل میں ان کویوں کہنا چاہیے تھا﴿أَسْلَمْنَا﴾ ہم اسلام لے آئے۔لیکن دیہات کے رہنے والے تھے،اپنے اسلام کا اظہارکرنے کے لئے وہ اپنے دل کی بات کوصحیح طریقہ سے پیش نہ کرسکے،اور''ہم اسلام لائے'' کہنے کے بجائے انہوں نے یوں کہا کہ''ہم اپنا دین بدل چکے''۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ اسلام کا لفظ ان کو بھاری معلوم ہوتا ہے،اس لئے یہ''صبونا'' کہہ رہے ہیں کہ ہم پھر گئے،اس لئے انہوں نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیدیا۔اس کے بعد کچھ قتل کئے گئے،کچھ قید پکڑے گئے اورراستہ میں ان کوبھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قتل کرنا چاہا،لیکن صحابہ نے اس پرعمل نہیں کیا جب حضور ﷺ کویہ معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں کوحضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے باوجودقتل کرایا دیا توحضور ﷺ بہت ناراض ہوئے،اتنے ناراض ہوئے کہ آپ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھالئے ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَبْرَأُاِلَیْکَ مِمَّاصَنَعَ خَالِدٌ﴾ اے اللہ!خالدنے جوکچھ کیا ہے اس سے مَیں بری ہوں (بخاری شریف۔۱۸۹/۷) چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے بھیجے ہوئے تھے، لیکن انہوں نے ایک بے اصولی کی تواس پرحضور ﷺ ڈرگئے کہ ان کی اس حرکت پراگرمَیں

نے اس کو سپورٹ (Support) دیا اور اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا اور تو مَیں بھی کہیں اس کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے آپ نے پہلے ہی اپنی براءت ظاہر فرمادی۔

جیسے سگا بیٹا بھی اگر قانون کے خلاف غلط بات کر دے اور باپ کو ڈر ہے کہ حکومت کی جاسوسی ایسی سخت ہے بس مت پوچھو۔ تو بیٹے کی حمایت کی وجہ سے کل باپ کو بھی ہتھکڑی ڈال کر لے جائیں گے، تو باپ کہتا ہے کہ سب سن لو، میرے بیٹے نے جو کیا ہے، مَیں اس سے بری ہوں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہے کہ جانتا ہے کہ ذرا بھی پتہ چلا کہ باپ نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا ہے تو باپ کو بھی ہتھکڑی لگ جائے گی، بیٹے کا تو جو ہونا ہے؛ وہ ہوگا اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا معاملہ ہے۔

﴿جانبین کے لئے معتدل رہنمائی﴾

اس لئے اگر ہمارے کسی عزیز نے غلط حرکت کی ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہی اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اور اصلاح کے لئے مار پٹائی ضروری نہیں ہے، بلکہ پیار و محبت سے اس کو سمجھائیے۔ لیکن اگر اللہ کے کسی بندے نے تنبیہ کی ہو، تو اس کے ساتھ بھی لڑنے جانے کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔

ہاں! تنبیہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی تنبیہ کے واسطے اچھا انداز اور محبت والا طریقہ اختیار کریں۔ اور اگر تنبیہ کرنے والے نے نامناسب طریقہ سے تنبیہ کی ہے تو آپ ان کو بچے کے سامنے تو ہرگز کچھ نہ کہیں، البتہ تنہائی میں کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! آپ کی مہربانی ہوئی کہ آپ نے میرے بچے کو ٹوکا، لیکن ذرا مناسب طریقہ سے ٹوک دیتے تو اچھا تھا، اور آئندہ بھی ضرور ٹوکئے گا، مَیں آپ کا شکر گذار ہوؤں گا، لیکن مناسب طریقہ

اختیار کرنا۔ اور اس کو بھی برا نہیں ماننا چاہیے، اس کو احساس ہونا چاہیے کہ ہاں! مَیں نے غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کہنے کہنے والوں کا فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی بات ایک آدمی کہتا ہے تو لوگ مان لیتے ہیں اور وہی بات دوسرا کہتا ہے تو لوگ نہیں مانتے۔ اب آپ ان سے پوچھئے کہ اس کی کیوں نہیں مانی؟ تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسے بولتا ہے۔ اس لئے جو لوگ کہنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ وہ اچھا اور مناسب طریقہ اختیار کریں۔ شریعت نے اس کے بھی طریقہ بتلائے ہیں۔

اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے ہم کتنے غافل ہیں

بہرحال! بات یہ چل رہی تھی ﴿تُمِيطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ﴾ ہمارے جن بھائی نے ہم سے مسئلہ پوچھا تھا وہ بھی اس تفصیل میں آ گیا۔ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرو، یہ بھی صدقہ ہے۔ شریعت نے تو لوگوں کو تکلیف سے بچانے کا اتنا خیال کیا ہے کہ ایک آدمی بیمار ہے، اس کو زخم ہو گیا اور اس میں پیپ ہو گیا اور پیپ کی وجہ سے بدبو پھیلتی ہے، اگر وہ مسجد کی جماعت میں حاضری دیتا ہے تو اس بدبو سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، تو حاکم اس کو کہے کہ بھائی! تم اپنے گھر جاؤ اور وہیں نماز پڑھو، تم کو گھر پر جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ بلکہ ایسے آدمی کے گھر سے باہر آنے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو تو حاکم اس کے کھانے پینے کا بھی انتظام کرے گا کہ تم کمانے کی فکر مت کرو، کھانا تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔ کھانے کمانے کا انتظام حکومت کی طرف سے کر دیا اور لوگوں کو تکلیف سے بچا لیا۔

بلکہ آپ غور کیجئے کہ حضور ﷺ نے تو کچی پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں اور مجلس میں

آنے کی اجازت نہیں دی کہ منہ کی بدبو سے فرشتوں کو یا مسلمان بھائیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو تو آج کل کون دیکھتا ہے؟ ہم تو ان چیزوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، یعنی کسی کو تصور بھی نہیں آتا کہ یہ بھی تکلیف دہ بات ہے۔ سگریٹ پینے والے کو کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میرے سگریٹ پینے کی وجہ سے میرے منہ کی بدبو سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہوگی؟ وہ تو اس بارے میں کچھ سوچتا بھی نہیں۔ اور یہ سامنے پینے کی بات نہیں ہے، سگریٹ پی کر فارغ ہو چکا ہے، اور دھویں بھی ختم ہو چکے ہیں، پینے کا صرف اثر منہ میں ہے کہ بدبو محسوس ہو رہی ہے، تب بھی جب تک کہ منہ صاف نہ کرلے شریعت اجازت نہیں دیتی کہ آپ مسجد میں جائیں، یا مسلمانوں کے کسی مجمع میں جائیں۔ اس لئے کہ آپ کے منہ کی بدبو سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو جو لوگ سب کے درمیان میں پیتے ہیں اور دھواں نکالتے ہیں، وہ کتنی تکلیف کا باعث بنتے ہوں گے۔

بہرحال! شریعت کی ایسی اونچی اور عمدہ عمدہ تعلیمات ہیں۔ آج ہم نے شریعت کی تعلیمات کو چھوڑا؛ تو اس کو بھگت رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا اہتمام کیا جائے۔ ایسی چیزوں کو اور زیادہ نمایاں کر کے لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے آپس کے جھگڑے بھی آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔ ایسی چیزوں سے ہی جھگڑے ہوتے ہیں، جب یہ نہیں ہوں گی تو آپ ہی آپ جھگڑے بھی ختم ہوں گے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق نصیب فرمائے

الاصلاح بین الناس

آپس کے تعلقات درست کرانا

﴿مجلس ۲﴾

۶/جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۸/اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

وہ آدمی جھوٹا نہیں کہلائے گا

۲۴۹.وعن أم کلثومٍ بنتِ عقبةُ بنِ أبی معیط رضی اللہ عنہا قَالَتْ:سَمِعْتُ رسولَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ:لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ فَیَنْمِیْ خَیْراًأَوْیَقُوْلُ خَیْراً. (متفق علیہ)

یہ باب ''الاصلاح بین الناس'' کا چل رہا ہے۔لوگوں کے درمیان کے تعلقات درست کرانا اور صلح کرانا۔اسی سلسلہ میں حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا کی روایت لائے ہیں۔یہ صحابیہ ہیں،ان کے والد عقبہ بن ابی معیط نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پکے دشمن تھے،غزوۂ بدر کے موقعہ پر جو لوگ قید پکڑے گئے تھے ان میں یہ بھی تھے اور راستہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا،یہ ان کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائیں،اُس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اسلام لا کر تنِ تنہا مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئیں۔وہ فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور ان کے تعلقات کو درست کرانے کے لئے، آپس کے بگاڑ کو درست کرانے کے لئے کوئی بھلی اور اچھی بات دو گروہوں میں سے ایک کی طرف منسوب کر دے؛تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دو پارٹیوں میں آپس میں عداوت اور دشمنی ہے، تعلقات کشیدہ ہیں، ان کے بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرانے اور سدھارنے کے لئے اگر کوئی آدمی کوشش کررہا ہے اور اپنی اس کوشش میں اگر وہ ان دو میں سے ایک کی بھلائی اور اس کے متعلق اچھے جذبات دوسرے دل میں پیدا کرنے کے لئے اور دوسرے کے دل میں اس کے متعلق جو نفرت اور عداوت ہے اس کو کم کرنے اور دور کرنے کے لئے کوئی اچھی بات دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، مثلاً خالد اور محمد میں لڑائی چل رہی ہے، دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اب زید دونوں میں صلح کرانا چاہتا ہے، اس لئے اس نے خالد سے یوں کہا کہ بھائی محمد تو آپ کے لئے دعا کررہا تھا، میں نے خود سنا، وہ آپ کے لئے بھلائی کی دعائیں کررہا تھا، حالانکہ محمد نے خالد کا نام لے کر دعا نہیں کی تھی۔ لیکن زید خالد سے جو یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے خود کانوں سے سنا کہ محمد آپ کے لئے دعا کررہا تھا، وہ اپنی بات کی تاویل کررہا ہے تاکہ خالد کے دل میں محمد کے متعلق جو عداوت ہے وہ کم ہوجائے اور وہ اس کی طرف مائل ہوجائے۔ پھر یہی بات محمد سے بھی کہی کہ خالد تمہارے لئے دعا کررہا تھا، اس طرح دونوں میں صلح کرانے کے لئے کوشش کررہا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی جھوٹا نہیں ہے۔

ایسے موقع پر بھی صریح جھوٹ سے بچو

البتہ علماء نے لکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر صریح اور صاف جھوٹ نہ بولے بلکہ تعریض اور کنایہ سے کام لے۔ تعریض اور کنایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کرے کہ اُن کو سن کر سننے والے کا ذہن اُن الفاظ کے ظاہری مطلب کی طرف جائے اور وہی معنیٰ وہ

مراد لے،لیکن کہنے والا ذرا دور کا مطلب لے رہا ہو۔مثلاً زید کا یہ کہنا کہ خالد تمہارے لئے دعا کر رہا تھا،مَیں نے خود سنا۔تو ہر مسلمان تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرتا ہی ہے کہ اللہ پوری امت کا بھلا کر دے،تمام مسلمانوں کو معاف کر دے،ان کی مصیبتیں ٹال دے۔کون مسلمان ہے جو تمام مسلمانوں کے لئے عمومی انداز میں ایسی دعائیں نہ کرتا ہو،اور عام طور پر جب مجمع ہوتا ہے تو سب کے لئے عمومی دعا کرتے ہی ہیں۔اب بولنے والا کہہ رہا ہے کہ فلاں تمہارے لئے دعا کر رہا تھا،تو سننے والا یوں سمجھ رہا ہے کہ میرا نام لے کر دعا کر رہا تھا اور کہنے والے کی نیت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے دعا کی تھی،اس میں یہ بھی آ ہی گیا ہے۔ تو دیکھئے! یہاں پر صاف جھوٹ نہیں ہے، بلکہ ایک معنٰی کر اس کی بات سچی ہی ہے۔

اسی طرح ایک آدمی مسلمانوں کی تعریف اور خوبیاں بیان کر رہا ہے،تو جب وہ مسلمان کی خوبیاں بیان کر رہا ہے تو وہ محمد جو اس کا دشمن ہے یا خالد جو اُس کا دشمن ہے وہ مسلمان ہونے کے ناطہ سے اس تعریف میں آ ہی گئے؛اسی کو تعریض کہا جاتا ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا نام لے کر دعا کی ہوگی یا تعریف کی ہوگی،اور بولنے والے کی نیت ہے کہ مسلمانوں کے لئے عمومی انداز میں دعا اور تعریف کی،اور یہ بھی اس میں آ ہی گیا۔اب اس کی نیت تو صرف یہ ہے کہ اُس کے دل میں اِس کے متعلق جو نفرت ہے وہ کم ہو جائے،نفرت محبت میں بدل جائے،دوری نزدیکی سے بدل جائے،اور اس طرح کوشش کر کے وہ دو مسلمانوں کو ملانا چاہتا ہے؛تو وہ جھوٹا نہیں کہلائے گا۔

﴿ایسے جھوٹ کی اجازت ہے﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ’’دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز‘‘ کوئی

بات حقیقت میں بالکل سچی ہوتی ہے، لیکن اس کے کہنے میں تعلقات بگڑتے ہیں تو اس سچی بات کا کہنا آپ پر واجب اور فرض تو ہے نہیں، اس لئے آپ کو چاہیے کہ اس کو چھپالیں، اس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کوئی ایسی ذو معنٰی بات کہ جس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، آپ دور والا پہلو لے کر اُس کے سامنے بیان کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اُس کے دل میں عداوت کم ہوتی ہے؛ تو یہ اچھا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جھوٹا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر تعریض اور کنایہ سے کام لے کر بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرانے کی کوشش کرنا پسندیدہ چیز ہے۔

تو دیکھو! دو مسلمانوں میں اگر تعلقات بگڑے ہوئے ہیں، لڑائی جھگڑا ہے، تو اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے جھوٹ کی اجازت دی ہے۔

گنجائش کے تین موقعے

وفی روایۃلمسلم زیادۃ: قالت: وَلَمْ أَسْمَعْهُ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِمَّايَقُوْلُهُ النَّاسُ اِلَّافِيْ ثَلَاثٍ تَعْنِيْ: اَلْحَرْبَ، وَالْاِصْلَاحَ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيْثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَحَدِيْثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا.

میں نے نہیں سنا کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کی بعض ایسی باتیں جو حقیقت سے دور ہوا کرتی ہیں اس کی اجازت دیتے ہوں مگر تین موقعوں پر۔ وہ تین موقعوں میں سے ایک تو لڑائی کے موقعہ پر دشمن کو زیر کرنے کے لئے اس طرح کہنا کہ ''ابھی ہمارا لشکر آرہا ہے''، ''ہماری طرف سے ابھی حملہ ہوگا'' تاکہ دشمن مرعوب ہوجائے اور اس کی قوت کچھ گھٹ جائے یا مرعوب ہو کر مقابلہ پر آنے کی جراءت نہ کرے؛ تو ایسے موقعہ پر جھوٹ کی اجازت ہے۔

﴿وَالْاِصْلاحَ بَیْنَ النَّاسِ﴾ اورلوگوں کے آپس کے جھگڑوں کوختم کرنے کے لئے۔

﴿وَحَدِیْثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ،وَحَدِیْثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا﴾ اورمیاں بیوی کے تعلقات کو درست کرنے کے لئے۔جیسے بیوی مزاج کی ذرا تیز ہے یا بدمزاج ہے تو اُس سے کہنا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ کپڑے سلوادیں گے،ایسا کریں آپ کوسسرال لے چلیں گے،اور وہاں رہنے کا موقعہ بھی دیں گے۔ایسا کہتے وقت دل میں یہ نیت کرے کہ اللہ تعالیٰ اگر استطاعت دیں گے تو لے جائیں گے،اس سے انکار بھی نہیں ہے،لیکن فوری طور پراس کا جو مطالبہ اورلڑائی ہے وہ دور ہوجائے؛تواس کی گنجائش ہے۔

﴿معاملہ کوسلجھانے کا ایک انداز یہ بھی ہے﴾

۲۵۰.وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت:سَمِعَ رَسول اللهِ** ﷺ **صَوْتَ خُصُوْمٍ بِالْبَابِ عَالِیَةٌ أَصْوَاتُهُمَا،وَإِذَاأَحَدُهُمَایَسْتَوْضِعُ الْاٰخَرَوَیَسْتَرْفِقُهُ فِیْ شَیْءٍ وَهُوَیَقُوْلُ:وَاللهِ لاأَفْعَلُ، فَخَرَجَ عَلَیْهِمَارسولُ اللهِ** ﷺ **فَقَالَ:أَیْنَ الْمُتَأَلِّیْ عَلَی اللهِ لایَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ؟ فَقَالَ:أَنَا یارسولَ اللهِ!فَلَهُ أَیُّ ذٰلِکَ أَحَبَّ.** (متفق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دروازے کے پاس دو جھگڑا کرنے والوں کی آواز سنی،دونوں کی آواز بلند ہورہی تھی،اُن میں سے ایک کا دوسرے پر قرضہ تھا اور وہ اُس کا مطالبہ کرتا تھا کہ میرے پیسے لاؤ۔اورجس سے مطالبہ کیا جارہا تھا وہ اس کوسمجھا کر اپنے اس قرضے میں کچھ کم کرنے کی اورسہولت کرنے کی درخواست کررہا تھا کہ آپ کے پانچ ہزارروپے ادا کرنے میری طاقت سے باہر ہیں،اس میں سے کچھ کم کردو، آپ کی مہربانی ہوگی،نرمی کا معاملہ کرواورکچھ چھوڑدو۔پانچ ہزار کے بدلے تین ہزار لےلو،

اور باقی معاف کردو۔ وہ ایسی درخواست کررہا تھا کہ ابھی میرے پاس نہیں ہیں، ایک مہینے کی مہلت دے دو، ایک مہینے کے بعد میں ادا کروں گا۔ اور قرض خواہ کہہ رہا تھا ﴿وَاللهِ لاَ أَفْعَلُ﴾ اللہ کی قسم! مَیں ایسا نہیں کروں گا بلکہ میں تو لے کر رہوں گا اور ابھی ہی لوں گا۔ حضور اکرم ﷺ نے دونوں کی آواز سنی تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا ﴿أَيْنَ الْمُتَأَلِّيْ عَلَى اللهِ لَا يَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ؟﴾ کون ہے جو ایسی قسم کھاتا ہے کہ نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ سامنے والے نے جو درخواست کی تھی وہ تو یہی تھی کہ ذرا کم کردو۔ جیسے آپ کا کسی سے قرضے کا مطالبہ ہے، آپ پانچ ہزار مانگتے ہیں لیکن اس میں سے پانچ سو کم کردیں گے؛ تو یہ کم کردینا نیکی کا کام ہے۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ ابھی ادائیگی کی میری طاقت نہیں ہے، ایک مہینے کی اور مہلت دے دو، ذرا نرمی سے کام لو؛ تو مہلت دینا اور نرمی سے کام لینا بھی نیکی کا کام ہے۔ اور وہ یہی درخواست کررہا تھا لیکن دوسرا کہہ رہا تھا کہ اللہ کی قسم! میں ایسا نہیں کروں گا۔ تو حضور ﷺ نے باہر تشریف لا کر جو فرمایا اس کا انداز دیکھئے، آپ کس انداز سے اُس کو نصیحت کررہے ہیں کہ وہ کون ہے جو نیکی کا کام نہ کرنے کی قسم کھا رہا ہے؟ حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے اور سننے والے بھی صحابی تھے جو نبی کریم ﷺ پر اپنی جان چھڑکتے تھے، اب کیا باقی رہ گیا تھا۔

گویا معاملہ کو سلجھانے کا یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے امت کو سکھلایا۔ جب حضور کی زبانِ مبارک سے یہ بات سنی، تو وہ صحابی فوراً کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! میں نے کہا۔ اس کے بعد وہ صحابی کہنے لگے کہ اب وہ جو چاہے، اُس کو میری طرف سے چھوٹ ہے، یعنی وہ جتنا کم کرنا چاہے؛ مجھے منظور ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کے نمونے

تو دیکھئے! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ اطاعت شعاری ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مقابلہ میں ان کی یہ خاص شان تھی کہ جب کسی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ٹوکا جاتا، تو وہ اسی وقت اُس کی اصلاح کر لیتے تھے، اس میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے تھے۔ اُن میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو سنتے ہیں، اگر ہم سے کوئی غلط بات ہوگئی اور کسی نے حدیث سنا دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشادات سنا دیا تو ہم فوراً باتیں بناتے ہیں، اینچ پینچ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ وہ تو یوں ہے اور فلاں ہے لیکن وہ حضرات اِس چیز کو جانتے ہی نہیں تھے۔ بس! ایک بات سامنے آ گئی اسی وقت اپنا سر جھکا دیتے تھے:- ؎ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

مَیں آپ کو دو واقعات سناتا ہوں جو آپ نے پہلے بھی سنے ہوں گے۔ ایک واقعہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے کا واقعہ پیش آیا، منافقین نے تہمت لگائی تھی اور اس کی وجہ سے ایک مہینہ تک لوگوں میں افواہیں چلتی رہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بڑی تکلیف ہوئی۔ اصل میں یہ سازش تو منافقین نے ہی کی تھی لیکن مؤمنین میں چند گنے چنے بھولے بھالے لوگ تھے، جو ان کے داؤ میں آ گئے تھے اور انھوں نے بھی ان کی اِس بات کو سچا سمجھ لیا اور اپنی زبان سے وہ بھی ایسا ہی بولنے لگے۔ انہیں میں سے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اور حضرت مسطح بن اثاثہ مہاجرین میں سے تھے، غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ وہ غریب آدمی تھے اور ان کا سارا خرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی اُٹھاتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا یہ واقعہ جب پیش آیا تو اس میں یہ بھی بیچارے ناواقفیت کی وجہ سے منافقین کی چال میں پھنس گئے اور انھوں نے بھی تہمت والی بات اپنی زبان سے لوگوں میں کہنا شروع کردی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرے میں کچھ لوگ ایسی چیزیں چلاتے ہیں تو بعض سادہ قسم کے لوگ جن کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی پھنس جاتے ہیں

بہرحال! ایک مہینہ کے بعد اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی کہ جو تہمت لگائی گئی ہے وہ غلط ہے اور تہمت لگانے والوں کے لئے بڑی وعیدیں نازل ہوئیں۔ تو گویا قرآن پاک میں آیتوں نے نازل ہوکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس تہمت سے بری کردیا۔ اب تو بات صاف ہوگئی۔ جب ان کی براءت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح کے متعلق قسم کھالی کہ اب ان کا خرچہ بند کردیتا ہوں۔

دیکھو! یہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی بات ہے کہ جب تک آیتیں نازل نہیں ہوئیں اس درمیان پورا ایک مہینہ گزرا، پھر بھی اُن کا خرچہ بند نہیں کیا۔ ہمارے جیسا ہوتا تو پہلے ہی دن معاملہ نمٹ گیا ہوتا۔ ہم کہتے کہ میری بیٹی کو ایسا کہتا ہے۔ سیدھی بات ہے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، جب تک کہ بات صاف نہ ہوجائے اور یہ طے نہ ہوجائے کہ یہ جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط ہے؛ وہاں تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیتیں نازل ہوگئیں اور یہ بات صاف ہوگئی کہ جو کچھ کہا جارہا تھا وہ سب غلط تھا، تو اب ان کا قصوروار ہونا ثابت ہوگیا، اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان کو نفقہ نہیں دوں گا۔

اور حدیث کی شرح کرنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ قسم بھی اس لئے نہیں کھائی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی بیٹی ہیں، بلکہ یہ فیصلہ اس لئے کیا کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ کے ساتھ یہ معاملہ ہوا، اس حیثیت سے قسم کھائی۔ خیر! قسم کھالی کہ اب خرچہ اور نفقہ نہیں دوں گا۔

وہ تو بیچارے ناواقفیت کی وجہ سے پھنس گئے تھے، پھر انہوں نے توبہ بھی کرلی تھی۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو صحابہ کی دل جوئی بھی منظور رہتی ہے اس کے بھی بہت سارے واقعات ہیں، ابھی میں صرف یہی آپ کو سنا رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش

جب یہ ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیتیں نازل ہوئیں ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ''اولوا الفضل'' فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو ''اولوا الفضل'' کہہ دے، اس کے مقام کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ تم میں جو فضیلت والے اور کشادگی والے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے فضیلت والا بھی بنایا اور مال ودولت بھی دے رکھا ہے وہ اِس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں پر خرچ نہیں کریں گے، اور غریبوں کو اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں، ان کو معاف کردیں اور درگذر سے کام لیں۔ چونکہ حضرت مسطح رشتہ دار بھی ہوتے تھے، غریب بھی تھے اور مہاجر بھی تھے۔

﴿یہ ڈبل پیمانہ تو اچھا نہیں﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ کا انداز تو دیکھئے۔کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے؟ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے، تو پھر تم بھی دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دو۔ یہ ڈبل پیمانہ تو اچھا نہیں ہے کہ ہم تو یہ چاہیں کہ لوگ ہماری غلطیاں معاف کر دیں اور ہم کسی کی غلطی کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ دنیا میں بھی ایسا نہیں چلتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک سوال قائم کیا ﴿أَلا تُحِبُّوْنَ أَن يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے؟

یہ آیت نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلا کر پڑھ کر سنائی، اُسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ﴿بَلٰى! أُحِبُّ أَن يَّغْفِرَ اللّٰهُ لِىْ﴾ کیوں نہیں! مَیں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو بھی معاف کر دے۔ اور اُسی وقت اعلان کر دیا کہ جو بند تھا وہ بھی ملے گا اور آئندہ سے ڈبل (DUBBLE) دوں گا۔ دیکھو! انہوں نے کوئی ایچ پیچ نہیں کی اور ذرا دیر بھی نہیں کی۔

﴿پہلے تحقیق کرو، پھر عمل کرو﴾

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں انہوں نے اپنی بہن کا نکاح ایک صحابی سے کرادیا جن کا لقب ابوالبداح تھا، انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاقِ رجعی دی۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک طلاقِ رجعی دی تو اگر وہ چاہے تو عدت کے اندر اندر رجوع کر کے عورت کو اپنے نکاح میں باقی رکھ سکتا ہے، لیکن عدت پوری گزر گئی اور انہوں نے رجوع نہیں کیا، اب تو وہ طلاق پکی ہوگئی، اور اس عورت کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز ہو گیا۔ اس لئے کہ پہلا نکاح

ختم ہوگیا، لیکن پہلے شوہر پر بالکل حرام نہیں ہوئی، بلکہ وہ دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔ ہاں! اگر تین طلاق دے دی؛ تو پھر وہ حرام ہوجاتی ہے۔

طلاق کے معاملہ میں بھی آج کل ہمارے معاشرے میں لوگ بہت غفلت برتتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ آدمی کو جو بھی کام کرنا ہو تو پہلے معلوم کرلے کہ شریعت اس سلسلہ میں کیا ہدایتیں دیتی ہے۔ جیسے نماز پڑھنی ہے تو معلوم کرلے کہ کیسے پڑھنی چاہیے اور پھر پڑھے۔ نکاح کرنا ہے تو کس طرح نکاح کرنا چاہیے وہ معلوم کرلے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی طلاق دینا چاہتا ہے تو طلاق کے سلسلہ میں شریعت نے کیا ہدایتیں دی ہیں؛ وہ معلوم کرنا چاہیے، لیکن آدمی اس کا حکم معلوم کئے بغیر سیدھے طلاق دینے کیلئے تیار ہوجاتا ہے، طلاق کب دینی چاہیے؟ کن چیزوں پر دینی چاہیے؟ کب درست ہے؟ یہ سب معلوم کرنا چاہیے۔

طلاق کیوں مشروع ہوئی؟

اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ضرورت کی وجہ سے طلاق دینے کی اگرچہ اجازت تو دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، ابوداؤد شریف کی روایت ہے ﴿اِنَّ أَبْغَضَ الْحَلالِ اِلیٰ اللہِ الطَّلاق﴾ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال کی ہیں ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ حلال تو ہے لیکن ضرورت کی وجہ سے حلال کی ہے۔

(سنن ابی داؤد۔ ۲۱۸۷)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد وعورت کے درمیان نکاح ہوگیا، نکاح تو اس لئے ہوا کہ مرد نے بھی اپنے طور پر دیکھا تھا اور اس کو یقین تھا کہ ان شاء اللہ اس عورت کے ساتھ مل کر ہماری زندگی بڑے آرام، سکھ اور چین سے گذرے گی۔ عورت کے گھر والوں نے بھی تحقیق کی تھی اور سب رپورٹ اچھی ملی تھی اور نکاح ہوگیا۔ اس کے بعد جب دونوں آپس

میں ملے اور چندروز ساتھ رہے تواندازہ ہوا کہ اِس کا مزاج اور ہے اوراُس کا مزاج دوسرا ہے،اب دونوں کا مزاج میل ہی نہیں کھارہا ہے،اور دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے،مثلاً عورت کی نافرمانی کی وجہ سے کوئی بات پیش آئی،یاعورت میں کوئی عیب اور قصور ہے،تواب شریعت یہ کہتی ہے کہ عورت کے عیب کی وجہ سے فوراً طلاق دینے کی جراءت مت کرو،اس میں کوئی عیب ونقص اورکمی ہے تواس کے ایک نقص کوسامنے رکھ کرطلاق دینے کے لئے آپ تیارکیوں ہوجاتے ہو؟

﴿حسنِ معاشرت کاایک رہنمااصول﴾

مسلم شریف کی روایت ہے کہ کوئی مؤمن کسی ایمان والی عورت سے (یعنی اپنی بیوی سے) اپنے دل میں بغض نہ رکھے،اگراس کی کوئی بات آپ کوناپسند ہے تواس کی کوئی دوسری بات پسند بھی آئے گی (مسلم شریف۔۱۴۷۲) آپ کوعورت کی ایک بات اگرناپسند ہے،تواس ناپسند بات کومت دیکھو،اس میں اوربھی بہت ساری باتیں ہیں۔یہی ایک عیب تو ہے نہیں بلکہ بہت ساری خوبیاں بھی تو ہیں۔لہٰذا اس کی خوبیوں کوسوچو کہ اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں یہی ایک عیب تو ہے،لہٰذا آپ کو چاہیے کہ اس سے درگذرکریں اور برداشت کریں۔شریعت یہی تعلیم دیتی ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ قرآن پاک کہتا ہے کہ عورت کے ساتھ حسنِ معاشرت اوراچھی زندگی گذارنے کی کوشش کرو،اگرتم ان کوناپسند کرتے ہو،تو ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کوتم ناپسند کرواوراللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی میں بہت زیادہ بھلائی رکھی ہو۔اس آیت میں غورکیجئے کہ ﴿خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ کہا ہے۔

بہر حال! ایک عیب کی وجہ سے اس کی دس خوبیوں کونظر انداز کر دینے کی اسلام اجازت نہیں دیتا، بلکہ اگر یہی حال ہو تو دنیا میں انبیاء کے سوا جتنے بھی انسان ہیں، ان میں کوئی بھی معصوم اور بے گناہ نہیں ہے۔ نبی ہی معصوم و بے گناہ اور تمام عیبوں سے پاک ہوتے ہیں باقی سب انسانوں میں کوئی خوبی ہے، تو کوئی عیب بھی ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، بلکہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوگا۔ اسی طرح سے ایسا بھی نہیں کہ برائیاں ہی برائیاں ہوں، اس میں کوئی نہ کوئی خوبی تو ضرور ہوگی۔

انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ جو گھڑی بند ہوگئی ہو، وہ بھی چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ صحیح وقت بتاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کی گھڑی گیارہ بجے بند ہوگئی تو دن کو جب گیارہ بجیں گے تو اس میں بھی گیارہ بجیں گے، اور اتنی دیر تو وہ صحیح وقت بتائے گی۔ اسی طرح رات کو جب گیارہ بجیں گے تو اس وقت بھی وہ صحیح وقت بتائے گی۔ کہاوت کا حاصل یہ ہوا کہ کوئی بھی عیب والی چیز ہو، اس میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور ہوا کرتی ہے۔

عقلمند اور بے وقوف کے درمیان فرق

لہٰذا آپ کو دنیا میں کوئی عورت ایسی ملنے والی نہیں ہے جس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور کوئی عیب نہ ہو۔ اگر اس کے کسی عیب کی وجہ سے خدانخواستہ آپ اس کو طلاق دے کر دوسری کو پسند کر کے لائے، تو قاعدہ تو وہی ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ عیب تو ہوگا۔ اب اس دوسری میں بھی عیب ہے تو اس کے ساتھ آپ کیا کریں گے؟ خدانخواستہ اگر دوسری کو بھی کسی عیب کی وجہ سے الگ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور تیسری لاتے ہیں تو یہاں بھی وہی مسئلہ آئے گا کہ عیب تو اس میں بھی ہوگا۔ اب آپ سوچیں گے کہ چلو! درگزر کرو اور عیب ہے تو

عیب کے ساتھ ہی سہی، آخر کب تک بدلتے رہیں گے؟ اب یہ فیصلہ کریں گے نا؟ اور اب تو ویسے بھی مجبور ہوں گے، اس لئے کہ تیسری مل تو گئی ہے، کتنوں کو تو دوسری ہی حاصل کرنے میں پسینہ نکل جاتا ہے، تیسری تو بڑی مشکل سے ملتی ہے، اور اگر طلاقوں کا یہ سلسلہ رہا ہے تو چوتھی تو کوئی دے گا ہی نہیں۔ جب آپ دو، تین کو طلاق دینے کے بعد اس فیصلے پر آئے؛ اگر یہی فیصلہ آپ پہلے سے کر لیتے تو پہلی کو الگ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ فارسی کا مقولہ ہے:

آں چہ کند دانا کند ناداں ❁ لیک بعد از خرابی بسیار

عقلمند اور بے وقوف کے درمیان میں اتنا ہی فرق ہے کہ عقلمند جو کام پہلے سے کرتا ہے؛ بے وقوف وہی کام بہت بعد میں کرتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ایک دو قصور کی وجہ سے طلاق دینے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگرچہ طلاق دے گا تو پڑ جائے گی لیکن شریعت منع کرتی ہے، اگر اس میں کوئی عیب ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرو۔

﴿یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو﴾

قرآنِ پاک کی آیتوں میں اس کی اصلاح کے لئے صاف صاف احکام دئے ہیں اگر اس میں کوئی قصور ہے اور اس کی اصلاح کی آپ نے پوری کوشش کی اور اس کو سمجھایا، اس کے بعد بھی اگر وہ نہیں مانتی ہے، تو پھر شریعت نے اس کے لئے آپ کو ایک سزا بتائی ہے کہ اب اس کا بستر الگ کر دو۔ دیکھو! یہ سزا قرآنِ کریم میں ہے۔ اور یہ سزا اللہ تعالیٰ بتلا رہے ہیں۔ انسان کی فطرت سے اس کا خالق اور پیدا کرنے والا جتنا واقف ہوسکتا ہے؛ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ بستر الگ کرنے والا علاج جو اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ اس کے ساتھ مت سوؤ،

اس سے الگ سوؤ؛ یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو۔ اگر وہ شریف ہے اور اس کو آپ کے ساتھ محبت ہے تو بستر الگ کرنے کو وہ برداشت ہی نہیں کرے گی اور سدھر جائے گی۔

لیکن بستر الگ کرنے والا نسخہ ایسا ہے کہ اس میں خود شوہر صاحب کو بھی اپنے اوپر کنٹرول (Control) کرنا پڑتا ہے، اس لئے لوگ اس نسخے کو استعمال نہیں کرتے، کیونکہ اس میں خود بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

﴿پھر تو اللہ تعالیٰ بھی جوڑ کر ہی دے گا﴾

بہرحال! اگر اس پر بھی اصلاح نہ ہو تو پھر مارنے کی اجازت دی۔ اور اس کی بھی تفصیل ہے جو اپنی جگہ پر ان شاء اللہ آئے گی۔ اب یہ سارے نسخے آپ نے آزما لئے، پھر بھی اصلاح نہیں ہوتی، تو اب شریعت یہ کہتی ہے کہ ان تعلقات کو ٹھیک کرنے کے لئے مرد کے خاندان میں سے ایک وڈیل (وڈیرا) اور بڑا آدمی، اور عورت کے خاندان میں سے ایک وڈیل (وڈیرا) اور بڑا آدمی آئیں اور مل کر دونوں کے حال احوال کو درست کرنے کی کوشش کریں۔

اور دیکھو! قرآن نے کیسے اچھے الفاظ استعمال کئے ہیں ﴿فَابْعَثُوا حَكَماً مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِنْ أَهْلِهَا، اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ اگر یہ دونوں (یعنی میاں بیوی بھی اور جن وڈیلوں اور بڑوں کو بیچ میں ڈالا گیا ہے وہ بھی) ان کے حالات اور تعلقات کو درست کرنے کی نیت دل میں رکھتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ بھی جوڑ کر ہی دے گا۔ لیکن وڈیلوں کے بیچ میں پڑنے کے بعد بھی اگر جوڑ نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی کے دل میں نیت خراب ہے، وہ پہلے سے یہ طے کر کے میدان میں آیا ہے کہ ان کو الگ ہی کرانا ہے۔ میاں

بیوی کی نیت بھی اصلاح کی ہواور صلح کرانے کے لئے جو بیچ میں پڑے ہیں ان کی بھی نیت اصلاح کی ہوتو اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ﴿یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا﴾ اللہ تعالیٰ دونوں میں جوڑ کر ہی دے گا۔ معلوم ہوا کہ جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں کوئی خرابی اور کمی ہوتی ہے۔ یہ بات پکی ہے، اور طے شدہ حقیقت ہے۔

﴿شریعت نے طلاق دینے کا طریقہ بھی بتلا دیا﴾

ان سارے مرحلوں کے بعد بھی میاں بیوی کے آپس کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تو پھر شریعت نے طلاق دینے کی اجازت دی ہے، لیکن طلاق دینے کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں طلاق دینا تو آتا ہے لیکن کس طرح دینی چاہیے وہ نہیں آتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ پوری ایک سورت طلاق کا طریقہ سکھلانے کے لئے اتاری ہے کہ اگر کسی کا ارادہ طلاق دینے کا ہے تو کس طرح طلاق دینی چاہیے ﴿یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ کیا آدھی رات کو طلاق دینے کا ارادہ ہوا تو دے ڈالے گا؟ ایسا نہیں ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ پہلی بات تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ قصور کیا ہے؟

﴿ہمارے معاشرے کی دُکھتی ہوئی رگ﴾

میری بات جو چلی تھی اس میں ایک بات کہنا تو مَیں بھول ہی گیا کہ بعض مرتبہ تو بے چاری کا کوئی قصور بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً میاں صاحب باہر کسی سے لڑ کر آئے، اپنی آفس میں نوکر یا ملازم کے ساتھ کھٹا کھٹ ہوگئی، اور دماغ کا پارہ چڑھا ہوا ہے، گھر میں بے چاری بیوی کو تو کچھ پتہ بھی نہیں ہے کہ کس بات پر ناراض ہوکر آئے ہیں۔ یا بیوی کے ابا کے ساتھ

لڑائی ہوگئی، بیوی کے بھائی کے ساتھ لڑائی ہوگئی، اپنے پڑوسی کے ساتھ لڑائی ہوئی، اپنے ابا کے ساتھ لڑائی ہوئی، اور لڑائی میں بھی بیوی کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تو بے چاری اس معاملہ سے بالکل الگ ہے، اس کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے، بیوی کے ابا کے ساتھ جائیداد کا جھگڑا ہے، کبھی دو بھائیوں کے بیٹا بیٹی میں نکاح ہوتا ہے، چچا چچا کے یہاں رشتہ ہوتا ہے، تو وہ جھگڑا آتا ہے۔ اب وہاں جھگڑا دوسرا ہے اور کچھ ہوا تو کہتا ہے کہ طلاق دے دیتا ہوں۔ بوڑھے بوڑھے لوگ دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہیں، ساری زندگی گذاری، اولاد جوان ہوگئی اور کبھی کچھ ایسا ہوا تو بڈّھا دھمکی دیتا ہے کہ چلتی کر دوں گا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ارے بھائی! قرآن وحدیث میں اس کی کوئی دلیل ہے؟ دیکھو! کتابوں میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ ان بنیادوں پر شریعت نے طلاق دینے کی بالکل اجازت نہیں دی ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟ یعنی ہم نے شریعت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ طلاق کا تعلق کس سے ہے، اور ہمارا جھگڑا کس سے ہے۔ اگر آپ کا جھگڑا دوسرے سے ہے تو اس سے اس کے انداز میں نمٹ لو، اپنی بیوی کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔ کیا اس کا یہی قصور ہے کہ جس سے آپ کا جھگڑا ہوا ہے؛ یہ اس کی بیٹی، یا اس کی بہن، یا اس کی رشتہ دار ہے؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

﴿پکے دشمن کی بیٹی نکاح میں ہے لیکن......﴾

ارے بھائی! شروع اسلام میں تو جن کے نکاحوں میں جو بیویاں تھیں ان کا باپ ہی پکا دشمن ہوتا کرتا تھا، خود حضور ہی کا قصہ ہے۔ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا، ان کے باپ ابوسفیان تھے اس وقت ایمان نہیں لائے تھے اور تمام

قریش کے سرداراور مسلمانوں کے اول نمبر کے دشمن تھے۔ وہاں حضور ﷺ نے ایسا تو نہیں کہا کہ میرے دشمن کی بیٹی میرے نکاح میں کیسے رہ سکتی ہے۔ بلکہ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اخلاق کا وہ نمونہ بتایا کہ خود بیٹی اپنے باپ کو حضور کے بستر پر بیٹھنے دینے کے لئے تیار نہیں ہے

قصہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کے بعد ایک موقعہ ایسا آیا کہ ابوسفیان کو مدینہ منورہ آنے کی ضرورت پیش آئی، صلح ٹوٹنے والی تھی، اس کو دوبارہ درست کرنے کے واسطے آئے، جب مدینہ منورہ پہنچے تو اپنی بیٹی کے یہاں آئے۔ اور بیٹی کون تھی؟ نبی کریم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ، پاکیزہ بیوی تھی، جب وہاں پہنچے تو حضور کا بستر کھلا ہوا تھا، جا کر اس پر بیٹھنا چاہا تو ام حبیبہؓ نے جلدی سے بستر لپیٹ دیا۔ اب یہ باپ ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ بستر کھلا ہوا تھا جب مَیں نے بیٹھنا چاہا تو میری ہی بیٹی بستر لپیٹ رہی ہے۔ پوچھا کہ بیٹی! بستر لپیٹ رہی ہو، یہ کون سا طریقہ ہے؟ یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے؟ کیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے، یا مَیں اس کے لائق نہیں ہوں؟ دو ہی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ دیکھو! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے فعل کو ایک ہی وجہ پر محمول کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ پوچھ نہ لو۔ یہ بھی ان کی دانشمندی کی بات تھی کہ انھوں نے یہ سوال کیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ یہ بستر اللہ کے پاک رسول ﷺ کا ہے اور تم مشرک ہو، لہٰذا تم کو حق نہیں ہے کہ اللہ کے پاک رسول کے بستر پر بیٹھو (سیر اعلام النبلاء) میں تو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ دیکھو! وہاں تو یہ معاملہ تھا۔

اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات بھی دیکھو کہ رشتے کیسے ہیں، کسی کے نکاح میں ایسی عورت ہے کہ جس کا بھائی پکا دشمن ہے۔ وہاں تو ان لوگوں نے کبھی یہ نہیں کیا کہ ان کی دشمنیوں کی وجہ سے طلاق دے دی ہو، حالانکہ یہ تو اللہ واسطے کی دشمنی تھی، اگر ایسا کرتے تو ان

کوحق تھا۔اور ہماری دشمنیاں تو دنیا کی خاطر ہوتی ہیں اور ہم ایسا کرڈالتے ہیں۔طلاق کے لئے تو خود عورت کے ساتھ آپ کا معاملہ کیا ہے وہ دیکھا جائے گا،دوسروں کو بیچ میں مت لاؤ

کیا طلاق دینے کا بھی کوئی وقت ہے؟

بہر حال! بات اس پر چل رہی تھی کہ اگر طلاق دینی ہی ہے تو پھر شریعت نے اس کا طریقہ بتلایا ہے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے دل میں آدھی رات کو آیا کہ طلاق دوں تو دے دی۔ بلکہ باری تعالیٰ نے فرمایا ﴿یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ طلاق دینا چاہو تو اس کے وقت میں دو۔کیا طلاق دینے کے لئے بھی کوئی وقت ہے؟ جی ہاں! وقت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں،انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، ان کے والد ناراض تھے کہ اس کو نکاح میں مت رکھو،اس لئے طلاق دیدی،لیکن اس وقت بیوی حالتِ حیض میں تھی اور حیض کی حالت میں طلاق دینے سے شریعت نے منع کیا ہے، لیکن انہوں نے دے ڈالی۔جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے جا کر حضور سے شکایت کی کہ صاجبزادے عبداللہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رجوع کرو۔پھر اگر طلاق دینے کا ارادہ ہو تو حیض سے پاک ہوجائے، پھر اس کے بعد دوبارہ حیض آئے اور پھر پاک ہوجائے تو اس پاکی کے زمانہ میں صحبت کئے بغیر طلاق دینا۔ (ابوداؤد شریف۔۲۱۷۹)

دراصل شریعت کیا چاہتی ہے وہ دیکھو۔شریعت یہ طے کرنا چاہتی ہے کہ واقعتاً اس

کوطلاق دینے کی ضرورت ہے، یا خالی جذبات کے بہاؤ میں آ کرطلاق دے رہا ہے۔اگر واقعتاً حالات کے پیشِ نظرضرورت ہوگی اورسوچ سمجھ کرطلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے؛تو شریعت کہتی ہے کہ اگرحیض چل رہاہےتوابھی انتظار کرو،حالتِ حیض میں طلاق مت دے دیجیو، یہ اس کا وقت نہیں ہے۔اورحیض کے زمانہ میں صحبت کرنے پرتو پابندی تھی،لیکن جب حیض سے پاک ہوئی تو فطری طور پرآدمی کا رجحان عورت کی طرف ہوتا ہے،خاص کر جوانوں کی طبیعت میں تقاضہ زیادہ پیدا ہوتا ہے اوراس کی طبیعت میں بھی صحبت کرنے کا تقاضہ ہوتا ہے۔اس لئے شریعت یہ کہتی ہے کہ اگرطلاق دینی ہےتواب یہ پاک ہوئی ہے، اس سے صحبت مت کرنا،صحبت کئے بغیر طلاق دو۔اب اگر واقعتاً طلاق دینے کی ضرورت ہوگی،تب ہی دے گا؛ ورنہ نہیں دے گا۔

دیکھو! شریعت نے اس کے لئے کیسا وقت رکھا ہے کہ حیض میں مت دینا، جب حیض سے پاکی میں آئے اوراس میں بھی صحبت نہ کی ہو؛ تو طلاق دے سکتے ہو،اوراگرصحبت کرلی ہےتواب اس پاکی کے ایام میں بھی طلاق نہیں دے سکتے۔اگرطلاق دینی ہےتواب پھرانتظار کرو، جب یہ پاکی کے دن گذرجاویں اور پھر سے حیض آوےاوروہ بھی گذرجاوے پھرپاکی آوے؛تواس پاکی میں صحبت کئے بغیر دے سکتے ہو۔شریعت نے ایسانظام اس لئے رکھاہے تاکہ آدمی جذبات سے بے قابوہوکرطلاق نہ دے ڈالے۔ہاں! جس کوواقعتاً ضرورت ہوگی وہی دے۔جذبات والاآدمی تورات کوطلاق دے کرصبح کورونے بیٹھ جاتا ہے بلکہ ایک گھنٹے کے بعد کہتا ہے کہ مولوی صاحب! میرے لئے کوئی راستہ نکالو یعنی گھنٹہ بھی پورا نہیں گذرتا اور جناب کے مزاج ٹھکانے آجاتے ہیں۔

اتنے انتظار کے بعد بھی ایک ہی دو

بہر حال! شریعت اتنی دیر تک انتظار اس لئے کروا رہی ہے تا کہ کچھ تو شان ٹھکانے آ جائے، لیکن اس کے بعد بھی اگر طلاق دینی ہی ہے تو پھر شریعت کہتی ہے کہ ایک ساتھ دو یا تین طلاق دینے کی اجازت نہیں ہے، صرف ایک طلاق دو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب واقعتاً سوچ سمجھ کر ہی دے رہا ہے تو پھر بھی ایک ہی کیوں دلوائی؟ جواب یہ ہے کہ جب آپ کی ضرورت ایک طلاق سے بھی پوری ہو جائے گی تو خواہ مخواہ کیوں زیادہ میں پڑتے ہو، آپ کا مقصد تو صرف اتنا ہی ہے کہ اس کو اپنے نکاح سے نکالنا ہے، اب اگر آپ نے ایک طلاق دی تو شریعت یوں کہتی ہے کہ ایک پڑ جائے گی، لیکن جب تک عدت چل رہی ہے وہ عورت آپ کے نکاح سے نکلی نہیں ہے۔ یہ بات ایک یا دو طلاق کی چل رہی ہے، تین طلاق کا حکم دوسرا ہے، اس کو ابھی بیان نہیں کر رہا ہوں، کوئی بھی آدمی کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔

ایک طلاق دینے کا فائدہ

اب عدت کتنی ہے؟ تو عدت تین حیض ہے، یعنی جس پاکی میں ایک طلاق دی، اس کے بعد ایک حیض آیا، پھر پاکی آئی، پھر دوسرا حیض آیا، پھر پاکی آئی، اور پھر تیسرا حیض آیا یہاں تک عدت چل رہی ہے۔ اس درمیان میں بھی اگر وہ رجوع کرلے تو کر سکتا ہے، یعنی اگرچہ اس نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا، عورت کے حالات کے پیشِ نظر سوچ سمجھ کر طلاق دی تھی، لیکن اب دیکھا کہ طلاق دینے کے بعد تو اس میں بڑا زبردست انقلاب آ گیا ہے اور ایک دم تبدیلی آ گئی ہے، دوسرے لوگ بھی آ کر کہنے لگے کہ آپ نے خواہ مخواہ ہی اس کو طلاق دی۔ اب وہ کہتا ہے کہ اچھا! ایسا ہے۔ پھر اس نے بھی دیکھا اور دل نے بھی گواہی دی

کہ ہاں! لوگوں کی بات تو برابر ہے؛ تو اب شریعت نے موقعہ دیا ہے کہ عدت پوری ہو اس سے پہلے دو گواہوں کے سامنے وہ آدمی یوں کہہ دے کہ مَیں نے اس سے رجوع کرلیا۔ یا اس سے صحبت کرلے؛ تو رجوع ہو جائے گا اور وہ نکاح سے نہیں نکلے گی۔ البتہ ایک طلاق تو پڑ چکی ہے، اس لئے ایک کا حق تو ختم ہو گیا، اور دو کا حق باقی رہا۔

دیکھو! یہ کتنا اچھا طریقہ بتلایا ہے کہ اگر اس میں پچھتاوا بھی ہو تو اس کا علاج موجود ہے، ایک علاج تو کسی کو پوچھے بغیر ہی ہے، اگر عورت نہ چاہے تب بھی آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ ہاں! عدت گذر جائے تو پھر نکاح سے نکل جائے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو نئے سرے سے نکاح ہو سکتا ہے۔ حلالے کا سوال نہیں ہے۔ پھر سے نیا نکاح کرلو۔ اتنا ہے کہ اگر نیا نکاح کرنا ہے تو پھر بیوی سے رضامندی لینی پڑے گی کہ وہ بھی تیار ہے یا نہیں۔ وہ اگر منع کرے کہ مَیں تو اب اس کے پاس نہیں جاؤں گی، بلکہ کسی اور سے نکاح کروں گی؛ تو پھر اس پر زبردستی نہیں کر سکتے۔ اور اگر راضی ہو اور دوبارہ نکاح ہو تو پھر الگ سے مہر بھی دینا پڑے گا۔ یہ حکم عدت کے بعد کا ہے۔ عدت کے اندر تو اس کو پوچھنے کا بھی سوال نہیں ہے۔ شریعت نے کتنی سہولت دی ہے، لیکن لوگ نادانی کی وجہ سے نہ تو وقت دیکھتے ہیں اور نہ کچھ؛ بس! جی میں آیا تو طلاق دے ڈالی؛ پھر روتے پھرتے ہیں۔

﴿ایک ناسمجھ کا قصہ﴾

احمد آباد میں اقتصادیات پر ایک سیمینار ہوا تھا، میرا بھی اس میں جانا ہوا تھا، مسلمان ایک بڑے آفیسر بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی بات پر مسلم معاشرے کی بات چلی، تو انہوں نے ایک قصہ سنایا کہ ایک میاں بیوی ایک بس میں جا رہے تھے، لمبا سفر تھا، ان کے

ساتھ میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا، کسی وجہ سے وہ بچہ رونے لگا، بیوی اس کو خاموش کرنے کی کوشش میں تھی۔اورآپ کوتو معلوم ہی ہے کہ بچہ کبھی مچل جاتا ہےتو باپ کی تو کیا طاقت کہ اس کو خاموش رکھ سکے، ماں بھی اس کو خاموش نہیں کرسکتی۔بچوں کی تربیت اوران کو پالنا بھی بہت بڑا کام ہے، اگر باپ کوسونپ دیں تو دوطمانچہ مارکرختم کردے۔خیر! جب وہ بچہ رونے لگاتو ماں اس کو خاموش کررہی ہے،لیکن وہ چپ نہیں ہورہا ہے،تو میاں صاحب غصہ میں آگئے اور تین طلاق دے ڈالی۔لوگوں نے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ تم لوگ خاموش رہو، یہ تو میرا حق ہے۔ارے اللہ کے بندے! ٹھیک ہے تیرا حق ہےلیکن تجھے اپنے منھ سے یہ کہنے کا حق نہیں ہے؟ تو نے اپنا حق تو سمجھ لیا کہ میرا حق ہےلیکن کہاں اورکس طرح استعمال کرنا چاہیے وہ تو تو جانتا نہیں ہے۔اس لئے مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کیا ہیں ان کومعلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

﴿نظام طلاق پر غیروں کے اعتراض کی اصل وجہ﴾

غیر مسلموں کومسلمانوں کی طلاقوں پر جواعتراضات ہوتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے طلاق کے نظام پرنہیں ہوتے بلکہ ہم لوگوں کی نادانیوں پر ہوتے ہیں۔وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام نے یہی طریقہ بتلایا ہے۔ بلکہ مَیں تو کہتا ہوں کہ ان کوتو حسد بھی ہے،اوروہ بھی اس لئے ہے کہ ان کے مذہب میں ان کوطلاق دینے نہیں ملتی۔ ہندوؤں کے مذہب میں طلاق نہیں ہے۔اسی طریقہ سے عیسائیوں میں بھی ایک مرتبہ نکاح ہوگیا تو بس وہ عورت ہمیشہ اس کی بیوی رہے گی، یہاں تک کہ شوہر مرجاوے تب بھی اس کی بیوی ہی ہے۔

ہندوؤں کے یہاں پہلے زمانہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ کسی کا شوہر اگر مرگیا تو بیوی بھی

شوہر کے ساتھ ساتھ جل جاتی تھی؛ جس کو ''ستی ہونا'' کہتے ہیں۔انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اس ''ستی'' والے طریقہ پر تو پابندی لگادی،لیکن ان کے یہاں بیواؤں کا دوسرا نکاح نہیں ہوتا اس کی اصل وجہ ان کا وہی عقیدہ ہے کہ شوہر کے مرجانے بعد بھی وہ عورت اسی کے نکاح میں رہتی ہے۔اوراب وہ نادانی مسلمانوں میں بھی آئی اور ہمارے سماج میں بھی بیواؤں کا نکاح نہیں کرتے ،حالانکہ وہ تو ان کا مذہب تھا،ہمارا مذہب تھوڑا ہی ہے۔ ہمارے یہاں تو شوہر کا انتقال ہوا تو نکاح ختم ہوگیا،اور جب عدت پوری ہوگئی تو وہ دوسرا نکاح بھی کرسکتی ہے

اسلام نے طلاق کا عجیب وغریب قانون بتایا ہے

مُدُگل کیس جو چلا تھا اس میں کیا تھا؟ بیوی کے ساتھ شوہر کا جوڑ نہیں ہو پارہا تھا، لیکن وہ طلاق بھی نہیں دے سکتا تھا،اور دوسری عورت کے ساتھ تعلقات تھے،اب زندگی بھر اس کے ساتھ بغیر نکاح کے دوستی کے نام سے آنکھیں لڑاتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جس عورت کے ساتھ دوستی کے نام سے زندگی گذار رہا ہے اور سکون حاصل کررہا ہے،اس بیچاری کو بیوی کے حقوق حاصل نہیں ہوتے ،اور مال میں سے وراثت بھی نہیں ملتی،اور اس سے بچے پیدا ہوتے تو وہ جائز بچے بھی نہیں کہلاتے۔تو اب سوچو کہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو اسلام کا احسان ہے کہ آپ کو دوسرے نکاح کی ضرورت ہے تو اس نے اجازت دی کہ ہاں! کرسکتے ہو،اور اس کو بھی بیوی کے حقوق حاصل ہوں گے۔اور اگر شوہر مرجائے گا تو جیسے پہلی بیوی کو وراثت ملے گی،اس دوسری کو بھی ملے گی۔اور اس سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ جائز اولاد ہوگی تو اس سے بھی جائز اولاد ہی ہوگی۔اب بتاؤ! کہ دانشمندی کس میں ہے؟ یہ تو ہم لوگ اسلامی احکام سے واقف ہی نہیں ہیں۔

پھر اُس کیس کا کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر تنّور والا واقعہ پیش آیا۔شوہر نے بیوی کو تنّور میں کیوں جلایا تھا؟ اس لئے کہ جب تک وہ مرے گی نہیں، اُن کے مذہب کے مطابق اس کے زندہ رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح کر ہی نہیں سکتے۔اور یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ مرد دوسری سے دوستی تو کرسکتا ہے لیکن نکاح نہیں کرسکتا۔اِس واقعہ کی وجہ سے بعض لوگ اسلام لے آئے تھے،اور مدگل والے کیس میں اس کا شوہر مسلمان ہوگیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لاء کے نام الگ لو(LAW) ہے،اوراس لو(LAW) کی بنا پر ہندوستان کے دستور نے مسلمان کو اجازت دی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کرسکتے ہیں پھر جب وہ خود مرد اسلام لے آیا تو اُس پر ان لوگوں نے کیس کیا،اوراس کا جو فیصلہ آیا تھا مَیں اس وقت اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

خیر!مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اسلام نے طلاق کا ایسا عجیب وغریب قانون بتایا ہے کہ اگر لوگ اس سے واقفیت حاصل کریں اوراس کے مطابق چلیں تو پھر کوئی اعتراض ہی پیدا نہیں ہوگا۔جو اعتراضات ہو رہے ہیں وہ ہماری کوتاہیوں کی بنا پر ہیں،ہم ہی اس قانون کا غلط طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جب تک تین طلاق نہ دیں، وہاں تک طلاق پڑتی ہی نہیں ہے۔تو بھائیو!سن لو،ایک طلاق دینے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے۔یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض جگہ تو بیچارہ مسئلہ پوچھتا ہے کہ ایسے حالات ہیں اور مجبور ہوگیا ہوں اور طلاق دینی ہے تو کیا کروں اور کس طرح دوں؟ جب اس کو طریقہ بتایا جاتا ہے کہ اگر طلاق دینی ہی ہے تو ایک

دو اور اس طرح دو۔ اب وہ اس کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے تو سماج میں وڈیل (વડીલ) بھی ایسے لوگ بن گئے ہیں کہ اللہ کی پناہ! وہ کہتے ہیں کہ تین دو، ایک نہیں پڑتی، اور وہ زبردستی کر کے تین دلواتے ہیں، یہ تو ایسا حال ہو گیا ہے:-

اذا کان الغراب دلیل قوم ❁ یھدیھم الیٰ طریق الھالکینا

کہ جب کوا کسی قوم کو راستہ بتائے گا تو ہلاکت کے گھڑے میں ڈال دے گا۔ ایسے وڈیل ملیں گے جو مسئلے سے واقف نہ ہوں، تو پھر قوم کا کباڑا ہو جائے گا۔ اس لئے وڈیلوں کو بھی چاہیے کہ مسئلوں سے واقفیت حاصل کریں، اپنے طور پر فیصلے نہ کریں، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور جب وڈیل زبردستی کر کے تین طلاق دلواتے ہیں، اور سب راستہ بند ہو جاتے ہیں تو پھر مفتیوں کے پاس دوڑتے ہیں اور حلالے کے بہانے نکالتے ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔ حالانکہ ایسے حلالے کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔

اصل حلالہ کیا ہے؟

لوگ حلالہ کا مطلب بھی نہیں سمجھتے، اس لئے اس کی بھی تفصیل بتادوں کہ دراصل حلالہ کیا ہے؟ دیکھو! جس شوہر نے تین طلاق دی تو شریعت اس عورت سے یوں کہتی ہے کہ اب اس مرد کے ساتھ تیرا نکاح نہیں ہوسکتا۔ گویا اس عورت کو بتلا دیا کہ وہ اگر تیرے ساتھ محبت رکھتا ہوتا، تو اپنا راستہ کیوں بند کر دیتا؟ محبت تھی تو طلاق ہی نہ دیتا۔ یا اگر دیتا تو ضرورت کی وجہ سے ایک دیتا۔ لیکن جب تین دے دی تو اللہ تعالیٰ نے اس عورت سے کہہ دیا کہ اب یہ مرد تیرا شوہر بننے کی صلاحیت کھو چکا ہے، اس لئے اب اس مرد کے ساتھ تیرا نکاح نہیں ہوگا اصل مسئلہ تو یہی ہے۔

اب اس کے ساتھ نکاح نہیں کرے گی تو دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے گی، اس لئے کہ اس کے ساتھ تو نکاح ہونے کا ہی نہیں ہے، اس لئے اس نے دوسرے مرد سے نکاح کرلیا اور دونوں بالکل الگ ہوگئے۔ جب نکاح ہوتا ہے تو اس میں باقاعدہ دستخط کی جاتی ہے۔ اب آپ لوگ ایک بات بتاؤ کہ نکاح کاہے کے واسطے کیا جاتا ہے؟ کیا طلاق دینے کے واسطے کیا جاتا ہے؟ نہیں! بلکہ ساتھ مل کر زندگی گذارنے کے لئے کرتے ہیں۔ جتنے بھی نکاح ہوتے ہیں اس میں نکاح کرنے والے کی نیت کیا یہ ہوتی ہے کہ ایک رات گزار کر طلاق دے دوں گا؟ اگر ایسی نیت ہے تو یہ نکاح تھوڑا ہی ہے، یہ تو دھوکہ دینا ہے۔ تو اب اس نے بھی نکاح اسی نیت سے کیا کہ اس دوسرے شوہر کے ساتھ زندگی گزارے گی، اور دولہے صاحب نے بھی اس کے ساتھ نکاح اسی نیت کیا تھا۔ دونوں نے کچھ زندگی تو میاں بیوی کی طرح گذاری، لیکن اتفاق کی بات کہ بیگم صاحبہ کو دولہے صاحب راس نہیں آئے، یا میاں صاحب کو بیوی راس نہیں آئی، جو بھی ہو، انھوں نے بھی اس کو طلاق دے دی۔ یہ سب اتفاقاً ہوا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ وہ دونوں تو پھر سے خالی ہوئے ہیں۔ اب مرد یوں کہتا ہے کہ ویسے تو یہ میرے لئے حرام ہوگئی تھی، لیکن اُس نے دوسرا شوہر کیا تھا اور وہ بھی نمٹ گیا ہے۔ اب ہم دوبارہ جڑ سکتے ہیں یا نہیں؟ تو شریعت کہتی ہے کہ ہاں! اب تم دونوں جڑ سکتے ہو۔ یہ اصل حلالہ ہے۔ حلالہ کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ طریقہ جس سے وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔

﴿بھاڑوتی بکرا﴾

لیکن پہلے سے باقاعدہ اسکیم بنا کر کسی کو ٹھوک ٹھاک کر تیار کرنا اور اس سے کہنا کہ

دیکھ! نکاح کے بعد ایک مرتبہ صحبت کر کے اس کو طلاق دیدیجیو۔ تو ایسے حلالہ پر تو حدیثِ پاک میں لعنت آئی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ (ابوداؤد ۲۰۷۶)﴾ حلالہ کرنے والا اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا یعنی پہلا شوہر؛ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس حلالہ کرنے والے دوسرے شوہر کو جس کے ساتھ شرطیں کر کے حلالہ کروایا جاتا ہے "بھاڑوتی بکرا" کہا ہے۔ اور بزرگوں سے یوں سنا ہے کہ اس طرح سے جو شرطی حلالہ کرنیوالے ہوتے ہیں یعنی محلل بنتے ہیں تو عام طور پر آخری زندگی میں ان کو جنون کی نوبت آتی ہے۔ ایسے واقعات بھی سنے ہیں۔

خیر! لیکن اگر کسی نے شرطی حلالہ کرلیا تو اگرچہ اس نے غلط کام کیا اور وہ گنہگار ہوگا لیکن مسئلہ کی رو سے وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی۔ جیسے حیض کی حالت میں طلاق دینے کی ممانعت ہے، تمام ائمہ منع کرتے ہیں، قرآن میں ہے، حدیث میں آیا ہے، لیکن اگر کسی نے دے دی تو پڑ جائے گی۔ ابھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ آیا تھا۔

﴿لوگوں کا ایک اشکال اور اس کا جواب﴾

بہرحال! ہمارے سماج میں جو حلالے کئے جاتے ہیں، اس کی شریعت نے تعلیم نہیں دی ہے۔ اور انہیں حلالوں کو دیکھ کر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ ہندو تو کرتے ہی ہیں، مسلمانوں میں بھی پڑھے لکھوں کو سوال ہوتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے۔ شریعت نے کیا حکم دیا ہے وہ تو آپ نے سن لیا، اور لوگ جو کرتے ہیں وہ کتنا غلط ہے؛ وہ بھی آپ کو معلوم ہوگیا۔

اب بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں عورت کا کیا قصور ہے کہ اس کو دوسرے کے نکاح میں جانے دیا جائے اور وہ صحبت کرے اور اس کے بعد طلاق دیوے؟ تو ہم کہتے

ہیں کہ عورت کا کوئی قصور نہیں ہے۔اس عورت کو تو اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے کہ اس نالائق کے نکاح میں مت رہنا،ہم تو منع کرتے ہیں،لیکن اسی کو دوبارہ اس کے پاس جانا ہے تو ہم کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ نے تو منع کیا تھا اور اس کے لئے اِس کو حرام کر دیا تھا،لیکن وہی تیار ہے کہ مجھے تو اس سے نکاح کرنا ہے۔

دوسرے کو دی گئی سزا خود پر لاگو ہوئی

اور جب بات آئی ہے تو پوری ہی کر دوں۔شریعت نے طلاق کوئی سزا دینے کے لئے نہیں رکھی ہے،بعض لوگ طلاق انتقامی جذبے سے دیتے ہیں،عورت کو سزا دیتے ہیں۔تو حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سزا اس کو نہیں دیتے،اپنے آپ کو دے رہے ہیں۔اس کا پتہ کچھ دنوں کے بعد چلتا ہے۔جب مارا مارا پھرتا ہے اس وقت پتہ چلتا ہے اور اس وقت کھوپڑی میں آتا ہے کہ اوہ ہو!مَیں تو اس کو سزا دینا چاہتا تھا،سزا تو خود مجھ پر ہی لاگو ہوگئی۔

طلاق تو ضرورت کی چیز ہے،ضرورت ہو تب ہی دو۔جب دونوں کو معلوم ہو جائے کہ ہماری زندگی کی گاڑی کسی حساب سے چل سکتی نہیں ہے،ہم ایک ساتھ رہ کر زندگی گذار نہیں سکتے۔شوہر کو بھی اور عورت کو بھی یہ یقین ہو جائے؛تو اب ان دونوں کو نکاح میں باقی رکھنا بھی ایک طرح کی ناانصافی ہوگی۔جن مذاہب میں طلاق کا قانون نہیں ہے وہ اسی مصیبت میں مبتلا ہیں،پھر تنّور والے واقعات پیش آتے ہیں۔تو شریعت نے یوں کہا کہ اس کی ضرورت ہے تو طلاق دو،اور طلاق کا ایک طریقہ بھی بتا دیا۔

طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں

اب لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ طلاق تین دینے سے ہی پڑے گی،ایک دینے سے نہیں

پڑے گی۔تو مَیں اپنے سبق کے دوران طلباء سے کہا کرتا ہوں کہ اب تو جو اسلامی تنظیمیں ہیں وہ اور مدرسے والوں کو، اور دارالافتاء والوں کو، یا اصلاح معاشرہ کی کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ پبلی سیٹی بورڈ کرائے پر لے کر اس پر یہ لکھوائیں کہ:-

''ایک طلاق بھی پڑ جاتی ہے، تین کی ضرورت نہیں، اور ایک کی بھی ابھی نہیں''

تا کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں بیٹھے کہ طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک ضرورت کی وجہ سے رکھی گئی ہے۔

بہر حال! طلاق کی نسبت سے بات آئی تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ کچھ باتیں کہہ دی جائیں، تا کہ آپ حضرات کو اصل مسئلہ سے واقفیت حاصل ہو جائے، اور کبھی کوئی آدمی آپ کے سامنے اس بارے میں اعتراض کرے تو آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ یہی ہے طلاق کے احکام کا خلاصہ جو مختصر طور پر بیان کیا گیا اور آپ نے سنا۔ اب یہ سب باتیں آپ کے ذہنوں رہنی چاہئیں، اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی کسی بھی موقعہ پر ضرورت پیش آسکتی ہے۔

﴿ہماری غفلت کی انتہاء ہے﴾

آج کل تو حال یہ ہو چکا ہے کہ غیر مسلمین اعتراض کرتے ہیں، گاڑی میں سفر کے دوران کوئی مل جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ طلاق کا تمہارے مذہب میں کیا درجہ ہے؟ تو جناب کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی! اپنے بڑوں سے پوچھ کر بتائیو۔ جب اس نے کہہ رکھا ہے پھر بھی پوچھنے کی فرصت نہیں ہے۔ بھائی! آپ پوچھ کر اس کو بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ کوئی بات سامنے آجائے۔ وہ سامنے چل کر اس سے پوچھتا ہے، لیکن یہ پوچھ کر بتاتا ہی نہیں

ہے۔ارے بھائی! یہ فریضہ تو ہمارا تھا کہ اسلام کی خوبیاں اور اسلام کی دعوت لے کر ہم جاتے اور جب وہ کسی نسبت سے سامنے چل کر پوچھنے آیا تو اس کو بتانا ہمارا دوہرا فریضہ ہوگیا۔اور جب اس نے مہلت دی اور کہا کہ نہیں جانتے تو اپنے علماء اور مفتیوں سے پوچھ کر بتانا؛ تب بھی ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔تو یہ ہماری بہت بڑی کوتاہی ہے۔اگر یہ ساری چیزیں ان کے سامنے رکھیں گے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں کوئی انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ہماری ناواقفیت، نادانی، جہالت اور غفلت کے نتیجے میں ان کو اسلامی قانون پر اعتراض کا موقعہ ملتا ہے۔

﴿ آمدم برسرِ مطلب ﴾

خیر! تو مَیں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کر رہا تھا کہ انھوں نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا، انہوں نے ایک طلاق دی، عدت کے اندر رجوع کر سکتے تھے لیکن رجوع نہیں کیا یہاں تک کہ عدت پوری ہوگئی اور وہ ان کے نکاح سے نکل گئی تو اب وہ دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی تھیں، اس لئے ان کے لئے پیغام آنے لگے۔اِنہوں نے بھی پیغام دیا، چونکہ ایک طلاق دی تھی، اس لئے عدت کے بعد بھی نکاح کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے دھیان نہیں دیا۔ان کی بہن کا جی بھی ادھر ہی مائل تھا اور وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ ان کے ساتھ ہی نکاح ہو۔لیکن حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اس سے تو نکاح کراؤں گا ہی نہیں۔چونکہ مَیں نے اپنی بہن اس کے نکاح میں دی تھی تو طلاق کیوں دی، اور پھر رجوع کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، پھر دوبارہ جب نکاح کا وقت آیا تو اب پیغام دیتے ہیں؟ ان سے تو نکاح کرانے کا ہی نہیں، انہوں نے منع کر دیا۔لیکن شریعت نے

اجازت دی تھی اور نکاح ہوسکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات قیامت تک آنے والوں کو بتلانی تھی اس لئے یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا کہ جب وہ عورت پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہتی ہے اور شریعت میں بھی اس کی اجازت ہے تو آپ آڑ مت بنو، اور مت روکو بلکہ پھر سے نکاح کرادو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت معقل رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی، اسی مجلس میں اسی وقت ان کو بلا کر نکاح کر دیا، ذرّہ برابر بھی ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی۔ (المعجم الکبیر۔۱۶۸۷۲)

بہر حال! یہ حضرات صحابۂ کرام تھے، یہاں بھی حضور اکرم ﷺ نے جب ان صحابی سے یہ سوال کیا کہ کون ہے جو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ میں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ ایک صحابی حضور کی زبانِ مبارک سے یہ سن لے، تو پھر کیا دیر لگتی تھی۔ فوراً انھوں نے کہا کہ اللہ کے رسول! میں نے یہ کہا تھا، لیکن اب وہ جو چاہے اس کے لئے وہ ہے یعنی وہ میرے قرضے میں سے جتنا معاف کرانا چاہے؛ میری طرف سے اجازت ہے۔ انہوں نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں لگائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان حضرات جیسے جذبات کا کوئی حصہ نصیب فرمادے
اور اسلامی ہدایات کی صحیح فہم وسمجھ عطا فرمادے

الاصلاح بین الناس

آپس کے تعلقات درست کرانا

﴿مجلس ۳﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّاۤاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

صلح کرانے والا اس بات کے انتظار میں نہ رہے

۲۵۱. عن أبی العباس سھل بن سعدالساعدی رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللّٰہِ ﷺ بَلَغَہُ أَنَّ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ کَانَ بَیْنَھُمْ شَرٌّ،فَخَرَجَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ یُصْلِحُ بَیْنَھُمْ فِیْ أُنَاسٍ مَعَہٗ،فَحُبِسَ رسول اللّٰہِ ﷺ،وَحَانَتِ الصَّلاۃُ،فَجَآءَ بِلالٌ اِلٰی أَبِیْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ فَقَالَ:یَاأَبَابَکْرٍ!اِنَّ رسولَ اللّٰہِ ﷺ قَدْحُبِسَ وَحَانَتِ الصَّلاۃُ،فَھَلْ لَکَ أَنْ تَؤُمَّ النَّاس؟قَالَ:نَعَمْ اِنْ شِئْتَ،فَأَقَامَ بلالٌ الصَّلاۃَوَتَقَدَّمَ أَبُوْبَکْرٍفَکَبَّرَوَکَبَّرَالنَّاسُ،وَجَآءَ رَسولُ اللّٰہِ ﷺ یَمْشِیْ فِی الصُّفُوْفِ حَتّٰی قَامَ فِی الصَّفِّ،فَأَخَذَالنَّاسُ فِی التَّصْفِیْقِ،وَکَانَ أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ لایَلْتَفِتُ فِیْ صَلاتِہٖ، فَلَمَّاأَکْثَرَ النَّاسُ التَّصْفِیْقَ؛اِلْتَفَتَ،فَاِذَارَسولُ اللّٰہِ ﷺ،فَأَشَارَاِلَیْہِ رسول اللّٰہ ﷺ،فَرَفَعَ أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ یَدَہٗ فَحَمِدَاللّٰہَ،وَرَجَعَ الْقَھْقَرِی وَرَاءَہٗ حَتّٰی قَامَ فِی الصَّفِّ،فَتَقَدَّمَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ،فَصَلّٰی لِلنَّاسِ،فَلَمَّافَرَغَ أَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ فَقَالَ:أَیُّھَاالنَّاسُ مَالَکُمْ حِیْنَ نَابَکُمْ شَیْءٌ فِی الصَّلاۃِ أَخَذْتُمْ فِی التَّصْفِیْقِ؟اِنَّمَاالتَّصْفِیْقُ لِلنِّسَآءِ.مَنْ نَابَہٗ شَیْءٌ فِی صَلاتِہٖ فَلْیَقُلْ:سُبْحَانَ اللّٰہِ، فَاِنَّہٗ لا یَسْمَعُہٗ أَحَدٌحِیْنَ یَقُوْلُ:سُبْحَانَ اللّٰہِ،اِلَّاالْتَفَتَ.یَاأَبَابَکْرٍ!مَامَنَعَکَ أَنْ تُصَلِّیَ بِالنَّاسِ حِیْنَ أَشَرْتُ اِلَیْکَ؟فَقَالَ أَبُوْبَکْرٍ:مَاکَانَ یَنْبَغِیْ لِابْنِ أَبِیْ قُحَافَۃَ أَنْ یُصَلِّیَ بِالنَّاسِ بَیْنَ یَدَیْ رسولِ اللّٰہِ ﷺ. (متفق علیہ)

بیان چل رہا تھا کہ اگر لوگوں میں تعلقات بگڑے ہوئے ہیں، آپس میں جھگڑا اور نااتفاقی ہے تو ان کے جھگڑے کو ختم کرانا اور ان کے درمیان اتفاق اور صلح کرانے کے لئے کوشش کرنے کی کیا فضیلت ہے۔ کچھ روایتیں پیش کی تھیں، آج ایک اور روایت لائے ہیں جس میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ جھگڑے کو ختم کرانے کے لئے بنفس نفیس تشریف لے گئے۔

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ بنو عمرو بن عوف کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ یہ قبیلہ قباء میں آباد تھا، مسجدِ نبوی- جہاں نبی کریم ﷺ قیام فرماتے تھے وہاں- سے ایک میل دور ہے۔ اُس زمانہ میں وہ ایک الگ محلّہ اور الگ آبادی تھی جبکہ آج کل تو وہ مدینہ منورہ ہی کے اندر شامل ہو چکا ہے۔ جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہاں جو قبیلہ آباد ہے اس کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ہے تو نبی کریم ﷺ کچھ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں تشریف لے گئے تا کہ ان کے درمیان صلح کرائیں۔

یہاں اس روایت کو صرف اسی نسبت سے پیش کیا ہے کہ دیکھو! جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے درمیان آپس میں جھگڑا ہوا ہے تو نبی کریم ﷺ بایں جلالتِ شان اور بلندئ مرتبہ اس جھگڑے کو ختم کرانے اور ان کے درمیان صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کو دعوت نہیں دی گئی تھی اور آپ کو بلانے کے لئے بھی کوئی نہیں آیا تھا، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی بڑا آدمی ہو اور اس کو جب یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے اور اس کا خیال یہ ہو کہ میرے کوشش کرنے سے اور ان کے درمیان کے اختلاف کو دور کے لئے میرے سعی کرنے سے جھگڑا ختم

ہو جائے گا تو اس کو چاہیے کہ اس بات کے انتظار میں نہ رہے کہ اگر کوئی مجھے بلانے کے لئے آوے گا؛ تب ہی مَیں جاؤں گا، بلکہ اس کو بذاتِ خود جا کر اس کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی تشریف لے گئے، آپ نے وہاں جا کر جھگڑا ختم کر دیا اور صلح کرادی۔

ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کو میزبانی کے لئے روک لیا۔ جیسے جب کوئی بڑا آدمی کہیں جاتا ہے تو وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ذرا ٹھہر جایئے اور خاطر تواضع کرتے ہیں، اسی طرح حضور اکرم ﷺ وہاں روک لئے گئے، وہاں والوں نے آپ کی خاطر تواضع کی نیت سے آپ کو روک لیا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں جو معنٰی بیان کیا ہے وہ یہی ہے ﴿حُبِسَ: أَمْسَكُوهُ لِيُضِيفُوهُ﴾ انہوں نے میزبانی کے واسطے حضور ﷺ کو ٹھہرالیا اور نماز کا وقت آ گیا۔

﴿حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بڑی سعادت کی چیز تھی﴾

آپ ظہر کے بعد تشریف لے گئے تھے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تاکید بھی فرما گئے تھے کہ اگر عصر کا وقت آجائے اور مَیں نہ پہنچوں تو ابوبکر سے کہنا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں۔ چنانچہ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابوبکر! نبی کریم ﷺ روک لئے گئے ہیں اور ابھی تک تشریف نہیں لائے اور نماز کا وقت ہو چکا ہے، کیا آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں گے؟ اور یہ بھی بتادیا کہ حضور ﷺ تاکید فرما کر گئے ہیں کہ نماز کا وقت آوے اور مَیں نہ پہنچوں تو ابوبکر سے کہنا کہ وہ نماز پڑھادیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اقامت اور تکبیر کہی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کے لئے آگے بڑھے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرادی۔ لوگوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور نماز شروع ہوگئی۔

اب نماز شروع ہوئی اور نبی کریم ﷺ تشریف لائے، حضرت ابوبکر تو نماز شروع کروا چکے تھے، حضور اکرم ﷺ صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں آ کر کھڑے ہو گئے، جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو حضرت ابوبکر نماز پڑھانے میں مشغول تھے، اور ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ تشریف لا چکے ہیں تو لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کر دی۔ اس لئے کہ لوگوں یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز کے درمیان امام کو کسی بات کی طرف توجہ دلانے کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے، لوگوں کو اپنے طور پر اپنے خیال میں یہی طریقہ مناسب معلوم ہوا تو انہوں نے تالی بجا کر حضرت ابوبکر کو متوجہ کرنا شروع کیا، گویا وہ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لا چکے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عادت یہ تھی کہ نماز میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھتے تھے۔ جب لوگوں نے تالی بجانا شروع کیا تب بھی انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا لیکن جب لوگوں نے بہت زیادہ تالیاں بجائیں اور یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا تو انہوں نے ایک نظر دوڑائی تب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی دیکھا کہ ابوبکر دیکھ رہے ہیں اور اب پیچھے آئیں گے اس لئے حضور ﷺ نے اشارہ کیا۔ گویا آپ ﷺ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ وہیں کھڑے رہو اور نماز پوری کراؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بڑی سعادت اور شرف کی بات تھی کہ حضور ﷺ نے خود تشریف فرما ہونے کے باوجود ان سے یوں کہا کہ آپ نماز پوری کرا دیجیے، اس لئے حضرت ابوبکر نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر الحمدللہ کہا یعنی اللہ تیرا شکر ہے کہ تیرے حبیب کو مجھ پر اتنا اعتماد ہے کہ خود تشریف فرما ہوتے ہوئے مجھے نماز پوری کرانے کے لئے فرما رہے ہیں۔ گویا یہ ایک سعادت اور فخر کی چیز تھی جس پر اللہ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنا ہی چاہیے، اس لئے انہوں نے الحمدللہ کہا اور پھر پیچھے ہٹنا شروع کیا، یہاں

تک کہ صف میں آ کر کھڑے ہوگئے۔جب وہ پیچھے آ گئے تو نبی کریم ﷺ آگے بڑھے اور آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اس لئے کہ جب نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں تو ان میں رہنمائی کی جاتی ہے اور آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ نماز کے دوران ایسا معاملہ پیش آیا اور لوگوں نے امام کو متوجہ کرنے کے لئے اپنے طور پر یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ تالیاں بجائیں، اب آئندہ کے لئے کیا ہدایت دی جائے تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ اے لوگو! کیا بات ہے کہ نماز میں جب کوئی بات پیش آتی ہے تو تم تالیاں بجانا شروع کرتے ہو، جب کوئی معاملہ پیش آئے اور امام کو متوجہ کرنا ہو تو تالیاں بجانا عورتوں کے لئے ہے۔

﴿امام سے کوئی غلطی ہوجائے تو اسے کس طرح متوجہ کیا جائے؟﴾

نبی کریم ﷺ نے ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ﴾ جو فرمایا یہ دوسری روایت میں بھی ہے ایک اور روایت میں ہے ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ وَالتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ﴾ مردوں کے لئے تو تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا ہے، جب نماز کے دوران کوئی معاملہ پیش آوے اور امام سے کوئی غلطی ہوجائے اور اس کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنا ہو مثلاً امام کو بیٹھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ کھڑا ہوگیا، یا قراءت میں کوئی غلطی ہوگئی، اب امام کو اس طرف متوجہ کرنا ہو تو نبی کریم ﷺ نے بتلایا کہ مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہیے۔اور عورتوں کے لئے فرمایا کہ وہ تالی بجائیں۔

اب ایک مسئلہ ائمہ کے درمیان زیر بحث آیا کہ اگر امام کو متوجہ کرنا ہو تو اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔تو تمام حضرات ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ سب اس پر متفق ہیں کہ مرد تو اس کے لئے سبحان اللہ کہے، لیکن

عورت کیا کہے تو اس معاملہ میں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عورت بھی سبحان اللہ کہے یعنی وہ بھی تسبیح کے ذریعہ سے ہی امام کو اس کی غلطی پر متنبہ کرے۔ اور دوسرے حضرات ائمہ فرماتے ہیں کہ عورت تالی بجائے اور تالی کے لئے بھی یوں نہیں (ہتھیلی کو ہتھیلی پر نہ مارے) بلکہ یوں بجایا جائے (ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی پشت پر مارے) اس طرح تالی بجائے کہ آواز پیدا ہو، اور امام کو اس کے ذریعہ متوجہ کر دیا جائے۔

امام مالکؒ اپنی بات کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روایت میں ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ﴾ آیا ہے، اور حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تالیاں بجانا عورتوں کا کام ہے یعنی مردوں کے لئے یہ انداز اختیار کرنا ایک عیب کی چیز ہے، جیسے کہتے ہیں کہ بزدلی عورت کا کام ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت بزدلی اختیار کرے۔ ایسے ہی یہاں بھی کہا گیا ہے کہ تالیاں بجانا عورتوں کا کام ہے۔ امام مالکؒ یہ فرماتے ہیں کہ عورت بھی نماز میں تالی نہیں بجائے گی، بلکہ سبحان اللہ ہی کہے گی۔ خیر! پھر حضور ﷺ نے آگے فرمایا کہ اگر کسی کو نماز میں کوئی بات پیش آجائے اور امام کو متوجہ اور باخبر کرنا ہو تو سبحان اللہ کہے، جب نمازی سبحان اللہ کہے گا تو جس کو وہ متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ متوجہ ہو جائے گا۔

﴿ابوقحافہ کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ......﴾

حضور ﷺ نے لوگوں کو یہ نصیحت فرمائی پھر نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوئے، کیونکہ حضرت ابوبکر کو بھی تو حضور نے اشارہ فرمایا تھا کہ نماز پوری کرا دیجیے، اس کے باوجود وہ پیچھے ہٹ گئے تھے اور نماز پوری نہیں کرائی تھی۔ تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوبکر! جب مَیں نے تم کو اشارہ کے ذریعہ سے بتلا دیا تھا کہ نماز پوری کرادو پھر تم نے نماز

پوری کیوں نہیں کی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں عرض کیا کہ ابوقحافہ کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لوگوں کو نماز پڑھائے۔ اگرچہ آپ نے تو فرمادیا تھا اور آپ کا یہ فرمانا میرے لئے سعادت و خوش بختی اور فخر کی چیز تھی، لیکن آپ کے ہوتے ہوئے مَیں لوگوں کی امامت کراؤں؛ یہ میرے لئے مناسب نہیں ہے، اس لئے میں نے امامت نہیں کرائی۔ حضرت ابوبکر بھی سمجھ گئے تھے کہ آپ کا یہ اشارہ واجب کے طور پر نہیں تھا، بلکہ صرف اجازت دی تھی کہ نماز پوری کرادیجیے۔ جب وجوبی حکم نہیں تھا اس لئے پیچھے ہٹ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جگہ خالی کردی۔

بہرحال! یہاں تو یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! قبیلہ بنوعمرو بن عوف کے درمیان جو معاملہ پیش آیا تھا کہ ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا، اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے اور صلح کرانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی قوم، سماج، برادری اور بستی میں کوئی ایسا بڑا آدمی ہو اور اس کو یہ معلوم ہو کہ بستی کے کچھ لوگوں میں جھگڑا ہوا ہے اور اس کے جانے سے وہ ختم ہوجائے گا اور صلح ہوجائے گی تو اس کو چاہیے کہ خود جاوے اور جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔ اُن کی طرف سے بلائے جانے کا انتظار نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضور پاک کی ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

فَضْلُ ضُعُفَةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِیْنَ

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذباللّٰہمن الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہالرّحمٰن الرّحیم

وَاصْبِرْنَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِوَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَاتَعْدُعَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. (الکھف . ۲۸)

باب کا عنوان

یہ باب قائم کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کمزور اور غریب قسم کے ایسے لوگ جن کی سماج کے اندر کوئی حیثیت نہیں ہوتی، عام طور پر لوگ ان کو حقیر سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے ساتھ تحقیر کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ بات کوئی ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت وثروت عطا فرمائی، عزت وشہرت عطا فرمائی یا کوئی منصب و عہدہ عطا فرمایا؛ وہی بڑا ہو گیا۔ اور بے چارہ جس کے پاس یہ چیزیں نہیں، نہ دولت ہے، نہ عزت ہے، نہ شہرت ہے نہ کوئی منصب وعہدہ ہے؛ تو وہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس کو کیا قبولیت حاصل ہے اس کو کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے جو دنیوی اسباب کسی کے لئے بڑائی کے اور اونچا مقام ہونے کے ہو سکتے ہیں اگر کسی کو وہ میسر نہیں ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے ساتھ تحقیر کا اور معمولی سمجھنے کا اور ذلت کا معاملہ

نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کے متعلق بھی دل کے اندر اکرام وعزت کے جذبات ہونے چاہئیں اوران کے ساتھ بھی عزت واحترام کا معاملہ کرنا چاہیے۔

یہی لوگ اہلِ مجلس قرار دیئے گئے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خاص طور پر حکم دیا کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیے جو صبح وشام اللہ کو یاد کرتے اور پکارتے ہیں اوران کا مقصد اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، اور آپ کی آنکھیں ان سے اِدھر اُدھر نہ ہوں یعنی یہ سمجھ کر کہ یہ معمولی لوگ ہیں دوسرے لوگ جو دنیوی اعتبار سے اہلِ ثروت، اہلِ منصب اور اہلِ شہرت ہیں ان کی طرف آپ کی نگاہیں آگے بڑھنے لگے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ دنیوی زندگی کی زیب وزینت کے خاطر ان سے اپنی نگاہیں نہ پھیرلیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تاکید فرمائی کہ آپ اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے اندر لگائے رکھیے اور آپ کو ایسے ہی لوگوں میں رہنا چاہیے۔ گویا آپ کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ مجلس ان لوگوں کو قرار دیا۔

ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا

ایک اور جگہ پر ارشاد ہے ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو صبح وشام پکارتے ہیں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے؛ آپ ایسے لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالیے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ مشرکین مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کو یہ کہلوایا کہ اصل

میں ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کے پاس آویں، آپ کی خدمت میں حاضری دیں اور آپ کی باتیں سنیں، لیکن آپ کے پاس بیٹھنے والے یہی کمزور، غریب غرباء اور مسکین لوگ ہیں، آپ کی مجلس میں ہمیشہ وہی لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور حلقہ جمائے رہتے ہیں، اس لئے ہم اگر آویں اور ان کے ساتھ بیٹھیں تو اس میں ہماری ذلت وتوہین اور بے عزتی ہے، اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے سامنے دین کی کچھ باتیں پیش کریں، تو ایسا کیجیے کہ ہمارے لئے الگ مجلس مقرر کیجیے، جس میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، اُن کے لئے الگ مجلس ہو۔ اگر آپ ایسا کریں تو ہم آپ کی مجلس میں حاضری کے واسطے اور آپ کی باتیں سننے کے واسطے تیار ہیں، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلاتَطْرُدِالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ﴾ اے نبی! یہ فقراء، مساکین اور غریب وکمزور لوگ جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبح وشام اس کو پکارتے ہیں؛ ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا (مسلم شریف۔۶۳۹۴) ان مالداروں، رؤساء اور ان بڑے بڑے لوگوں کو جو قوم کے پٹیل اور چودھری سمجھے جاتے ہیں اگر آپ سے فائدہ حاصل کرنا ہے اور آپ سے وہ لوگ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو اِن کی موجودگی میں ہی وہ لوگ بھی آویں، طلب لے کر یہ بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور وہ بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔ اُن کی خاطر اِن کمزوروں غریبوں اور مساکین کو اپنی مجلس سے نکالنے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا۔

گویا اسلام نے قیامت تک کے لئے ایک اصول بتلا دیا کہ دین کے معاملہ میں جو طلب لے کر آئے گا بس وہ حقدار ہے، چاہے وہ کوئی غریب ہو یا مالدار ہو، چاہے وہ کم مرتبہ کا

ہو یا اونچے مرتبے کا ہو، چاہے وہ قوم کا سردار ہو یا اس کو سرداری وریاست حاصل نہ ہو، وہ جیسا بھی ہو، یہاں تو سب کے لئے یکساں حق ہے۔اصل تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اندر طلب موجود ہو، محض اپنی بڑائی دکھلانے کے لئے اگر کوئی ایسا کرنا چاہتا ہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس وقت اگر ہما شما ہوتے تو کہتے کہ اس میں کیا حرج ہے، فائدہ ہے، دین کی بات پہنچانے کا ہمیں موقعہ ملے گا، اور کیا ضروری ہے کہ یہ لوگ بھی موجود رہیں، ان کے لئے دوسری مجلس قائم کر کے ان کو تو ہم موقعہ دے ہی رہے ہیں، اس لئے ان مالداروں کے لئے الگ مجلس قائم کی جائے تو کوئی اشکال کی بات نہیں ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو منع فرمادیا۔

وہ بھی اسی مجلس میں آجاویں

اسی لئے حضرات علماء اور اکابر واسلاف کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں یہی بات ہمیں ملتی ہے۔حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ہارون رشید کی طرف سے کہلوایا گیا کہ آپ میرے بیٹوں کو مؤطا کا درس دیں اور اس کی سند عطا فرمائیں اور ان کے لئے الگ مجلس قائم کریں، حالانکہ ہارون رشید بادشاہ خود بھی دیندار آدمی تھے، بادشاہِ وقت تھے اور ان کی سلطنت کتنی بڑی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادل گذر رہا تھا تو اس بادل کو خطاب کرتے ہوئے ہارون رشید نے یوں کہا کہ اے بادل! تو کہیں پر بھی جا کر برس، تیرے پانی سے جو کھیتی پیدا ہوگی اس کا خراج میرے خزانے میں ہی آنے والا ہے۔اتنی بڑی سلطنت کے مالک نے اپنے دونوں بیٹوں کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہلوایا

کہ آپ میرے بیٹوں کو مؤطا کا درس دیں اور مؤطا کی سند عطا فرمائیں اور ان کے لئے الگ مجلس قائم کریں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر وہ چاہتے ہوں تو اور لوگ جس مجلس میں آتے ہیں وہ بھی اسی مجلس میں آجاویں، مَیں ان کے لئے الگ سے کوئی مجلس قائم نہیں کروں گا۔

حضور اکرم ﷺ نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا

اور دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو تعلق اور محبت تھی اور آپ پر جو عنایتیں تھیں؛ کسی اور پر اتنی نہیں تھیں، بلکہ آپ ﷺ تو وجہ تخلیق کائنات تھے، اور آپ کے اوصاف قرآنِ پاک میں جگہ جگہ بیان فرمائے گئے ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جن دو تین موقعوں پر عتاب وتنبیہ فرمائی ہے ان میں سے ایک موقعہ وہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس قریش کے کچھ بڑے بڑے سردار آئے ہوئے تھے اور آپ ان کے سامنے دین کی دعوت پیش فرما رہے تھے، اسی درمیان میں ایک صحابی عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے جو نابینا تھے، چونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ کچھ اہم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اس لئے انہوں نے آکر حضور اکرم ﷺ سے کچھ پوچھنا شروع کردیا۔ وہ تو معذور تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو یہ ناگوار گذرا اور اس ناگواری کا نبی کریم ﷺ نے جو اظہار فرمایا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰی وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰی أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی﴾ تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اتنی سی بات پر کہ ایک اندھا آگیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ نصیحت حاصل کرتا، یا وہ پاکی حاصل کرلیتا

اور اپنی اصلاح کر لیتا، یا وہ نصیحت حاصل کرتا جس سے اس کو فائدہ ہوتا ﴿أَمَّـا مَنِ اسْتَغْنٰى فَأَنْتَ لَـهٗ تَصَدّٰى﴾ جو آپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا، جن سے آپ بات کر رہے ہیں، ان کے اندر تو طلب نہیں ہے لیکن آپ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور یہ تو طلب لے کر آیا ہے اس سے رخ پھیرتے ہو حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف سے جو رخ پھیرا تھا وہ نعوذ باللہ! اس لئے نہیں کہ وہ کم درجے کے تھے اور انہیں معمولی سمجھ کر اعراض کیا ہو، بلکہ آپ یوں سمجھتے تھے کہ یہ تو اپنے ہی ہیں دوسرے موقعہ پر ان سے گفتگو کر لیں گے اور ان کو سمجھا دیں گے، لیکن یہ اچھا موقعہ ہے جو اللہ نے دیا ہے کہ ایسے بڑے بڑے لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں، ان کے سامنے بات رکھ دی جائے، اگر وہ قبول کر لیں تو آئندہ اس کی وجہ سے اسلام کی ترقی کی راہیں اور دعوت کے پھیلنے کے راستے کھل سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ نے ان کی طرف سے بے توجہی برتی تھی۔ ان کو کمزور اور معمولی سمجھ کر ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اپنا سمجھ کر ایسا کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا اور حضور اکرم ﷺ کو بڑے عجیب اور سخت انداز میں تنبیہ فرمائی، اسی لئے ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد جب بھی وہ صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تھے تو نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے ﴿مَرْحَباً بِّمَنْ عَاتَبَنِیْ فِيْهِ رَبِّیْ﴾ خوش آمدید ہو اور تشریف لائیے وہ صاحب جن کے متعلق میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا۔

(روح المعانی)

حاصل یہ ہے کہ وہاں تو طلب دیکھی جاتی ہے، مقام اور منصب نہیں دیکھا جاتا۔ جو طلب لے کر آئے، چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، آپ اس کی طرف توجہ فرمائیے۔

﴿میں بتلاؤں جنتی لوگ کون ہیں؟﴾

۲۵۲. وعن حارثة بن وهب رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: أَلَا أُخْبِرُكُمْ

بِـأَهْـلِ الْـجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعِّفٍ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ. أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ. (متفق عليه)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میں بتلاؤں جنتی لوگ کون ہیں؟ وہ جو کمزور ہیں یعنی جسمانی، مالی، منصب اور عہدے، مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے کمزور ہیں اور ﴿مُتَضَعِّفٍ﴾ یعنی لوگ بھی اس کو کمزور سمجھ رہے ہیں، اور ان کے ساتھ کمزوروں والا معاملہ کررہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے لوگ جنت کے اندر جائیں گے۔ کمزور ہونے اور لوگوں کے ان کو معمولی سمجھنے کے باوجود اللہ تعالی کے یہاں ان کا وہ مقام ہے کہ اگر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالی ان کو بری کردیں یعنی ان کی قسم کو پورا کردیں۔

﴿کیا میری بہن ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟﴾

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک عورت ربیع بنت نضر جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، ایک مرتبہ ان کی کسی قریبی کے ساتھ لڑائی ہوگئی، تو انہوں نے اس کا دانت توڑ دیا۔ اب قرآنِ پاک میں ہے ﴿اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ﴾ دانت کے بدلے میں دانت۔ اگر کوئی قصداً کسی کا دانت توڑ دے تو بطورِ قصاص، بدلے اور سزا کے طور پر اس کا بھی دانت توڑا جائیگا۔ اب وہ لڑکی جس کا دانت توڑا گیا تھا اس کے گھر والوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تو بدلہ اور قصاص چاہیے، ہم بھی ان کا دانت توڑیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر تھے۔ انہوں نے اور سب گھر والوں نے چاہا اور اس لڑکی کے گھر والوں کو سمجھایا کہ مان جاؤ، معاف کردو اور پیسے لے کر چھوڑ دو۔ لیکن ان لوگوں نے کہا کہ نہیں! ہم تو ان کا دانت توڑیں گے۔ معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس کے گھر والوں نے آپ کے سامنے بھی وہی بات دہرائی

کہ ہم تو ان کا دانت توڑیں گے۔حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا کہ اے اللہ کے رسول!﴿أَتُكْسَرُ سِنَّ الرُّبَيِّعِ؟﴾ کیا میری بہن ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟﴿وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهُ﴾ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا﴿يَا أَنَسُ! كِتَابُ اللهِ الْقِصَاصُ﴾ اے انس! قرآن پاک میں تو حکم آیا ہے کہ دانت کے بدلے میں دانت ہے۔اس لئے سزا تو وہی ہونی چاہیے اور انہوں نے قسم کھا کر یہ کہا کہ اللہ کی قسم! ان کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو رد کرنا چاہتے تھے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر یہ بات کہہ رہے تھے کہ مجھے یقین ہے اس اللہ کی ذات پر جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے کہ وہ لوگ مان جائیں گے اور دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔جب دوبارہ ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے معاف کر دیا۔اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا﴿رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ﴾ بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود کپڑے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب کسی کے دروازے پر آویں تو لوگ دھکا مار کر نکال دیں، گھر میں بھی آنے کی اجازت نہ دیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیں۔(المعجم الکبیر-۷۶۸)

دیکھو! حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا تھا کہ دانت نہیں ٹوٹے گا اور نتیجہ یہی ہوا کہ جس کا دانت توڑا گیا تھا اس کے گھر والے راضی ہو گئے اور ان کی بہن کو معاف کر دیا اور دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

﴿ہوسکتا ہے کہ ڈھول کے اندر کوئی سوار چھپا ہوا ہو﴾

یہاں پر بھی یہی فرماتے ہیں کہ ظاہری شکل وصورت دیکھ کر آپ فیصلہ نہ کیجیے:-

خاکساراں جہاں را بحقارت منگر ❁ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے دارد

دنیا کے اندر جو خاکسار اور معمولی قسم کے لوگ ہیں ان کو آپ حقارت کی نظر سے نہ دیکھئے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہ غبار کے اندر کوئی سوار ہو۔ جب دھول اڑتی ہوئی نظر آتی ہے کہ چاروں طرف دھول ہی دھول ہو اور صرف دھول سمجھ کر کوئی اس کو معمولی سمجھے تو یہ اس کی حماقت ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی سوار چھپا ہوا ہو۔

اسی طریقہ سے معمولی ہیئت کے اندر جو لوگ نظر آتے ہیں ان کی اس معمولی سی ہیئت اور اس ظاہری کمزوری کی وجہ سے ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کس کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؛ یہ کوئی بتلا نہیں سکتا۔ ایک آدمی جس کو یہاں اونچا سمجھا جارہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کوئی مقام نہ ہو، اور وہ آدمی جس کو یہاں معمولی اور کمزور سمجھا جارہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ مقبولیت کا مقام پائے ہوئے ہو۔

﴿میں بتلاؤں کہ جہنمی لوگ کون ہیں؟﴾

﴿أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟﴾ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتلاؤں کہ جہنمی کون ہے؟ ﴿كُلُّ عُتُلٍّ﴾ اکھڑ قسم کا شخص ﴿عُتُل﴾ یعنی کھردرے مزاج کا آدمی، جس کی طبیعت کے اندر اکھڑ پنا ہو، کھردرا پن ہو، کہ بس! کسی کے ساتھ بات کرتا ہے تو ایسے کہ جیسے لٹھ مار کر بات کررہا ہو، اور ہر ایک کو حقیر سمجھتا ہے۔ درشت خو، سخت مزاج لوگ ﴿جَوَّاظ﴾ اور ناک چڑھا، یعنی جو کسی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا، ہر ایک کو حقیر سمجھتا ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ﴿جَوَّاظ﴾ کے معنی بیان کئے ہیں ﴿هُوَ الْجَمُوعُ الْمَنُوعُ﴾ وہ آدمی جو کثرت سے مال جمع کرے لیکن اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرتا ہو یعنی

کثرت سے مال جمع کرنے کے ساتھ ساتھ بخیل بھی ہو۔ اور بعضوں نے کہا کہ ایسا موٹا آدمی جس کی چال کے اندر غرور ہو۔

بہر حال! اصل تو یہ ہے کہ جو لوگوں کے ساتھ اپنے کبر وغرور کی وجہ سے حقارت کا اور ذلت کا سلوک کرتا ہو ﴿مُستَکبِر﴾ جو تکبر کرنے والا ہو۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس قسم کے ہیں کہ جو دنیا میں دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن اپنی برائیوں اور بدخوئی کی وجہ سے اور کبر وغیرہ کی وجہ سے اور مزاج کی درشتی اور کھردرے پن اور اکھڑ پن کی وجہ سے اور لوگوں کے ساتھ بدخلقی کے نتیجے میں جہنم کے حق دار ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت، ظاہری کمزوری، مالی قلت کی وجہ سے یا کسی کے لباس کی بوسیدگی کو دیکھ کر کسی کو حقیر سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کس کا مقام اونچا ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان عادتوں سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائیں

﴿دعاء﴾

اے اللہ! وہ خرابیاں اور وہ رزائل اور وہ برائیاں جس کے نتیجے میں تو ناراض ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں آدمی جہنم کا حقدار بنتا ہے، اے اللہ! ان سے ہمیں محفوظ فرما۔ اے اللہ! اخلاقِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ جس کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے ان کو اختیار کرنے اور اپنانے کی اور اپنے اندر ان کو پیدا کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔

فَضْلُ ضُعُفَةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِيْنَ

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

مجلس ﴿۲﴾

۱۲/ستمبر ۱۹۹۸ء بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۹/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً.أمابعد:—

﴿زمین بھر ایسوں کے مقابلہ میں وہ آدمی بڑھ کر ہے﴾

۲۵۳.عن أبی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ قَالَ:مَرَّ رَجُلٌ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهُ جَالِسٌ:مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا؟فَقَالَ:رَجُلٌ مِّنْ أَشْرَافِ النَّاسِ، هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ أَن يُّنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ أَن يُّشَفَّعَ.فَسَكَتَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ،ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ آخَرَ،فَقَالَ لَهٗ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ:مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا؟فَقَالَ:يَارَسولَ اللّٰهِ!هٰذَارَجُلٌ مِّنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَاحَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ اَنْ لَّايُنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ أَن لَّايُشَفَّعَ.وَاِنْ قَالَ أَن لَّايُسْمَعَ لِقَوْلِهٖ.فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ:هٰذَاخَيْرٌمِّنَ الْأَرْضِ مِثْلَ هٰذَا. (متفق عليه)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں کمزور اور گمنام مسلمانوں کی فضیلت بتلانا چاہتے ہیں کہ جو کمزور، غریب اور گمنام ہوں ان کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؟

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک آدمی کا گذر ہوا تو آپ کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک آدمی سے نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ یہ آدمی جو جا رہا ہے اس کے سلسلہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جس سے پوچھا گیا تھا اس نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! بڑے لوگوں میں سے اور شرفاء میں سے ہے، معاشرے میں جن کا اونچا مقام سمجھا جاتا ہے ایسے لوگوں میں سے ہے۔ اللہ کی قسم!

اگر یہ آدمی کسی جگہ نکاح کے واسطے پیغام دیدے تو ضرور اس کا نکاح وہاں کرادیا جائے اور اگر وہ کسی کی سفارش کرے تو ضرور اس کی سفارش قبول کرلی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا آدمی ہے کہ اس کی بات کہیں بھی رد نہیں کی جائے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ جن سے سوال کیا گیا تھا ان کا جواب سن کر نبی کریم ﷺ خاموش ہوگئے۔

اس کے بعد ایک اور آدمی وہاں سے گذرا تو حضور اکرم ﷺ نے اسی آدمی سے پوچھا کہ ان کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے کہا! یا رسول اللہ! یہ تو غریب اور معمولی درجہ کا آدمی ہے۔ یہ ایسا آدمی ہے کہ اگر کسی جگہ نکاح کے واسطے پیغام دیدے تو وہاں اس کا نکاح نہ کیا جائے یعنی جہاں نکاح کا پیغام بھیجا گیا ہے وہ لوگ اس کی معمولی حالت کی وجہ سے اس کا پیغام رد کردیں گے اور اگر وہ کسی کی سفارش کردے تو اس کی سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ معمولی درجہ کے آدمی کی بات پر کون دھیان دیتا ہے اور کون توجہ کرتا ہے۔ اور اگر وہ کوئی بات بھی کرے تو اس کی بات کی طرف کوئی کان بھی نہیں دھرے گا۔ اب حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿هٰذَا خَيْرٌ مِّنَ الْأَرْضِ مِثْلَ هٰذَا﴾ وہ جو پہلے گیا تھا جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ وہ شرفاء میں سے ہے اور اس کی بات کہیں بھی رد نہیں جائے ایسے آدمی زمین بھر کر ہوں تب بھی ان سب کے مقابلہ میں یہ آدمی سب سے بڑھ کر ہے۔

بخاری شریف میں جہاں یہ روایت آئی وہاں اس کی تشریح میں فیض الباری میں (جو حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی درسی تقریر ہے) حضرت علامہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اتنا بڑا مبالغہ حدیثِ پاک میں بہت کم نظر آتا ہے۔ یعنی حضور ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ اُس جیسے زمین بھر کر ہوں تب بھی یہ اُن سب سے اچھا ہے۔

اس سے اس آدمی کے مقام کا اندازہ لگاؤ جس کو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی قابلِ توجہ شخص نہیں ہے، کہیں اس کی بات نہیں سنی جا سکتی، لیکن اس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پہلے والے زمین بھر کر ہوں ان سب سے اچھا ہے۔ اس سے گمنام لوگوں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے

اور اس سے نبی کریم ﷺ یہ تعلیم بھی دے رہے ہیں کہ کسی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کے متعلق ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ اگر کوئی آدمی ظاہری اعتبار سے، مالی اور جسمانی اعتبار سے، رُتبہ و مقام کے اعتبار سے کمزور نظر آتا ہے، اور لوگوں نے جس طرح کے بھی پیمانے اور معیار بنا رکھے ہوں کہ مثلاً اتنے پیسے والا ہو، اتنے بنگلے ہوں، اتنی کاریں ہوں، اتنی فیکٹریاں ہوں تو وہ اس کیٹیگری (Category) کا ہے، فلاں اس کیٹیگری کا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں لوگ کسی کو چاہے کتنی ہی اونچی کیٹیگری اور درجے کا سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالی کے یہاں اس کا کیا مقام ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے اس پاک ارشاد کے ذریعہ ہمیں یہ تعلیم دی کہ کسی کی ظاہری کمزوری کو دیکھ کر آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کسی کے متعلق آپ کو فیصلہ کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔ دلوں کے بھید کا جاننے والا تو اللہ تعالی ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں کیا دولت رکھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ پیمانہ نہیں ہے کہ کسی کے پاس کتنی کاریں ہیں، کتنے بنگلے ہیں، کتنی دولت ہے اور اس کا بینک بیلنس کیا ہے۔ یہ چیزیں وہاں نہیں دیکھی جاتی۔

قرآنِ پاک میں سورۂ زخرف کے اندر باری تعالی نے فرما دیا کہ اگر یہ خطرہ اور

اندیشہ نہ ہوتا کہ کمزور ایمان والے مؤمنین ڈگمگا جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کافروں کے مکان کی چھتیں، ان کے چڑھنے کی زینے اور سیڑھیاں اور ان کے پلنگ و مسہریاں سونے اور چاندی کی بنادیتے۔لیکن چونکہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان ظاہری چیزوں کو دیکھ کر کسی کا معیار و درجہ متعین کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کمزور ایمان والوں کا خیال رکھتے ہوئے اور ان کے ایمان کی حفاظت کرنے کے پیشِ نظر کافروں کو اتنی دولت نہیں دی، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کافروں کو اتنا کچھ دے دیتا۔معلوم ہوا کہ کسی کی ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

﴿اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کے یہاں تم بے قیمت نہیں ہو﴾

ظاہر میں کوئی بدصورت ہو تو بعض لوگ اس سے دل میں نفرت کرتے ہیں۔ بھائی! اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؛ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔زاہر نامی ایک صحابی تھے، دیہات کے رہنے والے تھے، مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، حضور اکرم ﷺ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، جب دیہات سے آتے تھے تو وہاں کی کچھ چیزیں گھی اور سبزیاں وغیرہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے لاتے تھے، جیسے گاؤں والے شہر آتے ہیں تو وہاں کے مناسب کوئی چیز شہر والوں کے لئے تحفے کے طور پر لے کر آتے ہیں۔اور جب وہ واپس جاتے تھے تو شہر کی چیزیں نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، ان کی جھولی اور تھیلی میں ڈال دیا کرتے تھے اور حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے ﴿زَاهِرٌ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُهُ﴾ زاہر؛ ہمارا دیہات ہیں اور ہم ان کا شہر ہیں (مسند احمد۔۱۲۶۴۸) مطلب یہ ہے کہ شہر والا دیہات سے جو چیزیں حاصل کیا کرتا ہے، زاہر ہمارے

لئے اس کا انتظام کر کے لے آیا کرتے ہیں اور ایک دیہات کا رہنے والا شہر سے جو چیزیں لے جانا چاہتا ہے، ہم اس کا انتظام ان کے لئے کر دیتے ہیں۔ بہر حال! حضور ﷺ کے ساتھ ان کا بڑا گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ وہ دیہات کی کچھ چیزیں لائے تھے اور مدینہ کے بازار میں بیٹھ کر بیچ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ وہاں سے گذر رہے تھے، ان کو دیکھا کہ بازار میں بیٹھے ہوئے کچھ بیچ رہے ہیں تو پیچھے سے جا کر نبی کریم ﷺ نے ان کی آنکھیں بند کر دیں وہ چھڑانے کی کوشش کرتے رہے، جب ان کو اندازہ ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ ہیں تو چھڑانے کی کوشش چھوڑ دی اور اپنے آپ کو اور زیادہ حضور کے سینۂ مبارک سے چمٹانے لگے تاکہ برکت حاصل ہو جائے۔ پھر حضور ﷺ نے مزاح کے طور پر ایک آواز لگائی ﴿مَنْ یَّشْتَرِیْ ھٰذَاالْعَبْدِ؟﴾ کون اس غلام کو مجھ سے خریدے گا؟ اس پر وہ کہنے لگے ﴿اِذًا لَتَجِدُنِیْ کَاسِداً یارسول اللہ﴾ اللہ کے رسول! اگر آپ مجھے غلام بنا کر فروخت کریں گے تو بڑا کم قیمت پائیں گے یعنی میری قیمت کون لگائے گا۔ اس لئے کہ وہ بدصورت تھے، اور غلام اگر خوب صورت اور باصلاحیت ہو تو لوگ اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، اس پر حضور اکرم ﷺ نے جو جواب دیا وہ اصل میں سنانا مقصود ہے ﴿وَاللہِ اِنَّکَ لَسْتَ عِنْدَاللہِ کَاسِداً﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کے یہاں تم بے قیمت نہیں ہو آپ اندازہ لگاؤ جب بازار لگتا ہے تو بڑے بیوپاری بھی ہوتے ہیں، چھوٹے بیوپاری بھی ہوتے ہیں، ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی نظر انتخاب جس پر پڑی وہ یہی حضرت زاہر تھے جو شکل وصورت کے اعتبار سے حسین وجمیل نہیں تھے۔

بہر حال! کسی کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر آپ کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اگر حسین و

خوب صورت نہیں ہے تو اس کا مرتبہ گھٹادیں، کسی کے کپڑے معمولی ہیں، لباس فاخرہ زیب تن نہیں کررکھا ہے، کوئی آدمی پیدل جارہا ہے تو اس کو کم تر سمجھ لیا؛ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے حضور اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایسا معیار بنالینا مؤمن کا شیوہ نہیں ہے۔اصل تو یہ دیکھنا ہے کہ وہاں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔دیکھنے کی چیز تو یہ ہے۔

﴿روح نکلتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی﴾

ایک بزرگ تھے، پوری زندگی کبھی نہیں مسکرائے، کبھی کسی نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔لوگوں نے پوچھا! حضرت آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ پڑھ رکھا ہے ﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ﴾ قیامت کے روز ایک جماعت وہ ہوگی جس کو جنت میں بھیجا جائے گا اور ایک جماعت وہ ہوگی جس کو جہنم میں بھیجا جائے گا۔اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرا شمار کس جماعت کے اندر ہے۔اگر یہ معلوم ہوجائے کہ مَیں جنت والوں میں سے ہوں تو مجھے ہنسنے کا حق ہے، لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے تو مَیں کس بنیاد پر ہنسوں۔ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو روح نکلتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

﴿جنت اور جہنم کا مناظرہ﴾

۲۵۴.عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِحْتَجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: فِيَّ الْبَارِزُوْنَ وَالْمُتَكَبِّرُوْنَ وَقَالَتِ الْجَنَّةُ ! فِيَّ ضُعَفَآءُ النَّاسِ وَمَسَاكِيْنُهُمْ. فَقَضَى اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّكِ الْجَنَّةُ رَحْمَتِيْ؛ أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَآءُ، وَاِنَّكِ النَّارُ عَذَابِيْ؛ أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَآءُ، اِلَيْكُمَا عَلَيَّ مِلْؤُهَا.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت اور جہنم کے درمیان گفتگو ہوئی اور مناظرہ ہوا یعنی ہر ایک نے اپنی بڑائی بیان کی کہ میں ایسی ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں ایسی ہوں۔ دونوں اپنی اپنی بڑائی جتلانے لگے۔

اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں مناظرہ ہوا تو یہ دونوں کیسے بولے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے تمام شرّاح نے یہی لکھا ہے کہ یہ کوئی بعید چیز نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعضاء کو بولنے کی صلاحیت عطا فرمائیں گے، اسی طرح ان کو بھی بولنے کی طاقت دی ہو اور انہوں نے بات چیت کی ہو۔

﴿قیامت کی عدالت کا منظر﴾

قیامت کے روز تمام کارروائی گواہی کے ساتھ ہوگی تو مشرکین دیکھیں گے کہ سب چیزوں پر گواہ طلب کئے جا رہے ہیں تو مشرکین آپس میں کہیں گے کہ انکار ہی کر دو ﴿وَاللهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ اللہ کی قسم! ہم نے تو کبھی شرک کیا ہی نہیں تھا، کون ہمارے خلاف گواہی دے گا۔ چنانچہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے کفر کا انکار کر دیں گے کہ اے اللہ! ہم نے تو کفر کیا ہی نہیں ہے۔ باری تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگا دیں گے، پھر ان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء بولیں گے اور گنہگاروں کے گناہوں کو بھی گنوائیں گے، قرآنِ پاک میں بھی موجود ہے ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ﴾ اب بعض لوگوں کو باوجود اپنے آپ کو مؤمن کہنے کے قرآن وحدیث کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور پھر بیجا جرأت کرتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں۔

اعضاء کے بولنے پر دلیل اور نظیر

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ سفر میں تھے، کسی نے کہا کہ قرآن میں یہ ہے کہ ہاتھ، پاؤں بولیں گے؛ یہ کیسی بات ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ ان کے لئے دلیل وثبوت چاہیے یا نظیر چاہیے؟ دلیل کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی کہہ دے کہ جیسے زبان بولتی ہے یہ اعضاء بھی بول سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے، اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تو دلیل کی بات ہوئی اور نظیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ہمارے سمجھ میں اور کھوپڑی میں آتی ہی نہیں، ہماری عقل اتنی اونچی نہیں ہے کہ کوئی چیز آسانی سے سمجھ لیں، یا بہت زیادہ اونچی ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتی۔ لہٰذا سمجھانے کے لئے مثال دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا! اچھا! زبان بولتی ہے یہ تو تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟ تو آخر یہ زبان بھی تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہی ہے، اور ہاتھ پاؤں وغیرہ بھی گوشت کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ زبان کیوں بولتی ہے؟ جس ذات نے زبان کو بولنے کی طاقت عطا فرمائی، وہ ہاتھ پاؤں کو بھی بولنے کی طاقت عطا فرمائیں گے؛ یہ کوئی قابلِ تعجب چیز تو نہیں ہے۔

جیسے حدیث پاک میں آتا ہے کہ قرآنِ پاک میں ہے کہ بعض جہنمی لوگوں کو اللہ تعالیٰ اوندھے منہ جہنم میں ڈالیں گے اور وہ جہنم کی طرف سر کے بل جائیں گے۔ تو کسی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! سر سے کیسے چلیں گے؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ جس قدرت والی ذات نے اس کو پاؤں سے چلایا، وہی ذات سر سے چلانے پر بھی قدرت رکھتی ہے۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ اس سے اور آسان بات یہ ہے کہ سانپ وغیرہ بھی تو چلتے ہیں

ان کے کہاں پاؤں ہیں؟ اگر ان کا نچلا حصہ دیکھا جائے تو وہ پیٹ سے ہی تو سرکتے ہیں۔ ان کے پاؤں تو ہیں نہیں کہ وہ قدم رکھتے ہوں، تو اللہ تعالیٰ اسے سر سے اسی طرح سرکائیں تو اس میں کونسی بعید بات ہے۔

جہنم کا کلیکشن (Collection)

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جہنم اور جنت کے درمیان مناظرہ اور گفتگو ہوئی، اگر واقعتاً دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بولنے کی طاقت عطا فرمائی اور وہ بولے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جہنم کہنے لگی کہ میرے اندر تو بڑے بڑے سر پھرے اور تکبر کرنے والے لوگ ہیں۔ فرعون، ہامان، ابوجہل، فلاں فلاں ہیں یعنی دنیا کے بڑے بڑے نامور لوگ جس لسٹ میں آتے ہیں وہ سارا کلیکشن (Collection) تو میرے پاس ہے، بڑے بڑے تکبر کرنے والے جو اپنی حکومتوں پر، سلطنتوں پر، منصبوں پر، مال و دولت پر اور اپنے حسن و جمال پر تکبر کرنے والے گذرے ہیں اور ایمان نہیں لائے، وہ سب میرے اندر ہی ہیں۔ گویا اس کے اپنی بڑائی بیان کرنے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ قابلِ ذکر سمجھے جاتے ہیں وہ تو سب میرے حصہ میں آئیں گے۔ جیسے آج کسی کے گھر پر اگر کوئی ایکٹر، یا کسی پارٹی کا کوئی لیڈر آجائے تو وہ اس کو اپنے لئے بڑا قابلِ فخر سمجھتا ہے کہ فلاں وزیر اور فلاں ایکٹر میرے یہاں آیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا کیا مقام ہے، خاص کر اگر وہ کافر ہے تو ظاہر ہے۔

جنت کے حصہ میں کون؟

پھر جنت نے کہا کہ میرے اندر تو کمزور کمزور قسم کے لوگ ہیں۔ جسمانی اعتبار سے، مالی اعتبار سے، ظاہری چیزوں کے اعتبار سے جن کو معاشرہ میں کوئی قابل توجہ نہیں سمجھتا ہے،

لیکن اہلِ ایمان واہلِ دل ہیں؛ وہ سب میرے اندر ہیں۔

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو صرف اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھو! آدمی اگر کمزور ہے، اس میں مسکنت ہے؛ تو وہ جنت میں جائے گا۔اس سے کمزوروں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

مسکنت الگ چیز ہے اور مسکینیت الگ چیز ہے

مسکنت: طبیعت کے عجز کو کہتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایک آدمی صاحبِ دولت ہوتا ہے لیکن اس کی طبیعت کے اندر مسکنت ہوتی ہے۔ مسکنت الگ چیز ہے اور مسکینیت اور فقیری الگ چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی ﴿أَللّٰھُمَّ أَحْیِنِیْ مِسْکِیْناً وَأَمِتْنِیْ مِسْکِیْناً وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِالْمَسَاکِیْنَ﴾ جہاں یہ دعا فرمائی ہے، وہاں یہ دعا بھی فرمائی ہے ﴿أَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکُفْرِوَالْفَقْرِ﴾ معلوم ہوا کہ فقر اور مسکنت یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مسکنت مال کے ساتھ بھی جمع ہوسکتی ہے، یعنی طبیعت میں سادگی ہو، کوئی بڑائی نہ ہو، تو مسکنت والی فضیلت وہ آدمی بھی حاصل کرسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال ودولت سے نواز رکھا ہو، مالدار آدمی بھی مساکین میں سے ہوسکتا ہے۔

اور کبھی تو بعض فقیر ایسے ہوتے ہیں کہ جیب کے اندر چوّنی بھی نہیں ہوتی لیکن ان کا دماغ کبر وغرور سے آسمان پر ہوتا ہے؛ ایسے لوگ مسکین نہیں ہیں۔جن تین آدمیوں پر اللہ تعالیٰ بہت زیادہ سخت ناراض ہوتے ہیں ان میں ایک وہ ہے کہ جو فقیر ہو اور متکبر ہو۔دوسرا وہ بوڑھا جو زانی ہو۔یعنی فقر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس کی طبیعت میں مسکنت ہوتی، ظاہری حالت تو تکبر کی ہے نہیں، پھر بھی تکبر کرتا ہے یعنی معاملہ اُلٹا ہے۔اسی طرح بوڑھا زانی یعنی

بڑھاپے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ زنا نہ کرتا، جو فاحشہ رنڈی بوڑھی ہو جاتی ہے تو وہ بھی توبہ کر لیتی ہے لیکن اس کو بوڑھاپے کے اندر زنا کرنے کی سوجھی یعنی عمر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر جوانی میں ایسی بری عادت ہوتی تب بھی بوڑھاپے میں آکر تو اس سے تائب ہو ہی جانا چاہیے تھا، لیکن پھر بھی وہ اس میں مبتلا ہے۔اس کا معاملہ بھی اُلٹا ہے۔

تکبر بڑی خطرناک بیماری ہے

اور تکبر کو اللہ تعالی ویسے بھی پسند نہیں کرتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس کے دل کے اندر ذرّہ برابر بھی تکبر ہو تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اور دیکھو! یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔اب اس بیماری کو کون پرکھے گا، اور کیسے پرکھے گا؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی یوں سمجھتا ہے کہ مَیں تندرست ہوں لیکن جب ڈاکٹر کے یہاں خون ٹیسٹ کرواتا ہے یا ایکسرے نکلواتا ہے، سونوگرافی کرواتا ہے یا معلوم نہیں آج کل کیا کیا گرافیاں نکل رہی ہیں۔ بہر حال! وہ یوں سمجھ رہا تھا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اور جب رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ ذیابیطس (Diabetes) ہے، بی پی ہے، یا دِل کا بیمار ہے، ایڈز ہے، کینسر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر جانچنے کے بعد بتلاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ اپنے آپ کو بیمار سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ روح کی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اندرونی بیماریاں بڑی خطرناک ہیں، اسی میں تکبر بھی ہے جو سب سے خطرناک ہے، علماء نے اس کو ''اُمُّ الامراض'' یعنی تمام بیماریوں کی جڑ لکھا ہے۔ تمام روحانی بیماریوں کے ماں تکبر ہے، جب یہ سب روحانی بیماریاں ہیں تو اس کو پرکھنے والے روحانی طبیب ہیں اور اس کا علاج بھی وہی بتلائیں گے۔

آج کا ہمارا ایک اہم المیہ

آج کل ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ روحانی علاج بولتے ہیں تو لوگوں کا دھیان تعویذ گنڈوں کی طرف جاتا ہے۔روحانی علاج کا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ روحانی علاج کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ جنہوں نے اپنے آپ کو پاک وصاف بنایا،ان کے قلوب پاکیزہ ہیں اور جو کسی شیخ کے صحبت وتربیت میں رہے ہیں اور ایک زمانہ کے بعد ان بزرگوں نے بھی ان پر اس اعتماد کا اظہار کیا کہ یہ اب اس قابل ہیں کہ لوگوں کی روحانی بیماریوں کا مثلاً تکبر وغرور،خود پسندی اور خود بینی،بغض وکینہ اور حسد وغیرہ بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔آج کل تو ان بیماریوں کا نام بھی لوگوں نے نہیں سنا ہے اور ان بیماریوں کو بیماری ہی نہیں سمجھتے۔

بداعمالیوں کے مقابلہ میں بداخلاقیاں زیادہ مہلک ہیں

دیکھو! چوری کرنا،شراب پینا،زنا کرنا؛ یہ سب بداعمالیاں ہیں،اوران پر گناہ ہوگا، لیکن چوری کی اور عمل ختم ہوگیا۔اس کے نامۂ اعمال میں وہ گناہ لکھا گیا لیکن اب اگر وہ مسجد میں آکر بیٹھا ہے تو اس وقت اس کو ثواب مل رہا ہے،چوری والا گناہ اس وقت چل نہیں رہا ہے۔لیکن جو بداخلاقیاں ہیں انہیں میں سے تکبر بھی ہے،تو جو متکبر ہوتا ہے جس کی طبیعت میں غرور وبڑائی ہے وہ مسجد میں ہو تب بھی،نماز پڑھ رہا ہو تب بھی،گھر میں ہو تب بھی؛ جہاں بھی ہو ہر حال میں تکبر تو ساتھ میں لگا ہوا ہی ہے۔

اسی طرح مثلاً حسد ہے تو یہ تھوڑا ہی اس کا پیچھا چھوڑتا ہے۔یہ تو اندر کی بیماری ہے جو ہر وقت ساتھ رہتی ہے۔یہ کوئی وقتی کام نہیں ہے۔اسی لئے اندر کی بیماریاں بہت خطرناک ہیں۔بداعمالیوں کے مقابلہ میں بداخلاقیاں بہت مہلک وخطرناک ہیں۔

﴿اخلاق کا مفہوم﴾

ہمارے یہاں تو بداخلاقی کا مفہوم ومطلب بھی محدود ہوکر رہ گیا ہے۔کوئی کسی سے مسکرا کر بات کرے تو کہتے ہیں کہ بڑے اچھے اخلاق والا ہے، اور اگر کوئی اصول کے مطابق کسی سے ذرا ڈانٹ کر بات کرے تو کہتے ہیں کہ بڑا بدخلق ہے۔اصل تو اخلاق کا مطلب یہ ہے دل کا ان گندگیوں اور روحانی بیماریوں (تکبر، غرور، خود پسندی، کینہ، بغض، عداوت، حسد وغیرہ) سے پاک وصاف ہونا؛ یہ تمام بداخلاقیاں کہلاتی ہیں۔اگر کسی میں حسد ہے تو معلوم نہیں وہ اس کو کہاں کہاں پہنچائے گا، اس کی وجہ سے وہ کیا کیا کرے گا، کتنوں کی جانیں لے گا، کتنوں کے کاروبار کو برباد کرے گا۔یہ ایک بیماری ہے لیکن اتنی بداعمالیاں کرواتی ہے کہ اندازہ نہیں لگا سکتے۔

﴿شرک کے بعد روحانی بیماریوں سے بچنے کی وصیت﴾

بہرحال! آج کل ہمارے معاشرے میں ان تمام بیماریوں کو بیماریاں ہی نہیں سمجھا جاتا۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے ولی عالم اور بڑے محدث گذرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں تھے۔حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگوں میں سے ہیں ان کے مجازین میں سے ہیں، تفسیر مظہری انہیں کی ہے۔انہوں نے اپنے شیخ کے نام پر اس کا نام مظہری رکھا۔انہی کی ایک کتاب ہے "مالابد منہ" اس میں آخیر میں جہاں انہوں نے نصیحتیں کی ہیں اس میں شرک کے بعد جن چیزوں سے سب سے زیادہ بچنے کا اہتمام کرنے کی وصیت کی ہے؛ وہ انہی روحانی بیماریوں سے بچنے کی وصیت کی ہے۔اعمال کا درجہ اس کے بعد کا ہے۔

﴿ہم اپنا علاج خود کرنے کے مجاز نہیں﴾

تو مَیں تکبر کے متعلق کہہ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔اور علماء نے تکبر کو''اُم الامراض'' لکھا ہے۔ہم غور کریں جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ جسمانی بیماریوں کا ہمارا حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن معلوم نہیں ہوتا، بعد میں ڈاکٹر صاحب بتلاتے ہیں کہ فلاں بیماری ہے۔اسی طرح ہماری روحانی بیماریاں بھی ہیں۔ بہت سی مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ مجھ میں غرور نہیں ہے لیکن وہ تو آپ اپنے متعلق فیصلہ کر رہے ہیں۔ میں اپنے متعلق فیصلہ کر رہا ہوں کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے، اس لائن کا کوئی ماہر طبیب اگر رپورٹ دیتا ہے کہ اس کے اندر یہ بیماری نہیں ہے؛ تب تو بات ہے، باقی ہم اپنے متعلق خود فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں اس کو تو وہی لوگ جانتے بھی ہیں اور پرکھتے بھی ہیں اور پھر اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مریدین حالات پیش کرتے تھے، حضرت مشورہ بھی دیتے تھے۔ایک صاحب میں کبر تھا، حضرت نے علاج تجویز کیا کہ خانقاہ کے دروازے پر بیٹھو اور لوگوں کے جوتے سیدھے کرو۔ظاہر ہے اس سے علاج تو ہو ہی جائے گا۔بہر حال! علاج کے مختلف طریقے ہیں۔

﴿دنیا اور آخرت میں سزا دلوانے والی بیماری﴾

خیر! جہنم میں لے جانے والی جو سب سے خطرناک چیز ہے بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی جو بہت سی برائیوں میں ڈالنے والی ہے؛ وہ تکبر، بڑائی اور غرور ہے۔اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنا، دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنا۔کسی کو حقیر سمجھنا؛ یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے

اوریہی بیماریاں جہنم میں لے جانے والی ہیں، اس لئے ان چیزوں کا بھی جائزہ لینا چاہیے، اوران کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے، ورنہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ قَالَ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ﴾ پوچھا گیا ﴿وَإِنْ زَنىٰ وَإِنْ سَرَقَ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا ﴿وَإِنْ زَنىٰ وَإِنْ سَرَقَ﴾ زنا اور چوری کے متعلق تو نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ اس کے باوجود بھی جنت میں جائے گا، لیکن تکبر کے متعلق فرمارہے ہیں کہ کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا تو جب تک کہ جہنم میں ڈال کر سزا بھگت کر تکبر کے اثرات سے پاک وصاف نہیں کرلیا جائے گا اور جب تک علاج نہیں ہوجائے گا؛ وہاں تک جنت میں نہیں جائے گا۔

اسی لئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائے گا یعنی ﴿مَادَامَ مُتَكَبِّراً﴾ جب تک کہ وہ متکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ سزا دے کر اس کو پاک وصاف کرلیں گے پھر کہیں گے کہ اب جنت میں جاؤ۔ اگر دنیا ہی میں اس نے اپنے آپ کو اس بیماری سے پاک وصاف کرلیا ہے تو سبحان اللہ بہت اچھا ہے، ورنہ پھر وہاں پاک وصاف کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

﴿میرے اوپر ضروری ہے کہ تم دونوں کو بھروں﴾

خیر! جنت وجہنم میں جو مناظرہ ہورہا تھا ان کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کردیا۔ جنت سے فرمایا کہ اے جنت! تو میری رحمت کا مظہر ہے، مَیں جس پر رحمت کرنا چاہتا ہوں تیرے ذریعہ سے رحمت کرتا ہوں یعنی جس کے ساتھ میں آخرت میں نعمتوں کا معاملہ کرنا چاہوں گا اس کو تیرے اندر بھیجوں گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مظہر جنت ہے۔

اور جہنم سے فرمایا کہ اے جہنم! تو میرا عذاب ہے، یعنی میری صفتِ غضب کا مظہر

ہے، تیرے ذریعہ سے میں جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا۔ پھر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اوپر ضروری ہے کہ تم دونوں کو بھروں۔

اللہ تعالیٰ جہنم کو بھی بھریں گے اور جنت کو بھی بھریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سے وعدہ کیا ہے۔ اب ہم لوگوں کے لئے یہ سوچنے کا مقام ہے اور ہمارے لئے یہ ڈرنے کی بات ہے کہ معلوم نہیں کون سے بھراوے میں ہم جاتے ہیں؟ اسی لئے ان بزرگ کے مطابق بتلایا تھا کہ ان کے چہرے پر اسی ڈر سے مسکراہٹ نہیں آئی کہ معلوم نہیں ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔ آدمی کو اگر یہ فکر لگ جائے تو کبھی کوئی گناہ اور نافرمانی نہیں کرے گا

اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ حکومت کی طرف سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں اور ٹاڈا میں کچھ لوگوں کے نام آئے ہیں کہ سو (۱۰۰) آدمیوں کو قید کیا جائے اور ان میں سے کچھ کے نام ٹاڈا میں ہیں اور کچھ کے نہیں (اللہ تعالیٰ اس قانون کو واپس کبھی نہ لائے) ایک مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں، اب جن سو (۱۰۰) کا نام ہے ان میں سے ہر ایک اپنے متعلق ڈرے گا جب تک کہ معلوم نہ ہو جائے۔ تو دنیا کی حکومتوں کی معمولی سزاؤں کا یہ حال ہے کہ جب لوگ سنتے ہیں تو ان کے ہوش اُڑ جاتے ہیں، وہ حالات بھی لوگوں نے دیکھے ہیں، اللہ تعالیٰ پھر کبھی نہ دکھائے

اللہ تعالیٰ کی جہنم کا عذاب کوئی معمولی چیز ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ انسانوں میں ایک جماعت جنت میں جائے گی اور ایک گروہ جہنم میں جائے گا۔ اب کسی کو معلوم تو ہے نہیں کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں جائے گا؛ تو پھر کیوں ہم لوگ بے فکر رہیں۔ اپنے متعلق ہر ایک کو ڈرتے رہنا چاہیے اور یہ کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ جنت والوں کے صفات ہم اپنے اندر پیدا کریں اور جہنم والوں کی برائیوں سے ہم اپنے آپ کو بچائیں۔

﴿یہ سب فخر وتکبر کی چیزیں نہیں ہیں﴾

۲۵۵.عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن رسولِ اللهِ ﷺ قَالَ:اِنَّهُ لَيَأْتِی الرَّجُلُ السَّمِيْنُ الْعَظِيْمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا يَزِنُ عِنْدَاللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ. (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں لمبا تڑنگا، موٹا تازہ قدآور آدمی آئے گا لیکن اللہ تعالی کے جہاں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہیں ہوگا۔

دنیا میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنی صحت وتندرستی پر اور اپنی بوڈی (body) پر ناز کرتے ہیں، لیکن حدیثِ پاک میں بتایا گیا کہ یہ کوئی فخر کی چیز نہیں ہے۔ بوڈی (body) ظاہری حسن و جمال، صحت وتندرستی یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور شکر کی چیزیں ہیں، لیکن فخر وتکبر کی چیزیں نہیں ہیں۔ کوئی آدمی پستہ قد اور کمزور ہے، اس وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہے؛ یہ ہم نہیں جانتے، وہاں بوڈی ناپ کر فیصلہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے ظاہری حسن و جمال پر اچھی شکل وصورت پر فخر کرنا مؤمن کو زیب نہیں دیتا، بلکہ اندرون کو درست کرنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ یہ تو قدرت کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، کسی کو ملی، کسی کو نہیں ملی۔ اگر آپ کو ملی ہے تو اللہ کا شکر ادا کیجیے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو کمتر و کمزور اور حقیر سمجھیں۔ ایسی چیز پر حقیر کیا سمجھنا جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ حسن و جمال کیا ہمارا کمایا ہوا ہے؟ جس میں ہمارے اختیار کو دخل ہے ہی نہیں، اس پر فخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ اللہ تعالی نے دی ہے، ذرا سی دیر میں وہ لینے پر قادر ہے۔ اچانک کوئی بیماری آ گئی، کسی نے ایسڈ ڈال دیا، دست لگ گئے اور سو ڈیڑھ سو ایک

ساتھ ہو گئے تو چہرے پر بھی جھریاں آ جائے گی، اور چہرہ جو چمکتا دمکتا تھا وہ کالا نظر آنے لگے گا۔اور بوڑی کہاں جائے گی وہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کو ڈرتے رہنا چاہیے۔اللہ تعالی کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔اس کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔اصل تعلیم یہی ہے۔دولت ومنصب ہے، عہدہ ہے، بوڑی، حسن وجمال ہے؛ یہ سب اللہ تعالی کی نعمتیں ہیں۔

ملنے جلنے والوں کے حالات کی خبر رکھنی چاہیے

۲۵۶. وعنه أَنَّ امْرَأَةًسَوْدَ آءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ،أَوْشَابًّافَفَقَدَهَارَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَسَأَلَ عَنْهَاأَوْعَنْهُ،فَقَالُوْا:مَاتَ.قَالَ:أَفَلاكُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِيْ،فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوْاأَمْرَهَا،أَوْأَمْرَهُ. فَقَالَ:دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ.فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهَا،ثُمَّ قَالَ:اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَمَمْلُوْءَةٌظُلْمَةً عَلٰى أَهْلِهَا،وَاِنَّ اللهَ تَعَالٰى يُنَوِّرُهَالَهُمْ بِصَلاتِيْ عَلَيْهِمْ. (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سیاہ فام عورت مسجدِ نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔حضور اکرم ﷺ دیکھتے تھے کہ وہ مسجد کی صفائی کا خیال رکھتی ہے، پھر چند دنوں تک نظر نہیں آئی تو حضور ﷺ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا۔بعض روایتوں میں ایک نوجوان لڑکے کا تذکرہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی ہمارے حلقہ احباب میں سے ہو، ملنے والوں میں سے ہو یا جو امورِ خیر کے اندر لگا ہوا ہو جس کے ساتھ ہمارا ربط ہو تو اس کے ایک دو دن نظر نہ آنے کے اوپر آدمی کو تحقیق کرنی چاہیے۔آج کل تو ایسے مزاج بنتے جا رہے ہیں کہ لیا دیا اور ختم؛ پھر حال احوال کا پتہ ہی نہیں رکھتے۔ہمارے یہاں کلاس میں طلبہ میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا

ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ فلاں کہاں ہے؟ کسی نے جواب دیا کہ بیمار ہے۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ کیا بیماری ہے؟ تو کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ ان طلباء سے ہم کہتے ہیں کہ دو تین دن ہوگئے اور وہ آپ کا ساتھی ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بیماری کیا ہے، اللہ کے بندو! اس کی خبر بھی لینے نہیں گئے۔

ہمارا بھی حال ایسا ہی ہوگیا ہے، دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں پابندی کے ساتھ نماز کے لئے آتا ہے اور دو دن سے نظر نہیں آتا تو نبی کریم ﷺ کا عمل ہمیں یہ تعلیم دی رہا ہے کہ ہم کو چاہیے کہ پوچھیں کہ فلاں صاحب نظر کیوں نہیں آتے۔ بڑے پابند تھے، معلوم کرو، بیمار تو نہیں ہیں۔ اگر بیمار ہے تو جاؤ اس کی خیر خبر لو۔ کوئی ضرورت میں ہے کسی مصیبت میں گرفتار ہے، کہیں ان کو گرفتار کر کے لے تو نہیں گئے ہیں۔ جب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس پر کیا گذر رہی ہے تو اس کی کچھ مدد کرنے کا اور اس کو سہولت پہنچانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ ایسے علاقے ہیں جہاں ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ وہاں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

بہرحال! نبی کریم نے پوچھا کہ فلاں نظر نہیں آرہا ہے۔ لوگوں نے بتلایا کہ اس کا تو انتقال ہوگیا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اطلاع دی ہوتی اور بتلا دیا ہوتا۔ کیوں نہیں بتلایا؟ بعض روایتوں میں ہے کہ جواب دیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو زحمت دینا گوارہ نہیں سمجھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رات کے وقت اس کا انتقال ہوگیا تھا، ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کے آرام و راحت کے اندر خلل ڈالیں۔ بہرحال! بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس کی موت کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو دی

جائے۔اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتلاؤ۔چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی۔ویسے مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کو بغیر نمازِ جنازہ پڑھے دفن کیا گیا ہو تو جب تک کہ اس کا جسم پھولا پھٹا نہ ہو وہاں تک اس کی قبر پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے،اور اگر نماز پڑھ کر دفن کیا گیا ہے تو پھر نہیں۔لیکن یہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قبریں قبر والوں پر اندھیریوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ میری نماز کے ذریعہ سے ان پر نور بھیجتا ہے اس لئے آپ نے نماز پڑھی۔

ایسے لوگ قابلِ قدر ہیں

بہر حال! یہاں تو یہ بتلانا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس کی اہمیت لوگوں کو بتلائی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے لوگ جو اپنے طور پر اس قسم کی رضا کارانہ خدمتیں کیا کرتے ہیں ان کا خیال رکھنے کی نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی۔وہ عورت بھی کوئی تنخواہ نہیں لیتی تھی۔ہمارے یہاں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں،اور ہم بھی جانتے ہیں کہ فلاں آدمی مسجد کا بڑا خیال رکھتا ہے، مسجد میں جلدی آجایا کرتا ہے،کھڑکیاں کھول دیتا ہے،صفیں ٹھیک ٹھاک کرلیا کرتا ہے، حالانکہ وہ تنخواہ دار نوکر نہیں ہوتا؛ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو مختلف خدمتیں انجام دیتے ہیں۔نبی کریم ﷺ نے اپنی اس تعلیم کے ذریعہ ہمیں یہ نصیحت فرمائی کہ ایسے لوگ قابلِ قدر ہیں،اور ان کا مقام بہت اونچا ہے۔

بہر حال!ایسے لوگ معاشرے میں،برادری اور سماج میں ہمارے محلوں اور علاقوں میں ہوتے ہیں جو ایسی رضا کارانہ خدمت انجام دیتے ہیں،ظاہری ہیئت اور شکل وصورت کے اعتبار سے لوگ ان کو قابلِ التفات وتوجہ نہیں سمجھتے،لیکن ایسی اونچی خدمت انجام دے

رہے ہوتے ہیں کہ بعد میں جب یاد آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں وہ ایسے کام کرتا تھا پھر ان کا تذکرہ بھی کر لیتے ہیں۔ خیر ایسے لوگوں کا بھی خیال رکھا جائے اور ایسے لوگ جب نظر نہ آئیں تو ان کے متعلق تحقیق بھی ہونی چاہیے کہ کہاں گئے، کیا ہوا۔ اگر انتقال ہو گیا تو ان کے گھر والوں کے پاس جا کر تعزیت کر آویں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

فَضْلُ ضُعَفَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِیْنَ

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

مجلس ﴿۳﴾

۲۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۹/ستمبر ۱۹۹۸ء

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًاعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أمابعد:—

﴿بہت سے پراگندہ حال اونچے مقام والے ہوتے ہیں﴾

۲۵۷. وعنه قال قال رسول الله ﷺ رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْأَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے جس میں مسلمانوں میں کمزور، فقراء، مساکین اور گمنام لوگوں کی فضیلت اور اہمیت کو بتلانا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ بہت سے پراگندہ بالوں والے جن کو دروازوں پر سے دھکے دیئے جاتے ہیں یعنی وہ اگر کسی کے دروازے پر پہنچ جائیں تو ان کی ظاہری کمزوری کی وجہ سے اور ان کے گمنام ہونے کی وجہ سے اور اللہ تعالی کے یہاں ان کا مقام کیا ہے یہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو اپنے دروازوں پر کھڑا رکھنا پسند نہیں کرتے، بلکہ ہٹا دیتے ہیں ایسے لوگ اگر اللہ کے نام کی کسی بات پر قسم کھا لیں تو اللہ تبارک وتعالی ان کی اس قسم کو پورا کریں گے، یعنی اللہ تعالی کی نگاہ میں ان کا مقام اتنا بلند ہے اور اللہ تعالی کی یہاں ان کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ اللہ تعالی کا نام لے کر قسم کھا لیں اور یوں کہہ دیں کہ ایسا ہی ہوگا تو اللہ تعالی ان کے کہنے کے مطابق وہ چیز کر دیتے ہیں۔

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا قصہ پہلے بھی گذر چکا ہے، حضرت انس جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے ان کے چچا حضرت انس بن نضر تھے، ان کی بہن حضرت رُبیع بنتِ نضر نے ایک مرتبہ ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ اس کے گھر والوں نے قصاص کا مطالبہ کیا یعنی دانت کے بدلے میں دانت توڑا جائے۔ مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر کسی کا دانت توڑ دے تو اس صورت میں اگر پورا دانت توڑ دیا ہے تو توڑنے والے کا دانت ہی توڑا جائے گا۔ بعض زیادتیاں وہ ہیں کہ جن کا بدلہ دلوانا ممکن ہے، مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹ دیا تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس سلسلہ میں مستقل تفصیلات ہیں جو فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بہرحال! یہاں انہوں نے دانت توڑا تھا اور اس کا بدلہ دینا ضروری تھا تو لڑکی کے گھر والوں نے مطالبہ کیا کہ ہماری لڑکی کا دانت توڑا ہے اس لئے ان کا بھی دانت توڑا جائے اور حضرت ربیع کے گھر والوں نے چاہا کہ وہ لوگ معاف کر دیں یا معاوضہ لے کر کے چھوڑ دیں، لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ یہ معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو حضور نے بھی یہی فرمایا کہ ﴿کِتَابُ اللہِ الْقِصَاصُ﴾ ان کا بدلہ دلوایا جائے۔ اس موقعہ پر حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا میری بہن رُبیع کا دانت توڑا جائے گا؟ اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ ایسا نہیں ہوگا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! قرآن پاک میں یہی حکم ہے۔ ان کے قسم کھانے کا منشا نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو رد کرنا چاہتے تھے، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہونے دیں گے اور امید یہی ہے کہ وہ لوگ راضی ہو جائیں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا کہ ان کو سمجھایا گیا اور وہ راضی ہو گئے۔ اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بہر حال! اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! بہت سے لوگ ظاہری حالت اور ہیئت اور ظاہری اعتبار سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر لوگ ان کو معمولی سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ تحقیر کا یا کم از کم تحقیر کا نہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو ہم اپنی مجلس میں جگہ دیں۔ لیکن اللہ تعالی کے یہاں ان کا مقام ایسا بلند ہوتا ہے کہ وہ اگر اللہ تعالی کے بھروسہ پر اللہ کا نام لے کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ تعالی اس کو پورا کر دیتے ہیں۔

ہم عملی طور پر کر دکھلا دیں؛ تب کہا جا سکتا ہے کہ......

ویسے ہم لوگ بھی جب اس قسم کی باتیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور بولتے سنتے ہیں تو ہماری زبانوں پر یہ جملہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی غریب کو یا کسی معمولی ہیئت والے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے یہاں امیر و غریب سب برابر ہیں، مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، کسی کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ سب جملے ہم اپنی زبان سے بول لیتے ہیں، کانوں سے سن بھی لیتے ہیں اور کبھی موقعہ آتا ہے تو اس کا تذکرہ بھی کر لیتے ہیں؛ لیکن اصل تو یہ ہے کہ جب عمل کا وقت آوے اُس وقت ہم عملی طور پر کر دکھلا دیں، تب کہا جا سکتا ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ارشادات کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

بہت سے ایسے لوگ جن کو اللہ تعالی نے معاشرتی اعتبار سے ہمارے ماتحت کر دیا ہے یا مالی اعتبار سے ان کی حیثیت ہم سے کم ہے، ہم کو مال و دولت سے اللہ تعالی نے نوازا ہے اور ان کے پاس اتنی مال و دولت نہیں ہے، یا اللہ تعالی نے ہم کو کسی منصب پر بٹھا رکھا ہے اور وہ اس منصب پر نہیں ہیں، یا اور کوئی خصوصی و امتیازی حیثیت ہمیں حاصل ہے، یا مثلاً ہم

فیکٹری یا دُکان چلاتے ہیں اور ہمارے ماتحت کئی ملازم ایسے بھی ہیں جو نیک اور صالح ہیں یا کسی دفتر میں ہم افسر اور انچارج کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے ماتحت کام کرنے والے ہیں؛ تو اس وقت یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو اونچا منصب عطا فرمایا ہے، دولت و ثروت عطا فرما رکھی ہے یا کوئی امتیازی شان سے نواز رکھا ہے تو ہم اپنے ماتحتوں کو یا ان لوگوں کو۔۔جن کو ایسی کوئی امتیازی شان وحیثیت حاصل نہیں ہے۔کمزور سمجھیں اور ان کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کریں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے جو مخصوص بندے ہوا کرتے ہیں وہ ایسے مواقع پر بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔

واقعتاً حدود اللہ کی رعایت کرنے والے یہی حضرات تھے

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کے ایک خادم بھائی نیاز نامی تھے، اور حضرت کے منہ چڑھے تھے۔ حضرت کی خانقاہ میں جو لوگ آیا کرتے تھے وہ کبھی کبھی ان سے بھی بھڑ جاتے تھے اور ان کے ساتھ بول چال کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ساتھ کسی کا جھگڑا ہو گیا، انہوں نے حضرت سے شکایت کر دی کہ فلاں صاحب ایسا معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت تک ان کی اور بھی شکایتیں پہنچی تھی تو حضرت نے ان کو بلا کر سب کے سامنے ڈانٹنا شروع کیا کہ تمہاری کیا حرکتیں ہیں؟ جب حضرت نے ان کو ڈانٹا تو انہوں نے فوراً اپنی زبان میں کہا کہ ''جھوٹ مت بولو، اللہ سے ڈرو'' جیسے ہی انہوں نے یہ کہا تو حضرتؒ فوراً خاموش ہو گئے اور استغفر اللہ، استغفر اللہ پڑھنے لگے۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ بول رہے ہیں، بلکہ ان کا

مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ تک شکایتیں پہنچائی ہیں وہ غلط ہیں اوران کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اوراللہ سے ڈرنا چاہیے،لیکن شدت جذبات میں آ کرانہوں نے براہِ راست حضرت کو یہ کہہ دیا۔حضرت نے اس پرکوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیارفرما کراستغفار پڑھنے لگے اور پھر فرمایا کہ حقیقت میں غلطی میری ہی ہے،اس لئے مجھے چاہیے تھا کہ جب ان کو میں نے بلایا تو پہلے ان سے پوچھ لیتا کہ آپ کے متعلق اس قسم کی شکایتیں پہنچی ہیں،کیا آپ نے ایسا معاملہ کیا ہے؟ان کا جواب اور موقف اس سلسلہ میں کیا ہے وہ مجھے معلوم ہوجاتا پھر میں کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا،لیکن میں نے ان کوصفائی کا موقعہ دیئے بغیراور ان کا موقف معلوم کئے بغیر ہی ان کوڈانٹنا شروع کردیا،تو حقیقت میں غلطی میری ہی ہے،اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں۔یہ حضرات واقعتاً حدوداللہ کی رعایت کرنے والے تھے،حالانکہ وہ حضرت کے خادم اور ماتحت تھے،لیکن ایسی بات آئی کہ جس میں حضرت کو بھی احساس ہوا کہ اس معاملہ میں میری طرف سے تساہل ہوا ہے تو فوراً برسرِ مجلس اس کا اقرار کرلیا

……پھروہ اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت حر بن قیسؒ جو تابعی ہیں،عالم بھی تھے اورقرانِ پاک کی قاری بھی تھے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہلِ مشورہ میں سے تھے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جولوگ اہلِ علم ہوا کرتے تھے ان کو اپنا اہلِ مشورہ بنالیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ایسا ہوا حضرت حر بن قیس کے چچا عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ - جو صحابی تھے اور دیہات کے رہنے والے تھے- مدینہ منورہ آئے،حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا اوران کو معلوم تھا کہ میرے بھتیجے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں اثرورسوخ حاصل ہے،اس

لئے انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو خصوصی مجلس ہوتی ہے اس میں حاضری کے واسطے میرے لئے اجازت حاصل کرلو۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ وہ حاضر ہوئے، مشورہ ہو رہا تھا اس موقعہ پر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ انصاف سے کام نہیں لیتے اور مال جس طرح تقسیم کرنا چاہیے اس طرح تقسیم نہیں کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ فوراً کوڑے پر گیا اس لئے کہ یہ بات صریح غلط تھی۔ حضرت حر بن قیسؒ نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ جائے گا اس لئے انہوں نے فوراً قرانِ پاک کی یہ آیت پڑھی ﴿خُذِالْعَفْوَوَأْمُرْبِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ آپ درگذر سے کام لیں اور بھلی باتوں کا حکم دیں اور نادان لوگوں سے درگذر کریں اور ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ کریں۔ یہ آیت پڑھ کر کہا کہ یہ میرے چچا بھی نادانوں میں سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ وہیں رک گیا اور سزا دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن موقوف کر دیا۔ بخاری شریف میں روایت ہے ﴿كَانَ وَقَّافاً عِنْدَ كِتَابِ اللهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے بہت ٹھہرنے والے تھے، یعنی جہاں اللہ تعالی کا حکم آ گیا پھر وہاں اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے۔

بہرحال! یہ ایک خاص چیز ہے جس کا ہمیں بھی اہتمام کرنا چاہیے جب ہم احادیث کے اندر اس قسم کی باتیں سنتے ہیں تو شوق و دلچسپی سے سنتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس میں ہماری طرف سے کوتاہی ہوتی ہے۔

﴿نصیب دار روکے گئے تھے﴾

۲۵۸۔عن أسامة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: قُمْتُ عَلىٰ بَابِ الْجَنَّةِ، فَإِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ، وَأَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ، غَيْرَ أَنَّ أَصْحَابَ النَّارِ قَدْ أُمِرَ بِهِمْ إِلىٰ النَّارِ. وَقُمْتُ عَلىٰ بَابِ النَّارِ فَإِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَآءُ. (متفق علیہ)

جب آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے تو آپ کو جنت ودوزخ کی سیر کرائی گئی تھی، دوسرے اوقات میں بھی آپ کو جنت ودوزخ دکھلائی گئی تھی جیسے نماز کے واقعہ میں آتا ہے۔اس طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مواقع پر جنت ودوزخ کے حالات سے واقف کرایا گیا ہے۔

خیر! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں جنت کے دروازے پر کھڑا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں جانے والے اکثر لوگ مساکین کمزور اور مسکنت والے ہیں یعنی ایسے لوگ جن کو لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو جب بھی بھیجا گیا تو عام طور پر ان کی دعوت کو قبول کرنے والے زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے، تو ظاہر ہے کہ جنت میں جانے والوں میں انہیں کی کثرت بھی ہوگی۔ ﴿وَأَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ خوش بخت لوگ جس کو ہم اپنی زبان میں نصیب دار کہتے ہیں، تو خوش بخت لوگ روکے گئے تھے، یعنی ان کو جنت میں جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

ان کو جنت کے دروازے پر جو روکا گیا تھا، یا تو ان کے لئے بھی جنت میں جانے کا فیصلہ تو ہو چکا تھا لیکن اس وقت فوری طور پر اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی، اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مال ودولت عطا کیا گیا تھا اس کا جب تک حساب وکتاب مکمل نہ ہو جائے وہاں تک کیسے جائیں گے۔جیسے جن لوگوں کا بیرون کا سفر ہوا کرتا ہے ان کو معلوم ہے کہ جو لوگ وہاں سے خریداری کر کے سامان لے کر آتے ہیں تو جب تک ان کا کسٹم نہیں ہو جاتا وہاں تک وہ نہیں نکل سکتے۔لیکن جو لوگ خالی ہاتھ ہوتے ہیں وہ فوراً نکل جاتے ہیں،

ان کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

بہرحال! دنیا میں جنہیں خوش بخت کہا جاتا ہے، مال دار لوگ یا نصیب دار لوگ ان کو جنت میں داخلہ سے روکا ہوا تھا۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ فقراء سے پانچ سو سال کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔

جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی

اور حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جہنم کے دروازے پر کھڑا تھا تو دیکھتا ہوں کہ جہنم میں جانے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے یعنی جہنم میں جانے والوں میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

اس کی وجہ بھی روایتوں میں آتی ہے، نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ مجھے دکھلایا گیا کہ تم (یعنی عورتیں) جہنم میں زیادہ ہو۔ تو عورتوں نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ کس وجہ سے ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ﴾ تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری زیادہ کیا کرتی ہو۔

(بخاری شریف۔۳۰۴)

حضور ﷺ نے یہ دو باتیں صاف طور پر فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ عورتیں زبان چلانے میں بہت زیادہ آزاد ہوتی ہیں، لعنت ملامت کرنا، کسی کو بد دعا دینا اور ایسی کڑوی کڑوی باتیں زبان سے نکالتی ہیں کہ اللہ کی پناہ! یعنی دل تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ بعض مرتبہ عورت کی زبان سے ایسی باتیں نکلتی ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال! یہ بات عورتوں میں عام ہوتی ہے کہ وہ لعنت زیادہ کرتی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے دور کرنے کو لعنت کہتے ہیں۔ اور لعنت کے سلسلہ میں ایک چیز خاص طور پر حدیث

سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی کثرت سے لعنت کرتا ہے وہ ہمیشہ پریشان حال رہتا ہے

﴿لعنت واپس آکر کہنے والے ہی کو لگتی ہے﴾

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ بات بات پر بددعا دیتے ہیں، سامنے والا بددعا کا اہل ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ لعنت کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب کوئی کسی کے اوپر لعنت کرتا ہے تو اس کے بول آسمان پر جاتے ہیں اور اپنے لئے جگہ تلاش کرتے ہیں، لیکن جب وہاں جگہ نہیں ملتی تو وہ بول زمین پر آتے ہیں اور یہاں جگہ تلاش کرتے ہیں، یہاں بھی جب کوئی جگہ نہیں ملتی تو جس کے متعلق کہے گئے ہیں اس کا رُخ کرتے ہیں، اگر وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے حالات ایسے ہیں کہ لعنت کا حقدار ہے تب تو وہ بول اس کو پہنچ جاتے ہیں، اور اگر وہ اس کا اہل نہیں ہے تو جس نے کہے ہیں اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ گویا وہ لعنت واپس آکر اس کہنے والے ہی کو لگتی ہے۔ (ابوداؤد شریف، ۴۹۰۵)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ جیسے ایک گیند (Ball) ہوا کرتی ہے، اس کو آپ سامنے ماریں تو جس جگہ پر مارا گیا اگر وہ چیز نرم ہے یعنی وہ اس قابل ہے کہ اس گیند کو اپنے اندر اخذ کرلے تو وہ وہیں رہ جائے گی، اور اگر وہ جگہ سخت ہے یعنی وہ جگہ اس گیند کو اخذ کرنے کی اہل نہیں ہے تو جس نے پھینکی ہے اسی کی طرف پوری قوت کے ساتھ لوٹتی ہے۔ اس لئے لعنت کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ جو لوگ کثرت سے لعنت و ملامت کرتے ہیں وہ لوگ عام طور پر خود ہی پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں، اس کی وجہ ان کی اپنی ہی لعنت و ملامت ہوتی ہے، اس لئے کہ ظاہر ہے جب اس کی عادت ہے تو وہ ایسے لوگوں پر بھی لعنت و ملامت کرے گا جو اس کے اہل نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوگا

کہ وہ اُسی پر لوٹے گی اور اس کو ہی بھگتنا پڑے گا۔

﴿کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں ہے﴾

حضور ﷺ نے دوسری چیز ارشاد فرمائی ﴿وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ﴾ شوہر کی ناشکری کرتی ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ اگر تم زندگی بھر احسان کرتے رہو اور پھر کبھی کوئی بات طبیعت کے خلاف ناگواری کی پیش آئی تو وہ یوں کہے گی، حدیث کے الفاظ ہیں حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿مَارَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ﴾ وہ شوہر سے یوں کہے گی کہ تم سے تو میں نے کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں ہے۔

حضرت اقدس گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ وہ یوں کہے گی کہ اس گھر میں آ کر میں نے کیا دیکھا، ایک چیتھڑا اور ایک ٹھیکرا۔ کپڑے کو چیتھڑے سے تعبیر کرے گی اور برتن کو ٹھیکرے سے تعبیر کرے گی۔ تو ناشکری کا بھی ان کا ایک مزاج ہوتا ہے، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ کثرت سے جہنم میں جائے گی۔ لہٰذا ان سے بھی بچنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

﴿ماں کی گود میں بولنے والے تین بچے﴾

۲۵۹. عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: لم يتكلم من المهد الا ثلاثة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ماں کی گود میں تین بچوں نے بات کی ہے، ایک تو عیسیٰ بن مریم کہ جب ان کی والدہ حضرت مریم ان کو لے کر قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی شادی نہیں ہوئی ہے، پھر یہ بچہ کیسا ہے؟ تو وہ خاموش رہیں اور بچہ کی طرف اشارہ کر دیا، اس پر وہ بچہ یعنی حضرت عیسیٰ نے

جواب دیا تھا۔ یہ قصہ قرآنِ پاک میں تفصیل سے موجود ہے۔

اور دوسرا بچہ جس نے ماں کی گود میں دودھ پینے کے زمانہ میں بات کی، وہ جریج والا ہے یعنی وہ بچہ جس نے جریج کی وجہ سے بات کی تھی، اس لئے اس کو صاحب جریج کہا گیا ہے۔ یہ جریج کون ہے؟

بنواسرائیل کے اندر ایک عبادت گذار آدمی تھا، اس نے ایک کنیسا اور چرچ بنا رکھا تھا ﴿صومعة﴾ ایسے گھر کو کہتے ہیں جو منارہ کی شکل کا ہوتا ہے اور اوپر سے نوکیلا ہوتا ہے اور اندر ایک چھوٹا حجرہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی کمرہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں بنواسرائیل کے اندر جو لوگ اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں سے الگ کر لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے واسطے فارغ کر لیتے تھے؛ وہ اسی میں رہتے تھے اور اللہ کی عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔

بہرحال! جریج نے بھی ایک عمارت بنا رکھی تھی اور اسی کے اندر وہ رہتا تھا، اس کی ماں تھی جو اس کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے وہاں آیا کرتی تھی، جب وہ نیچے سے آواز دیتی تو جریج اپنی عبادت گاہ کے سوراخ میں سے سر نکال کر اپنی ماں کے ساتھ بات کر لیا کرتے تھے اور ماں کا جب تک جی چاہتا اپنے بیٹے کے پاس رہتی، پھر واپس چلی جاتی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ان کی ماں ملاقات کے لئے آئی اور نیچے سے آواز دی، اس وقت وہ نماز میں مشغول تھے، اس لئے معاملہ پیچیدہ ہو گیا کہ نماز توڑ کر اور اللہ کی عبادت سے ہٹ کر ماں کی آواز کا جواب دیں، یا عبادت میں ہی مشغول رہیں اور ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیں۔ گویا ان کو اپنی نماز کا فکر لاحق ہوا، چنانچہ وہ نماز میں مشغول رہے اور ماں کی آواز کا جواب نہیں دیا، ماں آواز دیتی رہی اور تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی۔ دوسرے روز پھر آئی تو اتفاق

کی بات کہ اس روز بھی ایسا ہی ہوا کہ جس وقت ماں ملاقات کے واسطے آئی تو یہ نماز میں مشغول تھے، ماں نے نیچے سے آواز دی، لیکن اس روز بھی انہوں نے یہی سوچا کہ اے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری ماں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں نماز توڑ دوں، چنانچہ وہ نماز میں ہی مشغول رہے۔ پھر تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنی نماز میں مشغول رہے۔ جب تین روز تک مسلسل ایسا ہی ہوا تو ان کی ماں نے بددعا دے دی کہ اے اللہ! اس کو اس وقت تک موت نہ دیجیو جب تک کہ وہ زنا کار عورتوں کا چہرہ دیکھ نہ لے۔ یعنی جب تک کہ تو اس کو زانیہ عورتوں کے فتنے میں نہ ڈالے؛ وہاں تک اس کو موت نہ آئے۔ ان کی ماں نے یہ کہا اور چلی گئی۔

پھر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ جہاں رہتے تھے وہاں کے لوگ ان کا اور ان کی عبادت کا تذکرہ کرنے لگے کہ یہ اللہ کے مخصوص بندوں میں سے ہیں، اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اس مجلس میں ان کی خوبیاں بیان ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک بدکار عورت بھی تھی جو ایسی حسین و جمیل تھی کہ اس کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا لیکن وہ بدکار تھی۔ جب لوگ جریج کی خوبیوں کا تذکرہ کر رہے تھے تو اس نے یوں کہا کہ تم اگر چاہو تو میں اس کو آزمائش میں ڈالوں یعنی اس کو آزمایا جائے کہ وہ کتنا پکا ہے اور اللہ کی عبادت میں کیسا مشغول ہے؟ ایسا تو نہیں کہ ڈگمگا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ لہٰذا وہ ان کو آزمانے کے لئے ان کی عبادت گاہ پر پہنچی اور ان کے سامنے آئی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور اس کی تدبیر کامیاب نہیں ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہو رہے ہیں تو اس نے ان کو بدنام کرنے کا ارادہ کیا۔

وہاں ایک چرواہا تھا جس کی عادت یہ تھی روزانہ اپنی بکریاں چرا کر فارغ ہونے کے بعد جریج کی عبادت گاہ کے پاس آ کر رات گذارا کرتا تھا، جب اس عورت نے جریج کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور اپنے ساتھ ملوث کرنا چاہا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے تو اس نے چرواہے سے منہ کالا کیا، اس کے ساتھ زنا کیا اور اس سے حمل بھی ٹھہر گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس سے لوگوں نے کہا کہ یہ بچہ کہاں سے آیا، تیری تو شادی نہیں ہوئی ہے؟ تو اس نے کہہ دیا کہ یہ جریج کا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اچھا! یوں تو وہ لوگوں کو بتلاتا ہے کہ بڑا عبادت گذار ہے اور اس کی اس طرح کی حرکتیں ہیں۔ چنانچہ لوگ اس کی عبادت گاہ پر آئے اور اس کا گھیراؤ کیا آوازیں دیں کہ نیچے اُتر، تو ایسی حرکت کرتا ہے۔

دوسری روایتوں میں ہے کہ لوگوں نے نیچے اُترنے کے واسطے بہت آواز دی لیکن وہ اپنی عبادت میں ایسے مشغول تھے اس لئے انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا، جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ نیچے اُتر ہی نہیں رہے تو پھاوڑے لے کر ان کی عبادت گاہ کو نیچے ہی سے توڑنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ نیچے اُترے اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو لوگوں نے اُن کی پٹائی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ بھائی! بات کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ جانتا ہے پھر بھی انجان بنتا ہے؟ تو نے اس کے ساتھ زنا کیا اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا! وہ بچہ کہاں ہے؟ چنانچہ اس بچہ کو لایا گیا۔ جریج نے کہا کہ مجھے کچھ موقعہ دو یہاں تک کہ مَیں کچھ رکعت نماز پڑھ لوں۔ چنانچہ انہوں نے نماز پڑھی، جب فارغ ہوئے تو اس بچہ کے پاس آ کر اس کے پیٹ پر انگلی رکھ کر کہا کہ اے بچے! تو ہی بتلا! کہ تیرا باپ کون ہے؟ بچہ نے کہا کہ فلاں چرواہا ہے۔ جب لوگوں نے دیکھا اور ان کی یہ کرامت ظاہر ہوئی تو لوگوں نے ان

سے معافی مانگی، اوران کے ہاتھ چومنے لگے اور برکت حاصل کرنے لگے اور کہا کہ تمہارا عبادت خانہ جو ہم نے توڑ دیا ہے اس کو سونے کا بنا دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ سونے کا بنانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ پہلے جیسا تھا ویسا ہی بنادو۔ چنانچہ بنا دیا گیا۔

یہ دو بچے ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ تین بچوں نے ماں کی گود میں بات کی تھی۔ ایک حضرت عیسیٰ، دوسرا یہ جریج والا بچہ جس نے جریج کی براءت کی گواہی دی تھی۔

حضور ﷺ تیسرے بچہ کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا، اچانک دیکھا کہ ایک نوجوان وہاں سے گذرا جو ایک عمدہ اور قیمتی گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے بہت ہی نفیس اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ماؤں کی عادت ہوتی ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں کہ اللہ میرے بیٹے کو ایسا بنائے، تو اس عورت نے بھی اس نوجوان کو عمدہ لباس میں، قیمتی اور اچھے گھوڑے پر سوار دیکھا تو دعا کی کہ اے اللہ! میرے اس بیٹے کو بھی اس نوجوان جیسا بنائیو۔ بچہ اس کی گود میں دودھ پی رہا تھا، اس نے دودھ چھوڑ دیا اور اس سوار کی طرف گھور کر دیکھا اور کہنے لگا کہ اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنائیو اور پھر دوبارہ ماں کا پستان منہ میں لے کر دودھ پینا شروع کر دیا۔

راوی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ جس وقت یہ قصہ بیان فرما رہے تھے تو حضور ﷺ نے باقاعدہ اپنی انگلی منہ میں لے کر بتایا کہ بچہ نے اس طرح ماں کا پستان منہ میں لے کر دودھ پینا شروع کر دیا اور پستان چوسنے لگا۔ اب وہ بچہ دودھ ہی پی رہا تھا کے اس درمیان میں دیکھا کہ چند لوگ ایک لڑکی کی پٹائی کرتے وہاں سے گذرے، اس کو مارتے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تو نے زنا کرایا اور چوری بھی کی، لیکن وہ لڑکی کہہ رہی تھی ﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ

الْوَكِيْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی میرے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ وہ جواب میں صرف اتنا ہی جملہ بولتی تھی۔

اس لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر ماں نے یوں دعا کی کہ اے اللہ! میرے بچے کو ایسا نہ بنائیو۔ پھر بچے نے دودھ پینا چھوڑ کر منہ پھیر کر اس لڑکی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ اے اللہ! مجھے ایسا ہی بنائیو۔

''ایسا ہی بنائیو'' کا مطلب یہ ہے اس لڑکی پر زنا اور چوری کا جو الزام لگایا جا رہا تھا وہ غلط تھا، اگرچہ اس کو بے قصور مارا جا رہا تھا۔ اس بچے کے جملے ''ایسا ہی بنائیو'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ میری بھی اس طرح پٹائی ہو۔ اس لئے کہ آدمی کو اپنے واسطے آزمائش کی دعا نہیں مانگنی چاہیے لیکن اگر آزمائش آئے تو ثابت قدم رہے۔ اس بچے کی دعا کا مطلب تو اتنا ہی تھا کہ اے اللہ! جس طرح لوگ اس لڑکی پر زنا اور چوری کی تہمت لگا رہے ہیں اور حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہے بلکہ پاک دامن ہے تو ایسی طرح مجھے بھی پاک دامن بنانا۔

کسی کی ظاہری حالت اچھی دیکھ کر دعا کرنے کی ضرورت نہیں

جب بچے نے یہ دعا کی تو ماں نے اس سے کہا کہ تو بھی عجیب ہے؟ ایک عمدہ لباس میں عمدہ گھوڑے پر ایک عمدہ آدمی جا رہا تھا اور تیرے لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو ایسا بنائیو، تو تو نے کہا کہ مجھے ایسا نہ بنائیو۔ اور اس لڑکی کی پٹائی کرتے ہوئے لوگ گذر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تو نے زنا کیا اور چوری کی، اور میں نے تیرے لئے یہ دعا کی کہ میرے بیٹے کو ایسا نہ بنائیو، تو تو یوں کہتا ہے کہ مجھے ایسا بنائیو۔ یہ کیا بات ہے؟

تو اس بچے نے یوں کہا کہ وہ آدمی بڑا متکبر تھا، کبر وغرور میں مبتلا تھا اس لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے ایسا متکبر نہ بنائیو۔ اور اس لڑکی نے نہ چوری کی اور نہ زنا کرایا اور لوگ اس کے متعلق یہ کہہ رہے تھے حالانکہ وہ کمزور اور مسکینہ لڑکی ہے اور اس کی معمولی حالت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا تھا، اس لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے پاک دامن اور عاجزی وانکساری والا بنائیو۔

بس! یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت اسی لئے پیش کی ہے کہ دیکھو! اس کی ماں نے اس کی ظاہری اور اچھی حالت دیکھی تو دعا کر ڈالی کہ میرے بیٹے کو ایسا بنائیو، اور اس لڑکی کی ظاہری حالت معمولی تھی اس لئے ماں نے دعا کر ڈالی کہ میرے بیٹے کو ایسا نہ بنائیو حالانکہ کسی کی ظاہری حالت اچھی دیکھ کر دعا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کسی کی ظاہری حالت معمولی دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ یہ معمولی ہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔ واقعتاً اندر کا حال کیا ہے؛ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں کسی کی تحقیر سے محفوظ فرمائے اور دین کی صحیح فہم نصیب فرمائے

آمین